خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

ستمبر 2018

خواتین ڈائجسٹ

الف

عمیرہ احمد

خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی





زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے
subscriptions@khawateendigest.com

ستمبر 2018
جلد 46 شمارہ 5
قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیر

کہی سنی

خواتین ڈائجسٹ کا ستمبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

انتخابات وقت پر پُرامن ماحول میں انجام پائے، خصوصاً کراچی میں، جہاں انتخابات کے موقع پر قتل و خوں ریزی کی روایت رہی ہے۔ انتخابات کی شفافیت پر اگرچہ کچھ تحفظات پائے جاتے ہیں۔ تاہم نئی حکومت کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ ایک نیا پاکستان تکمیل کے مراحل میں ہے۔ وعدے، دعوے تو بہت بڑے بڑے ہیں اور اسی حساب سے عوام کی امیدیں بھی بہت زیادہ ہیں۔ یہ وقت بتائے گا کہ کتنے وعدے پورے ہوں گے اور کتنے نقش بر آب ثابت ہوں گے۔ قول، عمل کے قالب میں ڈھل پائیں گے یا نہیں۔ امیدیں بر آئیں گی یا ریت کے محل ثابت ہوں گی۔ فی الحال جو منظر نامہ تشکیل پا رہا ہے، اس میں نئے پاکستان کی تعمیر میں شامل کیے جانے والے زیادہ تر چہرے پرانے اور آزمائے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم پر اور ہمارے ملک پر رحم فرمائے۔

عیدالاضحیٰ گزر چکی ہے۔ حسب روایت اس سال بھی عیدالاضحیٰ پورے جوش و خروش سے منائی گئی۔ کروڑوں جانور قربان کیے گئے۔ اس موقع پر حکومت کی طرف سے صفائی کے نہایت ناقص انتظامات دیکھنے میں آئے۔ کراچی میں تو پہلے ہی صفائی کی صورت حال اطمینان بخش نہیں تھی۔ عیدالاضحیٰ کے بعد صورت حال مزید ناگفتہ بہ ہو چکی ہے۔ گلی محلوں میں گندگی کے ڈھیر لگے ہیں۔ بلاشبہ صفائی کرانا حکومت کی ذمہ داری ہے لیکن کچھ ذمہ داری ہماری بھی بنتی ہے۔ سوچنے کی بات ہے ہم لاکھوں روپے کے جانور خریدتے ہیں۔ قصائی کو منہ مانگی اُجرت دیتے ہیں۔ تو کیا ہم تھوڑے سے پیسے خرچ کر کے اپنی گلی کی صفائی نہیں کرا سکتے۔ جب ہم اپنا گھر صاف رکھنے کے لیے محنت اور کوشش کرتے ہیں تو یہ گلیاں، محلے اور شہر بھی تو ہمارا ہے۔ اس کو صاف رکھنا ہماری بھی ذمہ داری ہے۔ ایک صاف ستھرا شہر اور خوش گوار ماحول ہماری اور ہمارے بچوں کی صحت کا ضامن ہے۔

اس شمارے میں،

- عمیرہ احمد اور نمرہ احمد کے ناول،
- آمنہ ریاض کے ناول دشت جنوں کی آخری قسط،
- جمال زہرہ۔ سائرہ رضا کا مکمل ناول،
- نازیہ رزاق اور قرۃ العین سکندر کے ناولٹ،
- سمیرا حمید، عطیہ خالد، نورین زہرہ، قرۃ العین خرم ہاشمی اور صدف کے افسانے،
- ڈاکٹر نسیم اختر سے ملاقات،
- ٹی وی فنکار یاسر عالم سے باتیں،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ آپ کا اپنا پرچا ہے۔ آپ پرچا پڑھ کر اپنی رائے سے ضرور آگاہ کریں ہم آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بندگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

صدقہ نیک اعمال میں اضافہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ صدقہ کیا ہے کہ وفات کے وقت تمہیں تہائی مال (میں وصیت کا حق) دے دیا ہے تاکہ تمہارے نیک اعمال میں اضافہ ہو جائے۔ (شعب الایمان)

فوائد و مسائل:

1- اچھے کام کی وصیت کرنے سے مرنے والے کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ جب اس کی وفات کے بعد اس کی وصیت پر عمل کیا جاتا ہے تو مرنے والے کو اس کا ثواب پہنچتا ہے۔

2- اگر پسماندگان اچھے کام کی وصیت پر عمل نہ کریں تب بھی فوت ہونے والے کو اچھی وصیت کا ثواب ضرور ملے گا۔

وصیت

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: مجھے یہ بات پسند ہے کہ لوگ تیسرے حصے کو کم کر کے چوتھے حصے کی وصیت کیا کریں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"تیسرا حصہ ایک بڑی مقدار ہے۔" یا فرمایا: تیسرا حصہ زیادہ ہے۔" (بخاری)

وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں

حضرت عمرو بن خارجہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے خطاب فرمایا جب کہ آپ اپنی سواری (اونٹنی) پر سوار تھے۔ اور آپ کی سواری خوب جگالی کر رہی تھی۔ اور اس کا لعاب میرے کندھوں کے درمیان (پشت پر) گر رہا تھا۔ (اس موقع پر) آپ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے ہر وارث کو ترکے کا حصہ تقسیم کر کے دے دیا ہے، لہذا وارث کے لیے وصیت جائز

نہیں۔ بچہ بستر والے کا ہے اور بدکار کے لیے پتھر ہیں۔ جو شخص اپنے باپ کے سوا کسی اور کا بیٹا ہونے کا دعوا کرے یا اپنے آزاد کرنے والوں کے سوا کسی اور کی طرف آزادی کی نسبت کرے تو اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔ اس کا نہ فرض قبول ہوگا اور نہ نفل۔"
یا فرمایا: "نہ نفل قبول ہوگا نہ فرض۔" (ترمذی)

فوائد و مسائل:

1- ترکے میں جن رشتے داروں کا حصہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے۔ انہیں ان کا مقررہ حصہ ضرور ملنا چاہیے۔

2- جن رشتے داروں کا وراثت میں حصہ نہیں، ان کے حق میں مناسب وصیت کرنا بہتر ہے۔

3- بعض لوگ یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ لے کر شریعت کے نظام میراث پر اعتراض کرتے ہیں، مثلاً: ایک شخص فوت ہوتا ہے، اس کا ایک بیٹا زندہ ہے، دوسرا بیٹا فوت ہو چکا ہے لیکن اس فوت شدہ بیٹے کا ایک بیٹا جو اب فوت ہونے والے کا پوتا ہے، وہ موجود ہے۔ اصول میراث کے مطابق یہ پوتا محروم ہے کیونکہ قریبی عصبہ کی موجودگی میں دور کا عصبہ رشتے دار محروم ہوتا ہے۔

اس قسم کی استثنائی اور نادر صورتوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون میں تبدیلی کرنا بہت بڑی جسارت ہے۔

شرعی طور پر اس کا حل موجود ہے اور وہ یہ کہ فوت ہونے والا اپنے غیر وارث پوتے کے حق میں کچھ وصیت کر جائے۔ اگر وصیت نہ ہو تو وارثوں کے لیے مستحب اور بعض علماء کے نزدیک واجب ہے کہ وارث محروم لاوارث پوتوں وغیرہ کو وراثت میں سے کچھ نہ کچھ حصہ دیں۔

قرآن کریم کی آیت: "وراثت کی تقسیم کے وقت رشتے دار، یتیم اور مساکین آ حاضر ہوں تو تم مال وراثت میں سے انہیں کچھ دے دو۔" (النساء 4:8) سے بھی تائید ہوتی ہے۔

اکثر لوگ اس حکم قرآنی کو محض اخلاقی ہدایت سمجھ کر اپنے نہایت قریبی رشتے داروں (بھتیجوں وغیرہ) کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے اسلام کا قانون وراثت تنقید و اعتراض کا نشانہ بنتا ہے، حالانکہ اس میں تو ایسی کوئی چیز نہیں جس پر اعتراض کیا جا سکے۔ اگر چچے، تائے اپنے بھتیجوں وغیرہ کے ساتھ شفقت، ہمدردی اور صلہ رحمی کا معاملہ کریں جیسا کہ اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے تو ایک اسلامی معاشرے میں پوتوں وغیرہ کی وراثت یا عدم وراثت کا مسئلہ زیر بحث ہی نہ آئے کیونکہ صلہ رحمی کے اعتبار سے ان کی محرومی وراثت کا ازالہ خوش اسلوبی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔

علاوہ ازیں تعجب کی بات ہے کہ اس قسم کے اعتراضات ان غیر مسلموں کی طرف سے بھی پیش کیے جاتے ہیں جن کے ہاں وراثت کا کوئی اصول و ضابطہ سرے سے موجود ہی نہیں، سوائے اس کے کہ مرنے والے کا بڑا بیٹا یا بیٹی تمام ترکے کی مالک بن جاتی ہے، خواہ یہ کروڑوں کی جائیداد ہو۔ میت کی باقی اولاد بالکل محروم ہوتی ہے، حالانکہ اولاد ہونے کے لحاظ سے وہ اس کے برابر حق دار ہیں۔

انصاف سے اس قدر بعید رواج پر عمل کرنے والوں کی طرف سے اسلام کے انتہائی عادلانہ نظام وراثت کی ایک شق تلاش کر کے اس پر غلط سلط اعتراض کرنا اور اس طرح پوری شریعت کو ناقابل عمل قرار دینے کی کوشش کرنا معقول طرز عمل نہیں۔ افسوس ہے کہ بعض نام نہاد مسلمان بھی غیر مسلموں سے متاثر ہو کر ان ہی کی زبان بولنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنا ایمان خطرے میں ڈال لیتے ہیں۔

4- وارث کے حق میں وصیت سے منع کرنے میں یہ حکمت ہے کہ اگر وہ وصیت قرآن و سنت کے مطابق ہو تو وصیت کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان وارثوں کو شرعاً وہی حصہ ملے گا، خواہ وصیت کی جائے یا نہ کی جائے، اور اگر اس کی وصیت قرآن و سنت کے خلاف ہو تو اس وصیت پر عمل کرنا جائز نہیں۔ اس طرح وہ کالعدم ہے۔

5- نسبی تعلق ایک ناقابل تبدیل تعلق ہے، اسی [illegible] اسلام کی نظر میں متبنیٰ (منہ بولے بیٹے) کو [illegible] اپنی طرف منسوب کرنا اور [illegible] غیر قانونی بلکہ گناہ [illegible] ناقابل تبدیل [illegible] آزاد [illegible] آزاد کرنے والے کے احسان [illegible] کسی اور کو مولیٰ قرار دینا بہت بڑا گناہ ہے۔

وارث کے لیے وصیت

حضرت ابوامامہ (صدی بن عجلان) باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:
میں نے حجتہ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے خطبہ مبارک میں یہ فرماتے سنا:
"اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے، لہٰذا وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں۔"
(ابوداؤد)

[illegible] انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت [illegible] فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ [illegible] اونٹنی [illegible] کھڑا تھا جبکہ مجھ [illegible] رہا تھا۔ (اس وقت) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا:
"اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے، لہٰذا وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں۔"
(دار قطنی)

وصیت پوری کرنے سے پہلے قرض ادا کیا جائے

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:
"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت پوری کرنے سے پہلے قرض ادا کرنے کا حکم دیا اور تم یہ آیت پڑھتے ہو:
"اس وصیت کے بعد جو وہ وصیت کرے یا قرض کے بعد۔" (النساء 4:11) اور سگے بھائی، ایک ماں کے بیٹے وارث ہوں گے، سوتیلے بھائی نہیں۔
(ترمذی)

فوائد و مسائل:

1- قرض کی اہمیت وصیت کے مقابلے میں اس لحاظ سے زیادہ ہے کہ قرض زندگی میں بھی واجب الادا ہوتا ہے اور موت کے بعد بھی جبکہ وصیت موت کے بعد ہی قابل عمل ہوتی ہے۔ قرض جتنا بھی ہو، ادا کرنا ضروری ہوتا ہے جب کہ وصیت اگر تہائی ترکے سے زیادہ ہو تو تہائی تک قابل عمل ہوتی ہے، زائد نہیں۔

2- میت کے مال میں سے سب سے پہلے کفن دفن پر خرچ کیا جاتا ہے، پھر قرض ادا کیا جاتا ہے، پھر جو کچھ بچے، اس کے تہائی مال یا اس سے کم کی جو وصیت ہو، وہ پوری کی جاتی ہے۔ اس کے بعد باقی ترکہ وارثوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

3- آیت میں وصیت کا ذکر قرض سے پہلے ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے وصیت پوری کی جائے وہ ادا کی جائے۔ اگر دونوں (وصیت اور قرض) موجود ہوں تو ترکے میں سے دونوں کی ادائیگی کرنے کے بعد باقی ترکہ تقسیم کیا جائے۔ علاوہ ازیں وصیت کا ذکر پہلے کرنے میں یہ نکتہ بھی ہو سکتا ہے کہ وصیت پر عمل کرنے کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی جب کہ قرض تو لوگ زبردستی بھی وصول کر لیتے ہیں۔ وصیت کو پہلے بیان کر کے واضح کر دیا کہ اس پر عمل کرنے میں بھی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے، گو اس پر عمل قرض کی ادائیگی کے بعد ہی کیا جائے گا۔

4- میت کے سگے بہن بھائی اس کے سوتیلے بہن بھائیوں پر مقدم ہیں۔

وصیت کیے بغیر فوت ہو جانے والے کی طرف سے صدقہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا:

''میرا والد فوت ہو گیا ہے اور اس نے مال چھوڑا ہے لیکن وصیت نہیں کی۔ اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا اس کے گناہ معاف ہو جائیں گے؟''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں۔''

(مسلم)

وصیت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

''میری والدہ اچانک فوت ہو گئی ہیں اور انہوں نے وصیت نہیں کی۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر انہیں بات چیت کرنے کا موقع ملتا تو صدقہ کرتیں۔ اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا انہیں ثواب ملے گا اور کیا مجھے بھی ثواب ملے گا؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں۔''

فوائد و مسائل:

1- انسان کو مرنے کے بعد جس طرح ان اعمال کا ثواب پہنچتا رہتا ہے جو اس نے زندگی میں کیے تھے اور ان کے نیک اثرات بعد میں جاری رہے، اسی طرح اس صدقے وغیرہ کا ثواب بھی پہنچتا ہے جو والدین کی وفات کے بعد اولاد ان کی طرف سے کرے۔

2- فوت شدہ والدین کی طرف سے صدقے کے لیے یہ شرط نہیں کہ انہوں نے وصیت کی ہو۔

3- آج کل ایصال ثواب کے نام سے جو محفلیں برپا کی جاتی ہیں اور کھانے کھلائے جاتے ہیں ان کی حیثیت محض ایک رسم کی ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ خاموشی سے کسی مستحق کی مناسب امداد کر دی جائے۔

4- قرض اور دوسرے مالی حقوق کی ادائیگی میں جس طرح زندگی میں نیابت ممکن ہے، اسی طرح وفات کے بعد بھی کسی کا قرض دوسرے آدمی ادا کر دے تو فوت شدہ شخص بری الذمہ ہو جاتا ہے۔

جو محتاج ہو وہ جائز حد تک کھالے

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

''میرے پاس کچھ نہیں (گزارہ نہیں ہوتا) نہ میرے پاس کوئی مال ہے، البتہ ایک یتیم میری کفالت میں ہے، اس کا مال ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اپنے یتیم کے مال میں سے کھا لیا کر لیکن فضول خرچی نہ کرنا اور (اس کے مال سے) مال نہ کمانا۔'' اور غالباً یہ بھی فرمایا: اس کے مال کے ذریعے سے اپنا مال نہ بچانا۔''

فوائد و مسائل:

1- یتیم کا مال کھانا بڑا سخت گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''جو لوگ یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹوں میں صرف آگ بھر رہے ہیں اور وہ عنقریب (جہنم کی) آگ میں جلیں گے۔''

2- اگر یتیم کا سرپرست مفلس ہو تو وہ یتیم کے مال سے اپنے انتہائی ضروری اخراجات پورے کر سکتا ہے لیکن تعیشات اور آسائشات پر اس کا مال خرچ نہیں کر سکتا۔

3- مفلس آدمی کے لیے بھی بہتر یہی ہے کہ محنت مزدوری سے اپنے اخراجات پورے کرے اور یتیم کا مال محفوظ رکھے۔

4- یتیم کے مال کے ذریعے سے اپنا مال بچانے کا مطلب یہ ہے کہ کسی نے قرض مانگا تو یتیم کا مال دے دیا، اپنا محفوظ رکھا۔ یا ذاتی ضروریات پر اس کا مال خرچ کیا اور اپنا بچا لیا۔

5- یتیم کے مال سے تجارت کر کے یتیم کو اس [illegible] دینا (مضاربت) درست ہے لیکن یہ درست نہیں [illegible] اس کے مال سے تجارت کر کے سارا نفع خود [illegible] یا اس کے مال کو اس طرح خرچ کرے جس [illegible] اپنا مال بے روک ٹوک خرچ کرتا ہے۔

دنیاوی چیزوں میں مقابلہ

[illegible] عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے [illegible] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب تم فارس اور روم (کی سلطنتوں) کے خزانے فتح کر لو گے تو تمہاری کیا حالت ہوگی؟''

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم وہی کچھ (شکر کے کلمات) کہیں گے (اور شکر والے عمل کریں گے) جن کا اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یا دوسری بات ہوگی۔ تم ایک دوسرے پر رشک کرو گے، پھر ایک دوسرے سے حسد کرو گے، پھر ایک دوسرے سے منہ پھیر لو گے، پھر ایک دوسرے سے ناراض رہنے لگو گے۔ یا اس طرح کا کوئی اور لفظ فرمایا۔

پھر تم غریب مہاجرین میں جاؤ گے اور انہیں ایک دوسرے کی گردنوں پر لاد دو گے۔''

فوائد و مسائل:

1- رشک سے یہاں دنیا کے مال کی طرف مسابقت مراد ہے۔ کسی نعمت کے بارے میں یہ خواہش کہ وہ مجھے ملے، دوسرے کو نہ ملے، ناجائز رشک ہے۔ اس قسم کا رشک حسد تک لے جاتا ہے جو ناپسندیدہ ہے۔ جائز رشک کا مطلب یہ خواہش ہے کہ جیسی نعمت کسی کو ملی ہے ویسی مجھے بھی ملے۔ یہ رشک جائز ہے۔

2- حسد کے نتیجے میں تعلقات کشیدہ ہوتے ہیں اور دشمنی تک نوبت جا پہنچتی ہے۔ یہ سب عادتیں مذموم ہیں۔

3- آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ دولت مند افراد تنگ دست افراد پر سختی کریں گے اور رعب جمائیں گے۔ یہ صفات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں نہیں تھیں، بعد والوں میں ایسے افراد ظاہر ہوئے جن میں ایسی خصلتیں موجود تھیں۔

قربانی کی کھالیں

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ وہ آپ کے (قربانی کے) تمام اونٹوں کا گوشت، ان کی کھالیں اور جھولیں غریبوں میں تقسیم کر دیں۔''

(مسند احمد)

فائدہ:

قربانی کا گوشت کھانا اور کھالیں اپنے استعمال میں لانا اگرچہ جائز ہے، تاہم بہتر یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ غریبوں اور مسکینوں کو دیا جائے۔

قربانیوں کا گوشت کھانا

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہر اونٹ کی ایک ایک بوٹی لے کر ہنڈیا میں ڈالی گئی (اور پکائی گئی۔) تب انہوں نے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے) کچھ گوشت کھایا اور کچھ شوربہ پیا۔ (احمد)



شادی کارڈ

انشاجی

لچھے ہماری زندگی اور تہذیب کا ٹریڈ مارک ہے۔ سمبل ہے' ہماری کوئی بات' کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔ ہمیں لچھے دار زبان بولنے کا شوق ہے۔ لچھے دار عبارتیں لکھنے کا شوق ہے اور لچھے دار تقریریں کرنے کا شوق ہے۔ لچھی کو بھی لچھے ہی میں شامل سمجھیے۔ بحوالہ ایک پنجابی شاعر کے۔

اگے تیرے بھاگ لچھیے

غالب روایت شکن آدمی تھے اور اردو نثر کو سلیس بلکہ پانی کر گئے ہیں لیکن القاب و آداب میں کبھی کبھی جمیل المناقب عظیم الاحسان وغیرہ کے لچھے وہ بھی چھوڑ دیتے تھے۔ اس زمانے کے حساب سے یہ کچھ بھی نہ تھا کیونکہ اس عہد کی ایک کتاب پر تو ہم نے مصنف کا نام یوں لکھا دیکھتے ہیں۔

ناشر عدیم النظیر و ناظم فقید المثال' بذلہ سنج نازک خیال' جلا بخش اردو زبان' اعجاز بیان "جناب میرزا رجب علی بیگ سرور۔"

ایک عامی کے لیے اس طومار میں سے نام کی سوئی تلاش کرنا اور اس طرۂ پُر پیچ و خم کے پیچ و خم نکالنا ایسا آسان کام نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اصل نام جلا بخش نہیں۔ جب مولا بخش اور خدا بخش اور پیر بخش نام ہو سکتے ہیں تو جلا بخش کیوں نہیں۔ عدیم النظیر اور فقید المثال بھی بھلے مانسوں کے نام لگتے ہیں۔ لیکن فی الحال' اس لچھے کی گرہوں میں سے صرف رجب علی برآمد ہوتا ہے۔ سرور بھی تخلص یعنی مصنف کی اپنی ایجاد ہے۔ کیا عجب رجب علی بھی بچپن میں فقط رجبے ہی کہلاتے ہوں۔ بڑا ہو کر یہ پرسا پرس نام بنا ہو۔

✲ ✲ ✲

اب عبارت آرائی کتابوں اور قصوں کہانیوں میں تو متروک ہوئی۔ یہ کاروباری زمانہ ہے۔ لوگوں کے پاس دماغ سوزی اور کاوکاو کی فرصت کم ہے' آداب و تسلیم کا خلاصہ کل کر "ہوائے" گیا ہے۔ لوگ آپ سے تم سے تو ہی نہیں اپنے تجھے پر اتر آئے ہیں۔ اہتمام کے کاغذ اور شادی بیاہ کے رقعوں میں البتہ ابھی اس کی شان قائم ہے۔ شادی کے رقعوں میں بنی ابھی تک لونڈی ہے۔ اگر دختر ہے تو نیک اختر ضرور ہے۔ فرزند ہے تو دلبندی کے رشتے میں بندھا ہے۔ باپ اختر اور نام برا ہے۔ آج کل کے نئے پڑھے لکھے تو اختر کو بھی نام سمجھتے ہیں اور نیک اختر جو ویسے دختر کا تابع مہمل یا غیر مہمل ہے' صاف کسی لڑکی کا نام معلوم ہوتا ہے۔ اردو میں ابھی اس قسم کے سیدھے سادے رقعوں کا رواج نہیں ہوا کہ "اے صاحب! فلاں تاریخ فلاں وقت میری بیٹی کی شادی ہے۔ آیئے اور نیوتہ دیجیے۔ تحفہ دیجیے اور خالی ہاتھ لٹکاتے ہوئے مت آیئے۔ ہم نے تمبو شامیانے کا سخت انتظام کیا ہے۔ دیگیں پکی ہیں۔ گوشت روٹی کھا کر جائیے۔ کیونکہ آپ نے ہمیں بھی کھلائی تھی وغیرہ۔ پنجاب والے ہمیشہ دوسروں سے نسبتاً "کم سرگشتہ خمار رسوم وقیود" رہے ہیں۔ ایک پرچے نے کسی صاحب کی شادی کے کارڈ کا مضمون نقل کیا ہے۔ جو راوی اور چناب ہی نہیں بیاس کے پانی میں بھی دھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یوں کہیے ابھی پوری طرح نچوڑا بھی نہیں گیا۔ نقل مطابق اصل۔

"سچے سجنوں تے مترو۔ شالا تسیں رب دیاں رحمتاں تلے پھلو تے پھلو۔ ساڈے لاڈلے پتر...... دا ویاہ 'لاڈلی دھی...... دے نال...... ہونا ایں۔ تسیں وی خوشیاں وچ رل کے تے دعاواں دی سانجھ پا کے ساڈا مان تے پت ودھاؤ۔

آیاں اگے اکھیاں وچھان والے

(یعنی چشم براہ)

مابعد۔ "ویلے دی ونڈ" یعنی تقسیم الاوقات یا ٹائم ٹیبل کے عنوان تلے درج ہے۔

سہرے دیاں لڑیاں سجان دا ویلا......
جنج دے ٹرن دا ویلا (روانگی برات)
لاڑے ولوں ان پانی......

اس آخری جملے کا مطلب ہے دولھا کی طرف سے دانا دُنکا یا آب و دانہ۔ مطلب ولیمہ۔ تھوڑی بہت پنجابی تو اپنی مادری زبان ہونے کی وجہ سے ہمیں بھی آتی ہے لیکن گیانیوں والی نہیں اور ویلے دی ونڈ تو ہم نے آج ہی سنا۔ اسے ایجاد بندہ بلکہ گندہ کہتے ہیں۔ سجنوں تے مترو۔ ماں تے پت (ماں تے پت نہیں) وغیرہ پڑھ کر تو مذکورہ پرچے کے ایڈیٹر کی طرح ہمیں بھی دربار صاحب امرتسر ہی یاد آیا۔

✲ ✲ ✲

اردو میں بھی دعوت ناموں کو سلیس بنانے کا ایک تجربہ کیا گیا ہے' ہمیں پسند آیا۔ آج کل نظام امتحان بھی بدل گیا ہے۔ ہمارے زمانے کا سا نہیں کہ لمبے لمبے جواب مضمون لکھنے پڑتے تھے۔ گزرے ہوئے بادشاہوں کی پالیسی بتانے کے علاوہ ان کے چال چلن کا سرٹیفکیٹ بھی دینا پڑتا تھا۔ یہ سوال و جواب کا زمانہ ہے۔ اسی سے لیاقت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ بابر نے پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کو مار مار کر کیا نکال دیا تھا؟ اگر آپ جواب میں فقط بھرکس لکھ دیں تو آپ شاندار نمبروں سے پاس ہیں۔ نادر شاہ کو دیکھ کر محمد شاہ کی کیا بندھ گئی تھی...... گھگی۔ صحیح جواب ہے شاباش بیٹھ جاؤ۔ یحییٰ خاں نے قوم کو کیا بنایا؟ الّو۔ اس کے بجائے کبوتر یا توتا یا کسی اور جانور کا نام لکھنا غلط ہو گا۔ آپ کے نمبر کٹ جائیں گے۔ ہم ذمہ دار نہ ہوں گے۔

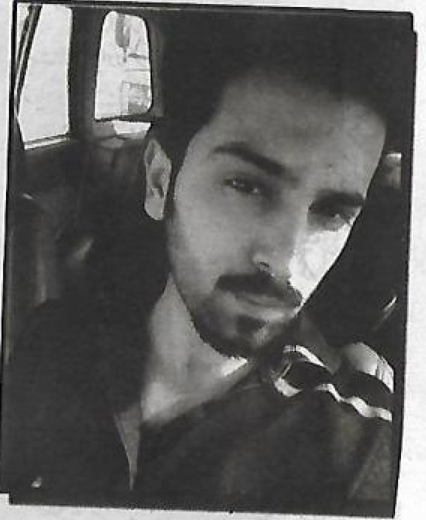
✲ ✲ ✲

خیر ذکر دعوت نامے کا تھا۔ اور دعوت نامہ ہمارے ایک بہت عزیز دوست کی شادی اور لاڑے وّلوں ان پانی یعنی ولیمے کا ہے۔ چونکہ یہ دن عید کے تھے اس لیے ہر کارڈ جو آتا تھا' لوگ اسے عید کارڈ سمجھ کر ایک طرف ڈال دیتے تھے یا بچوں کو دے دیتے تھے۔ اس لیے ابتدا اسی اطلاع سے کی گئی ہے کہ یہ کارڈ کیا ہے کس کا ہے اور کہاں ہے؟ کس طرف کو ہے۔ کدھر ہے۔ اب مضمون ملاحظہ ہو۔

باتیں یاسر عالم سے

مشاہین رشید

1۔ ''اصلی نام/شوبز کا نام؟''
''یاسر عالم ہی اصلی نام ہے اور شوبز کا بھی یہی نام ہے۔''
2۔ ''پیار کا نام؟''
''گھر والے اور دوست یار سب یاسر کہتے ہیں کیونکہ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ کوئی میرے نام کو بگاڑے۔''
3- ''تاریخ پیدائش/شہر؟''
''4 جولائی 1995ء۔''
4- ''قد/ستارہ؟''
''5 فٹ 10 انچ/کینسر۔''
5- ''مادری زبان؟''
''اردو۔''
6- ''فیملی ممبر؟''



''فیملی ممبر 5 ہیں۔امی، ابو، میری دو بہنیں اور میں اور میں اپنی بہنوں کا بڑا بھائی ہوں۔''
7- ''شادی؟''
''نہیں جی۔ ابھی نہیں ہوئی اور ابھی لائف میں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔''
8- ''تعلیمی قابلیت؟''
''بیچلر کر رہا ہوں کمپیوٹر سائنس میں۔ یوں سمجھیں کہ کمپیوٹر انجینئرنگ کر رہا ہوں اور میرا فائنل ایئر ہے۔''
9- ''شوبز میں آمد؟''
''شوق کے تحت آیا...... 2012, 2013 میں، میں نے ماڈلنگ کی۔ اس کے بعد اداکاری کا شوق ہوا اور 2016ء میں، میں نے آڈیشن دیا اور تب سے اب تک جدوجہد کر رہا ہوں۔''
10- ''گھر والوں کا ردعمل؟''
''پہلے پہل تو ناراض ہوئے مگر جب ڈراموں میں اور کمرشلز میں دیکھا تو انہیں میرا کام اچھا لگا اور انہیں یقین ہو گیا کہ میں اسے اپنا کیریئر بنا سکتا ہوں۔''
11- ''بچپن کی ایک بری عادت جو مشکل سے گئی؟''
''بچپن میں، میں بہت زیادہ کھاتا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنی عادت کم کی اور اب اللہ کا شکر ہے کہ نارمل کھاتا ہوں۔''
12- ''پہلی کمائی؟''
''500 روپے۔ طلعت حسین کے ساتھ ایک سین کیا تھا اور یہ بات ہے 2017ء کی۔ اے آر وائی کا ایک سوپ تھا۔''
13- ''شوبز کی بڑی برائی؟''
''اس فیلڈ میں زیادہ تر لوگ بناوٹی ہیں، یعنی ظاہر اور باطن میں بہت فرق ہے۔''
14- ''آپ کی صبح ہوتی ہے؟''
''میں گریجویشن کے فائنل ایئر میں ہوں تو کام کے لحاظ سے میری صبح ہوتی ہے۔ کبھی صبح آٹھ بجے تو کبھی صبح گیارہ بجے۔''
15- ''اٹھتے ہی کیا کھانے کو دل چاہتا ہے؟''
''کچھ نہیں۔ پانی پیتا ہوں۔''
16- ''دنیا میں تبدیلی لانے کو کہا جائے تو؟''
''لوگوں کی سوچ کو بدلوں گا کہ وہ دوسروں کے بارے میں مثبت سوچ رکھیں، منفی نہیں۔''
17- ''اچھی اور بری خبر سب سے پہلے کسے سناتے ہیں؟''
''اپنے گھر والوں کو۔ ظاہر ہے والدین کو ہی سناتا ہوں۔''
18- ''اپنے اندر کیا تبدیلی لانا چاہتے ہیں؟''
''مجھ میں صبر کا مادہ کم ہے، تو صبر لانا چاہوں گا جو اس فیلڈ کے لیے بہت ضروری ہے۔''
19- ''فخر کا کوئی لمحہ؟''
''جب میرا پہلا کمرشل آن ایئر ہوا تھا اور میرے گھر والوں نے سب کو بتایا کہ یہ میرا بیٹا ہے۔''
20- ''بری عادت؟''
''جذباتی بہت ہوں اور تھوڑا تھوڑا غصہ بھی آ جاتا ہے۔''
21- ''طبیعت میں ضد ہے؟''
''یہ منحصر ہے کہ میں کس بات پر ضد کر رہا ہوں۔ کچھ ٹھان لوں کہ یہ مجھے کرنا ہے تو بس کرنا ہے، دیگر باتوں میں ضدی نہیں ہوں۔''
22- ''اسپورٹس سے لگاؤ؟''
''جی جی...... بہت لگاؤ ہے۔ باسکٹ بال، فٹ بال اور کرکٹ بہت پسند ہے۔ کرکٹ سے زیادہ لگاؤ ہے، کھیلتا بھی ہوں۔''
23- ''زندگی سے کیا سیکھا؟''
''زندگی سے بہت کچھ سیکھا اور سیکھنے کا عمل ان شاء اللہ زندگی کی آخری سانس تک رہے گا۔''
24- ''اپنے آپ کو کس (عمر) Age کا تصور کرتے ہیں؟''
''آرٹسٹ ہوں تو مخصوص ایج کا اپنے آپ کو تصور نہیں کرتا۔ مجھے اپنی عمر سے بڑے اور چھوٹے کردار کرنا پسند ہے۔''
25- ''عشق اور محبت میں کیا فرق ہے؟''
''کیا فرق نہیں...... زمین آسمان کا فرق ہے۔ عشق ایک ہی بار ہوتا ہے اور یکطرفہ ہوتا ہے اور محبت آپ کسی سے بھی کر سکتے ہیں۔''
26- ''کبھی عشق ہوا؟''
''نہیں، عشق کی تلاش میں ہوں۔''
27- ''پہلی بار کیمرے کے سامنے گیا تو؟''
''پہلی بار......؟ میرے ہاتھ پاؤں — تو ابھی تک کانپتے ہیں۔''
28- ''کبھی ہجوم میں تنہائی محسوس کی؟''
''جی بالکل کی...... اکثر و بیشتر ہجوم میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہوں۔''
29- ''دل کی دھڑکن کب تیز ہوتی ہے؟''
''جب کبھی کوئی انہونی ہو جائے۔ کوئی ایسا واقعہ پیش آ جائے جو وہم و گمان میں بھی نہ ہو یا اچانک کوئی پیچھے سے آ کر ڈرا دے۔''
30- ''گھر میں سب سے زیادہ پیار کس سے ملا؟''
''اپنی ماں سے، پھر والد سے پھر بہنوں سے۔''
31- ''بیماری کو سیریس لیتے ہیں؟''
''ہاں، ڈرتا ہوں اور اللہ سے بہت معافیاں

مانگتا ہوں۔"

32- "بھوک میں آپ کی کیفیت؟"
"مجھ سے بھوک برداشت نہیں ہوتی، اس لیے زیادہ دیر تک بھوکا رہ نہیں سکتا۔"

33- "اگر کبھی ہوائی جہاز کا اوپن ٹکٹ ملے تو؟"
"تو پہلے حج عمرہ کی سعادت حاصل کروں گا اور پھر ترکی جاؤں گا۔"

34- "سیاست میں آئے تو کس کو فالو کریں گے؟"
"سیاست بہت بری چیز ہے اور اگر آیا تو تبدیلی کو ہی فالو کروں گا۔"

35- "اگر کسی ارب پتی کا بلینک چیک ہاتھ آجائے تو؟"
"تو اتنا اماؤنٹ لکھوں گا جتنا۔ میں سنبھال سکوں اور حق داروں کی مدد کر سکوں۔"

36- "ایک نصیحت جو لڑکیوں کو کرنا چاہتے ہیں؟"
"اپنی عزت کا خیال رکھیں اور کسی کو ایسا موقع مت دیں کہ اس کا مذاق حد سے تجاوز کر جائے۔"

37- "جھوٹ کب بولتے ہیں؟"
38- "تب جب میں سمجھتا ہوں کہ اس جھوٹ سے کسی کا نقصان نہیں ہوگا۔"

39- "کس کی تعریف میں کون سے دو جملے بولتے ہیں۔"
"شخصیت کو دیکھ کر تعریفی کلمات کہتا ہوں۔ مخصوص نہیں ہیں۔"

40- "شوبز میں جگہ بنانے کے لیے کیا کرتے ہیں / کیا ضروری ہے؟"
"کہ اپنے سے بڑوں سے کی عزت کریں اور چھوٹوں سے شفقت سے پیش آئیں۔"

41- "کس فنکارہ کے ساتھ رومینٹک سین کرنا اچھا لگتا ہے؟"
"نہیں مجھے کسی کے ساتھ بھی رومینٹک سین کرنا اچھا نہیں لگتا۔ اور اگر کرنا پڑا تو کروں گا کہ کام کرنا ہے۔ اب پتا نہیں کہ گھر والوں کا کیا ری ایکشن ہوگا۔"

42- "خواہش ہے کہ ایسی فلم — کروں جو......؟"
"جو پاکستان پر ہو، ہماری فورسز پر ہو، تو مجھے کام کر کے بہت اچھا لگے لگا۔"

42- "اپنی کمائی کا کتنے فیصد بچاتے ہیں؟"
"کوشش تو کرتا ہوں مگر بچت ہوتی نہیں۔"

43- "ایک محبت جو بھول نہیں سکتے؟"
"جی ایک محبت ہے جسے بھول نہیں سکتا اور نہ ہی بھولنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ وہ مجھے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتی ہے۔"

44- "کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں؟"
"شہر سے باہر کہیں گھومنے پھرنے کے لیے، دوستوں کے ساتھ۔"

45- "کس کو دیکھے بنا نیند نہیں آتی؟"
"اپنے گھر والوں کو دیکھے بغیر نیند نہیں آتی۔"

46- "گھر کے کس کمرے میں سکون ملتا ہے۔"
"اپنے کمرے میں۔"

47- "کبھی کرائسس میں وقت گزارا؟"
"جی ...... اونچ نیچ تو زندگی میں آتی ہی رہتی۔"

48- "بلڈ پریشر کب ہائی ہو جاتا ہے؟"
"کوئی ایسی بات کوئی ایسا کام جو مجھے سخت ناپسند ہو اور میرے سامنے ہو رہا ہو تب۔"

49- "آپ کے والٹ کی تلاشی لیں تو؟"
"تو بہت سارے کارڈز نکلیں گے وزیٹنگ کارڈز، پیسے کم نکلیں گے۔"

50- "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"

"وہ نصیحت جو انسان سوچے سمجھے بغیر دوسروں کو ۔۔ کرتا ہے۔"

51- "کھانے کی ٹیبل پر کیا ہونا ضروری ہے؟"
"سلاد...... اگر سلاد نہ ہو (ٹماٹر، پیاز، ہری مرچ) مجھے کھانے کا مزہ نہیں آتا۔"

[illegible]- "کھانے کا مزہ کہاں آتا ہے گھر میں یا گھر [illegible]؟"
"[illegible] میں سب کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر مزہ [illegible] بھی خواہش ہوتی ہے کہ زمین پر بیٹھ [illegible]"

[illegible] ہو تو آپ [illegible]

"[illegible] میں اپنے ابو کے بغیر کھانا نہیں کھاتا۔ گھر والے کھانا کھا بھی لیں تو میں ابو کا انتظار کرتا ہوں۔"

54- "انٹرنیٹ، فیس بک اور انسٹاگرام سے دلچسپی؟"
"دو تین سال پہلے فیس بک سے دلچسپی تھی [illegible] صرف انسٹاگرام سے دلچسپی ہے۔"

[illegible]- "وقت کی پابندی کرتے ہیں؟"
"[illegible] بالکل کرتا ہوں۔ وقت کو بہت [illegible]"

[illegible]- "کوئی کھانا جو کئی دن تک کھا سکتے ہیں؟"
"میرے خیال میں "دال چاول" بریانی سے زیادہ دال چاول پسند ہیں۔"

57- "کوئی ایسی تاریخ جو بھول نہیں سکتے؟"
"اپنی (6 جولائی) اور گھر والوں کی سالگرہ کی تاریخیں۔"

58- "دوسرے ملک جا کر کیا بات نوٹ کرتے ہیں؟"
"ان کا کلچر...... ہدایات وغیرہ۔"

59- "اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"
"سیل فون اور کتابیں کیونکہ مطالعہ کرنا مجھے پسند ہے۔"

60- "کوکنگ سے آپ کا لگاؤ؟"
"کوئی خاص تو نہیں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ مجھے کوکنگ آئے۔ میں چاہتا ہوں کہ انسان کو ہر کام آنا چاہیے۔"

61- "ایک کردار جو آپ کرنا چاہتے ہیں؟"
"ایک ایسا کردار کرنا چاہتا ہوں جو جذبات سے بھرپور ہو۔ جسے اپنی محبت نہ مل سکے مگر اس کا عشق کامیاب ہو جائے۔"

62- "ایک کردار جو مقبول ہوا؟"
"محبت خواب سفر" سیریل میں تنزیل کا کردار کیا تھا۔ وہ بہت مقبول ہوا تھا اور اب "ماہ تمام" کا کردار بھی مقبول ہوا۔"

63- "ایک کردار جو آپ کر کے پچھتائے؟"
"میرا نہیں خیال کہ میں کسی کردار کو کر کے پچھتایا ہوں۔ بہت سوچ سمجھ کر کردار لیتا ہوں۔"

64- "فیوچر پلاننگ؟"
"حال میں جیتا ہوں۔ فیوچر کے بارے میں زیادہ سوچتا نہیں ہوں۔ اگر موقع ملا تو سوشل ورک کروں گا۔"

65- "عورت حسین ہونی چاہیے یا ذہین؟"
"ففٹی ففٹی ہونی چاہیے۔ دونوں خوبیاں ہوں تو کیا ہی بات ہے۔"

66- ایک خواب جو بار بار دیکھتے ہیں؟"
"ایک کامیاب انسان بننے کا اور ایسے مقام پر پہنچنے کا خواب دیکھتا ہوں جہاں میں اپنے والدین کو ایک اچھی زندگی دے سکوں۔"

67- "پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟"
"بوٹ بیسن۔ وہاں ہر طرح کے کھانے ہوتے ہیں۔"

68- ''آئینہ دیکھ کر سوچتے ہیں کہ؟''
''اپنے آپ کو مزید اور اچھا کیسے کیا جائے۔''

69- ''شادی میں پسندیدہ رسم؟''
''کوئی خاص نہیں، نکاح کی رسم اچھی لگتی ہے۔''

70- ''ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟''
''امی کے ہاتھ کا۔ اس میں کوئی دو رائے ہو ہی نہیں سکتی۔''

71- ''بدلہ لیتے ہیں؟''
''نہیں بدلہ لینے پر یقین نہیں ہے۔ میں اپنے کام سے اپنے عمل سے بدلہ لیتا ہوں۔''

72- ''کب فریش ہوتے ہیں؟''
''جب بلیک کافی یا گرین ٹی پیتا ہوں۔''

73- ''اپنے تجربے سے سیکھتے ہیں یا دوسرے کے؟''
''اپنے تجربے سے سیکھتا ہوں۔ کیونکہ میرا یہ خیال ہے کہ جب تک آپ خود ایکسپیرینس نہ کرلیں تب تک آپ وہ چیز سیکھ نہیں سکتے۔''

74- ''دنیا میں اللہ تعالیٰ کا بہترین تحفہ؟''
''میرے والدین، میری بہنیں اور یہ کہ اللہ نے مجھے مسلم گھرانے میں پیدا کیا۔''

75- ''لوگ ملتے ہیں تو کیا فرمائش کرتے ہیں؟''
''سیلفی لینا پسند کرتے ہیں میرے پرستار۔''

76- ''آپ کی عجیب وغریب خواہش؟''
''کسی ٹھنڈی سی جگہ پر جاکر لکڑیوں کو آگ لگا کر ہاتھ سینکنے کا شوق ہے۔''

77- ''بچپن کا کوئی کھلونا جو آج بھی آپ کے پاس ہے؟''
''ایک ٹیڈی بیئر تھا مگر اب نہیں ہے۔''

78- ''ماڈلنگ اور فلم کی؟''
''جی...... ابتداء کمرشل سے کی اور فلم ابھی نہیں کی۔''

79- ''آپ کو فوبیا ہے؟''
''کم ہے مگر اونچائی سے ہے۔''

80- ''اپنی غلطی کا اعتراف کرلیتے ہیں؟''
''کرلیتا ہوں۔ پہلے نہیں کرتا تھا مگر اب کرلیتا ہوں۔''

81- ''کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟''
''عشق اندھا ہوتا ہے۔ محبت نہیں۔''

82- ''دل کی سنتے ہیں یا دماغ کی؟''
''سنتا دونوں کی ہوں مگر مانتا دل کی ہوں۔''

83- ''کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟''
''والٹ لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتا۔''

84- ''غصے میں پہلا لفظ کیا نکلتا ہے؟''
''بس کردو یار، اچھا ٹھیک ہے۔''

85- ''بستر پر لیٹتے نیند آجاتی ہے یا؟''
''ٹائم نہیں لگتا۔ جلدی سوجاتا ہوں۔''

86- ''رات سونے سے پہلے ایک کام جو ضرور کرتا ہوں؟''
''دانت صاف کرکے سوتا ہوں۔''

87- ''محنت سے پیسہ ملتا ہے یا قسمت سے؟''
''کسی کو نصیب سے زیادہ اور وقت سے پہلے کچھ نہیں ملتا۔ پھر بھی محنت بہت زیادہ ضروری ہے۔''

88- ''پسندیدہ تہوار؟''
''رمضان المبارک اور عید...... (رمضان المبارک تہوار نہیں ہے)

89- ''زندگی کب بری لگتی ہے؟''
جب انسان مایوس ہوجاتا ہے اور مایوسیوں کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔''

101- ''اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟''
زوال انسان سے برداشت نہیں ہوتا۔ لیکن اگر اللہ پر بھروسا ہو تو اللہ ہر عروج کے بعد زوال اور ہر زوال کے بعد عروج ضرور دیتا ہے۔ تو بس اللہ مالک ہے۔



اردو، انگریزی زبان میں تو بہت پی ایچ ڈی خواتین وحضرات مل جاتے ہیں مگر مقامی یا علاقائی زبان میں پی ایچ ڈی بہت کم ملیں گے۔ بلکہ ملتے ہی نہیں ہیں۔ تو جناب اس ماہ ہم آپ کی ملاقات ایک ایسی خاتون سے کروا رہے ہیں جو ''سرائیکی'' زبان کی پہلی ''پی ایچ ڈی'' ہیں۔ ڈاکٹر نسیم اختر آج کل شعبہ سرائیکی BZU بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر کے اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ ہم شکر گزار ہیں ڈاکٹر صاحبہ کے جنہوں نے اپنی مصروفیات میں سے ہمارے لیے وقت نکالا۔

''جی...... کیسے مزاج ہیں آپ کے؟''
''الحمد للہ!''
''میں 5 جولائی 1974 میں ڈیرہ غازی خان شہر میں پیدا ہوئی۔ والد سردار نبی بخش خان مستوئی نمبردار تھے اور زمیندار تھے۔ قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد گورنمنٹ کی طرف سے سرکاری سطح پر ہاؤس ٹرانسلیٹر بھی رہے۔ میرے دادا بھی بہت بڑے زمین دار تھے۔ میں نے ابتدائی تعلیم اپنے محلے کے اسکول ایم سی پرائمری گرلز اسکول نمبر 9 سے حاصل کی اور میٹرک تک تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول نمبر 2 سے حاصل کی۔ بورڈ (میٹرک) میں میری پانچویں پوزیشن تھی جس کی وجہ سے مجھے میرٹ کی بنیاد پر اسکالرشپ دی گئی۔ اس کے بعد بی اے تک کی تعلیم گورنمنٹ ڈگری کالج فاروومن سے حاصل کی...... میں نا صرف تعلیم میں مسلسل کامیابی حاصل کررہی تھی بلکہ کھیلوں میں بھی نمایاں تھی۔ اور ''والی بال'' کی بہترین کھلاڑی مانی جاتی تھی اور میں نے چار سال آل پاکستان انٹر کالیجیٹ والی بال میچز کھیلے اور مزید کھیلنے کی آفرز بھی آتی رہیں لیکن میں نے بی اے کے بعد یہ سلسلہ ختم کردیا۔ کیونکہ 1995 میں میں نے ''ایم اے انگریزی'' میں داخلہ لے لیا۔ اور ایک ایوننگ کالج میں بطور وائس پرنسپل کی جاب کرلی۔ بس جاب سے قبل ''کہکشاں'' کالج میں ایوننگ شفٹ میں بطور ٹیچر کام کیا۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ جیسے ہی میٹرک میں پانچویں پوزیشن آئی تو میں ایوننگ کالج والوں کی ہٹ لسٹ میں شامل ہوگئی اور ان کی آفرز ہر وقت میرے لیے کھلی تھیں۔ چنانچہ میں جب بھی امتحانات سے فارغ ہوتی یا گرمیوں کی چھٹیاں ہوتیں تو مجھے پڑھانے کے لیے بلا لیا جاتا تھا۔

بہن بھائیوں میں میرا نمبر دوسرا ہے۔ مجھ سے

ڈاکٹر نسیم اختر سے ملاقات

شاہین رشید

بڑے بھائی سردار خان ہیں۔ مجھ سے چھوٹا بھائی ''کرم خان'' پھر بہن 'ممتاز بی بی اور پھر ''نذر خان'' اور ''وقار خان'' ہیں...... میری شادی 2003ء میں ہوئی میرے میاں صاحب کرنل ہیں ان کا نام جاوید اقبال ہے۔ کچھ ہی عرصہ قبل انہوں نے ریٹائرمنٹ لے لی ہے۔ اور اپنی زمینوں پر ''زمینداری'' کرتے ہیں۔ میرے ماشاء اللہ چار بچے ہیں بڑی بیٹی ''ایمن جاوید'' پھر ''محمد نچل جاوید''، ''محمد شہباز جاوید'' اور ''محمد شاہ جہاں جاوید'' ہیں۔

ڈاکٹر نسیم اختر صاحبہ سے مزید سوالات پوچھنے سے پہلے ہم آپ کو یہ بتاتے چلیں کہ سرائیکی زبان میں دو ہی خواتین نے بہت نام کمایا۔ ایک اقبال بانو جو سرائیکی زبان کی پہلی ناول نگار ہیں اور اب ڈراما نگار بھی ہیں اور دوسری نسیم اختر جن کا آپ انٹرویو پڑھ رہی ہیں سرائیکی زبان کی پہلی پی ایچ ڈی خاتون ہیں۔''

''آپ سرائیکی زبان کی پہلی خاتون ہیں جنہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے۔ کیسا محسوس کرتی ہیں۔''

بہت اچھا محسوس کرتی ہوں اور دلچسپ بات بتاؤں کہ پی ایچ ڈی کرنے کے بعد جب مجھے لوگ ڈاکٹر کہتے تھے تو یہ میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔

کیونکہ جب میں نے ''پی ایچ ڈی'' میں داخلہ لیا تب سے ہی ہر محفل میں۔ ہر کانفرنس میں مجھے ڈاکٹر ہی کہا جانے لگا اور میرے نام کے ساتھ ڈاکٹر بھی لکھا جانے لگا۔ اور میں سب کو یہی کہتی تھی کہ ابھی میری پی ایچ ڈی مکمل نہیں ہوئی تو آپ مجھے ڈاکٹر نہ کہا کریں۔ تو ڈاکٹر میرے لیے اب پرانا ہو گیا ہے۔ ہاں...... اب جب کوئی ڈاکٹر کہتا ہے تو بڑا اطمینان بھی ہوتا ہے اور خوشی بھی کہ میں نے سچ مچ ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔''

''لوگ اردو اور انگریزی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لیتے ہیں اور آپ نے ''سرائیکی'' میں لی، وجہ؟''

انگریزی، اردو اور دیگر مضامین میں ''پی ایچ ڈی'' کرنا ایک کامن سی بات ہے۔ مگر ''سرائیکی'' مضمون کو منتخب کرنا ایک چیلنج والی بات تھی اور میں نے ''اسے ایک چیلنج سمجھ کر کیا اور یہ کہ ایک علاقائی زبان کس طرح عالمی سطح کی زبانوں اور لٹریچر کے برابر ہے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ میرے نزدیک سرائیکی زبان و ثقافت کی بھی اتنی ہی ویلیو جتنی کسی بھی انٹرنیشنل مضمون کی ہو سکتی ہے۔''

''پی ایچ ڈی کی ڈگری لینے کے بعد مالی طور پر کوئی فائدہ ہوا؟ اور نیشنل اور انٹرنیشنل سطح پر سراہا گیا۔''

''ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے بعد ابھی تو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ البتہ خرچہ کافی ہو گیا۔ جہاں تک نیشنل اور انٹرنیشنل سطح پر سراہے جانے کی بات ہے تو ایسا بھی کچھ نہیں ہوا۔ البتہ بہت جلد تعلیمی اداروں میں رول کے مطابق مجھے بھی پی ایچ ڈی الاؤنس ملا کرے گا۔ ہاں نیشنل سطح پر یعنی ملتان کی حد تک اور اپنی یونیورسٹی میں میری کاوشوں کو کافی سراہا گیا۔

''آپ کا ٹاپک کیا تھا اور پی ایچ ڈی کرنے پر کسی نے اکسایا یا حوصلہ افزائی کی۔''

''میرا ٹاپک'' سرائیکی ادب پر عالمی ادبی تحریکوں کے اثرات کا جائزہ تھا۔ اور مجھے کسی نے موٹیویٹ نہیں کیا بلکہ یہ میرا جنون تھا اور یونیورسٹی میں بطور استاد میری ضرورت تھی اور یونیورسٹی لیول کو نیٹ کرنا مقصود تھا۔

''پی ایچ ڈی کے دوران کیا دشواریاں پیش آئیں؟''

''جب میں نے سرائیکی میں ''ایم فل'' اور پی ایچ ڈی کرنے کی شروعات کی تو مجھے بہت ساری دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلے یونیورسٹی میں کئی سال تک مجھے ''این او سی'' نہیں ملا۔ اور یوں مردوں کے اس معاشرے میں میرا پہلا ٹاکرا ہوا اس طرح

کے ٹاکرے اور دیگر جگہوں پر کئی مرتبہ ہو چکے تھے۔ مگر عملی درس گاہ میں اس طرح بے معنی تقابل پہلی دفعہ تھا...... یہاں سے تھک ہار کر۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں داخلہ لے لیا اور اپنے آپ کو مسلسل مسافرت کے لیے تیار کیا...... وہاں جب میں نے پہلی دفعہ داخلہ لیا تو میرا بیٹا ـــ بہت چھوٹا تھا اور گھر میں اس کی دیکھ بھال کے لیے والدہ صاحبہ کو زحمت دیتی تھی جو ''ڈیرہ غازی خان'' میں مقیم ہیں۔ وہ آجاتی تھیں پھر میں ہر ویک اینڈ پر گھر آتی اور سنڈے کی رات سفر کرتی اور پیر کی صبح کلاس میں ہوتی تھی...... ایم فل کرنے کے بعد میرا تیسرا بیٹا پیدا ہوا...... جب پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا بلکہ داخلہ ٹیسٹ اور انٹرویو دینے کے لیے میں اسلام آباد گئی تو وہ صرف دو ماہ کا تھا...... یہ سلسلہ طویل عرصے تک چلتا رہا...... اور آپ خود سوچیں کہ ایک بچے کی ماں کو اور ایک عورت کو اور یونیورسٹی میں جاب کرنے والی خاتون کو کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔''

''پی ایچ ڈی کا مواد اکٹھا کرنا مشکل تھا یا آسانی سے مل جاتا تھا؟''

''پی ایچ ڈی کا مواد اکٹھا کرنے کے لیے کسی بھی مستند لائبریری کو میں نے نہیں چھوڑا۔ جو کتابیں لائبریری میں نہیں ہوتیں وہ میں خرید لیتی تھی...... انٹرنیٹ سے بہت کچھ حاصل کیا...... میرے کلاس فیلوز، میرے اساتذہ اور دیگر کئی علم دوستوں نے مجھے سستی اور تحفتاً کتابیں فراہم کیں اور ریفرنس بکس بھی عنایت کیں۔ میرے سپروائزر تو میری تحقیق کے دوران میرے لیے بہت بڑی بلیسنگ ـــ (مہربان) تھے جو ریفرنس مجھ سے مس ہو جاتا تھا وہ اس میں ـــ ایڈ کر دیتے تھے اور مجھے تاکید کرتے تھے کہ میں اس ریفرنس اور ریجنل بک کا مطالعہ ضرور کروں۔''

''کیا سرائیکی زبان میں مزید طالب علم بھی ہیں؟''



''جی ہاں سرائیکی زبان کے اور بھی طالب علم ہیں۔ اور کچھ ہی عرصہ کے بعد ''علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی'' اسلام آباد سینٹرل لائبریری کی طرف سے Online بھی حاصل کر سکیں گے۔ اور ''ایچ ای سی'' اسلام آباد کی ویب سائیٹ پر بھی کچھ عرصہ بعد پی ایچ ڈی تھیسس کے لیے مواد مل جایا کرے گا۔ اس طرح اب جو طالب علم آئے ہیں اور آئیں گے انہیں زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔''

''آپ پہلی سرائیکی خاتون ہیں پی ایچ ڈی کی مرد حضرات کی تعداد کتنی ہے؟''

''جی...... جی...... میں پہلی خاتون ضرور ہوں مگر مرد حضرات کی تعداد کافی ہے۔ مثلاً ڈاکٹر غضنفر مہدی، ڈاکٹر جاوید چانڈیو، ڈاکٹر صفدر بخاری، ڈاکٹر حمید الفت ملتانی، ڈاکٹر صدیق ملک، ڈاکٹر خالد

اقبال اورڈاکٹرممتازخان کے نام قابل ذکر ہیں۔"

"اس پی ایچ ڈی کی کتنی اہمیت ہے؟"

"سرائیکی پی ایچ ڈی کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کسی اور مضمون میں پی ایچ ڈی کرنے کی ہے اور یہ ڈگری میرے لیے مزید تعلیم حاصل کرنے کا ذریعہ بھی بنے گی۔ اور میں اس کی بناپر اب Post D کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہوں. اور دوسری بات یہ کہ یونیورسٹی میں رہتے ہوئے آپ پی ایچ ڈی کے بغیر اپنے آپ کو نہیں منوا سکتے۔"

"گھر کا ماحول کیسا تھا؟ کیا پڑھائی والا تھا اور کس بات نے آپ کو پڑھائی کی طرف راغب کیا؟"

"ہمارے گھر کا ماحول روایتی زمینداروں والا تھا۔ والد صاحب نے تین شادیاں کی تھیں۔ ہماری والدہ سب سے چھوٹی تھیں۔ بابا جان پڑھے لکھے انسان تھے...... بیٹوں کی پڑھائی پر ان کی توجہ تھی...... مگر لڑکیوں کی پڑھائی کے حوالے سے ماحول روایتی ہی تھا...... میٹرک سے بی اے تک گھر کے کچھ لوگوں کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ میں کس کلاس میں پڑھ رہی ہوں۔ البتہ والدہ صاحبہ نے اس معاملے میں خوب ساتھ دیا۔ اور آپ کا یہ سوال کہ کس بات نے راغب کیا تو سچ بات یہ ہے کہ گھر کے ماحول نے ہی پڑھائی کی طرف راغب کیا...... پھر میں ایتھلیٹ بھی تھی۔ پڑھائی میں بھی تیز تھی تو گیمز اور پڑھائی۔ دونوں میں ہی میرا بہت دل لگتا تھا۔ اور شکر خدا کا کہ مجھے اساتذہ بھی بہت اچھی ملیں۔ جنہوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔ اور مجھے بہت محنت کرائی اور بہت توجہ کے ساتھ پڑھایا...... میں نے بھی شروع سے ہی اساتذہ کو فالو کیا اور وہی میرے آئیڈیل بھی رہے اور ان ہی کو دیکھ کر مجھے بھی ٹیچر بننے کا شوق ہوا۔"

"لڑکیوں کو تعلیم کے حصول کے لیے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے...... اور کیا بچپن سے ہی آپ پڑھا کو بچی تھیں؟"

"تعلیم کی راہیں کبھی بھی لڑکیوں کے لیے آسان نہیں رہیں شروع سے اب تک چیلنجز کا مقابلہ کر رہی ہوں...... پڑھا کو تو میں بچپن سے ہی تھی...... ہر کلاس میں پہلی پوزیشن لی۔ تھرڈ آوٹ میرٹ کی بنیاد پر اسکالر شپ لی۔ ٹیوشن پڑھی بھی اور ٹیوشن پڑھائی بھی تھی اور یہ سلسلہ ایم اے کے بعد بھی جاری رہا۔"

"پریکٹیکل لائف میں کب آئیں اور پہلی کمائی کیا تھی آپ کی؟"

"پریکٹیکل لائف میں تو کالج کے زمانے سے ہی آ گئی تھی میری پہلی کمائی 2700 روپے تھی۔

شادی کے بعد میری سلیکشن بطور لیکچرار دی ایجوکیشن کالج ملتان میں ہوئی۔ کچھ عرصہ وہاں پڑھایا۔ بچوں کا سلسلہ شروع ہوا تو جاب چھوڑ دی۔"

"آپ کی تصانیف بھی کتابی شکل میں ہیں۔ ان کے بارے میں بتائیں۔"

جی...... میری تصانیف میں "میں تو وہ ہوں"، "سرائیکی ثقافت"، "گوشہ یقین فکری"، "دیوان عارضی معہ ڈوہڑو جات احمد یار فریدی"، "اماں سین"، "چولستان لوک کہانیاں"، "آپا صفیہ کا تیسرا آنسو"، "سچل سرمست کا سرائیکی کلام"، "سرائیکی افسانے وچ خواتین دے مسائل"، "سرائیکی حزب الامثال اور سرائیکی وسیب"، "ذبح نامہ" اور "دیوان سید ولایت شاہ بخاری" ان کے علاوہ کئی مقالات بھی شامل ہیں۔"

"اس ساری جدوجہد میں آپ کے میاں صاحب کا کیا رول رہا؟"

اس ساری جدوجہد میں میرے میاں صاحب نے ہی مجھے سپورٹ کیا ان کی تو خواہش تھی کہ میں پی ایچ ڈی کسی دوسرے ملک میں جا کر کروں لیکن چونکہ ہمارے بچے چھوٹے تھے اس لیے میں نے باہر جانے کا فیصلہ ترک کر دیا...... میری تعلیم کے معاملے میں وہ ...... کبھی بھی اپنے ماتھے پر شکن نہیں لائے وہ ہر جگہ میرے ساتھ رہے...... جب میں ایم فل کے داخلے کے لیے گئی تب بھی وہ میرے ساتھ تھے ...... جب ایم فل کا وائیوا تھا تب بھی ہم فیملی کے ساتھ گئے تھے۔ انہوں نے کبھی نہیں کہا کہ تمہاری وجہ سے میں یا بچے ڈسٹرب ہو رہے ہیں...... میں آج اس مقام پر ان ہی کی وجہ سے ہوں۔"

"گھر داری میں کیسی ہیں آپ؟ کھانا خود پکاتی ہیں کیا؟"

"گھر داری میں اللہ کا شکر ہے کہ بہترین ہوں۔ چونکہ مجھے اپنے بچوں اور خاوند سے محبت ہے اس لیے میں اپنی فیملی کے لیے کھانا بڑے شوق سے پکاتی ہوں...... اپنی تعلیمی مصروفیات کی وجہ سے تین دفعہ مجبوراً کک کی خدمات حاصل کی مگر جب دیکھا کہ میاں صاحب کی دلچسپی کھانے سے کم ہوتی جا رہی ہے تو پھر میں نے خود پکانا شروع کر دیا اور آج تک پکا رہی ہوں اور جو بھی پکا کر سامنے رکھ دوں شوق سے کھا لیتے ہیں۔"

"عموماً دیکھا ہے کہ استاد اسی جگہ پر رہتا ہے جبکہ شاگرد تعلیم مکمل کرنے کے بعد اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں ایسا کیوں ہے؟"

"آپ نے صحیح فرمایا۔ نہ صرف استاد کی ترقی کا پروسس سست روی کا شکار رہتا ہے بلکہ اب تو سیاست زدہ بھی ہو گیا ہے یہ ہمارے ملک کا المیہ ہے اللہ بہتر کرے۔"

"تھکی ہاری گھر آتی ہیں تو کیا محسوس کرتی ہیں؟" "تھکی ہاری گھر آتی ہوں تو...... سکون سا ملتا ہے۔ گھر تو ایک گوشۂ عافیت ہے جہاں سب کچھ اچھا ہوتا ہے۔ اور چاہے کتنی ہی تھکی ہوئی کیوں نہ ہوں گھر کے ادھورے کام سمیٹنے لگ جاتی ہوں اور بھرپور طریقے سے اپنی فیملی کو ٹائم دیتی ہوں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے نسیم اختر صاحبہ سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں اپنا ٹائم دیا۔

عمیرہ احمد

الف

حسن جہاں سے زندگی میں ایک غلطی سرزد ہوئی۔ لیکن وہ بھی معاف نہیں کی گئی، وہ بار بار خط لکھ کر اپنی غلطی ک
معافی مانگتی ہے۔
ایک بچہ تواتر سے اللہ تعالیٰ کو خط لکھتا ہے اور اسے ایک درخت کے تنے میں رکھ دیتا ہے۔ وہ جواب کا منتظر ہے
ایک دن ماں بتاتی ہے کہ اس کے خط کا جواب آ گیا ہے۔
ایک بوڑھا خطاط آیت کی خطاطی کر رہا ہے۔ یک دم اس پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اسے اپنے گر
روشنیوں کا ہالہ رقصاں نظر آتا ہے۔
قلب مومن انڈسٹری کا کامیاب ترین ڈائریکٹر ہے۔ اسے خود پر، اپنی صلاحیتوں پر پورا اعتماد ہے۔
مؤمنہ سلطان ایک باصلاحیت فنکارہ ہے لیکن اسے اب تک اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے کوئی موقع نہیں
ہے۔ انڈسٹری میں ہیروئنیں اس کے ٹیلنٹ سے خائف ہیں، وہ اسے آگے نہیں آنے دیتیں۔
مومنہ کا باپ سلطان میک اپ آرٹسٹ ہے۔ وہ اداکارہ حسن جہاں کا میک اپ مین رہ چکا ہے اور اس کا بہت بڑ



مداح ہے۔ اب بیماری کی وجہ سے انڈسٹری سے آؤٹ ہے۔ مومنہ کی ماں ثریا بھی اپنے وقت کی اداکارہ ہے۔ اب انڈسٹری نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ مومنہ کے اکلوتے بھائی جہانگیر کے گردے جواب دے چکے ہیں، وہ ڈائیلاسس پر ہے۔ گردے کے ٹرانسپلانٹ کے لیے ایک بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ مومنہ فلموں میں کام نہیں کرنا چاہتی۔ اسے فلم انڈسٹری پسند نہیں ہے لیکن مجبوراً یہ کام کرنا پڑ رہا ہے۔

قلب مومن نئی فلم بنانے کا اعلان کرتا ہے تو داؤد مومنہ کی سفارش کرتا ہے۔ وہ آڈیشن کے لیے قلب مومن کے پاس جاتی ہے تو قلب مومن اس کا دوپٹہ اتارنے کے لیے کہتا ہے۔ مومنہ انکار کر دیتی ہے تو وہ اسے اسٹوڈیو سے نکل جانے کے لیے کہتا ہے۔

مومنہ باہر نکل جاتی ہے تو اس کو یاد آتا ہے کہ وہ جہانگیر کی میڈیکل ٹیسٹوں کی فائل اسٹوڈیو میں بھول آئی ہے۔ وہ لوٹ کر جاتی ہے تو قلب مومن اس کے ساتھ بہت ہتک آمیز انداز میں پیش آتا ہے جواباً مومنہ بھی کوئی لحاظ نہیں کرتی اور اسے کھری کھری سنا کر آئینہ دکھا دیتی ہے۔

وہ کہتی ہے کہ تمہارا کام چیپ اور تم اس سے زیادہ چیپ ہو، عورت کا جسم دکھا کر جو تم آرٹ کی خدمت کر رہے ہو، میں اس کا حصہ نہیں بننا چاہتی۔

دوسری قسط

پیارے بابا!

میں جانتا ہوں، اس خط کے لفافے پر میرا نام دیکھ کر آپ چونکے ہوں گے پھر بہت دیر تک آپ نے اس لفافے کو کھولا نہیں ہوگا۔ میرا نام دیکھتے رہے ہوں گے اور آپ کو سب کچھ یاد آتا رہا ہوگا۔ جو میں آپ سے کہہ کر گیا تھا اور جس پر میں آپ سے نادم ہوں۔ آپ نے سوچا ہوگا، خط کھولے بغیر لفافے کو پھاڑ کر پھینک دیں مگر یہ آپ سے ہو نہیں سکا ہوگا کیونکہ میں آپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ طٰہٰ عبدالعلی۔ جسے آپ نے میری ماں کے جانے کے بعد چڑیا کے بچے کی طرح تن تنہا پالا اور جس کے لیے آپ نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ لفافہ پھاڑ کر پھینک دیتے تو بھی دوبارہ ٹوکری سے نکال کر کاغذ کے ٹکڑوں کو جوڑ لیتے۔ دل تو ہے نہیں یہ کہ ٹوٹ کر نہ جڑتا۔

کیا لکھوں آپ کے نام اس خط میں۔ اپنی شرم ساری، اپنی ندامت یا اپنی بے بسی۔ بابا! آپ کو چھوڑ کر گیا تھا۔ پر آپ سے کٹ کر رہا نہیں جا رہا۔ آپ یاد آتے رہتے ہیں، زیادہ نہیں بس ہر سانس کے ساتھ۔

آپ کا دل دکھایا ہے پر میرے پاس اُس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ کیا کرتا؟ آپ کو چھوڑ کر کم از کم زندہ تو رہ رہا ہوں۔ حسن جہاں کو چھوڑ دیتا تو یہ بھی نہ کر پاتا۔ خط پڑھ رہے ہوں گے تو حسنِ جہاں کے نام پر آپ کے ماتھے پر بل آیا ہوگا۔ میں جانتا ہوں، آپ اب بھی اُس کے لیے اپنا دل بڑا نہیں کر پائے ہوں گے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار آپ کو کسی سے نفرت کرتے دیکھا ہے اور وہ بھی اُس سے جس سے مجھے محبت ہے۔ مجھے اندازہ ہی نہیں تھا بابا! آپ نفرت نام کی کسی شے سے واقف بھی ہیں۔

آپ تو اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ کی کائنات سے۔ اس کائنات میں ایک حسنِ جہاں بھی ہے جسے اللہ نے دنیا میں پیدا کر کے اُس کو میرے دل میں رکھ دیا ہے۔ وہ ویسی ہی ''روح'' رکھتی ہے جیسی آپ اور میں، ویسا ہی دل جیسا آپ اور میں...... پھر بابا! آپ مجھے حسنِ جہاں سے محبت کرنے کے لئے معاف کیوں نہیں کر سکتے۔

میرے بس میں ہوتا اُسے پیار نہ کرنا تو میں کبھی نہ کرتا۔ میرے بس میں ہوتا اُس سے ترک تعلق کرنا تو میں کب کا کر چکا ہوتا...... پر میرے بس میں کچھ بھی نہیں۔ اُسے دل سے نہیں نکال پاتا اور آپ کو دماغ سے۔ میں آج کل دل اور دماغ کی اس جنگ میں صرف ایک بے کار وجود بن کر رہ گیا ہوں۔

آپ کی بددعا میں لگ رہی ہیں مجھے۔ میں جانتا ہوں، یہ پڑھتے ہوئے آپ بے قرار ہوئے ہوں گے کیونکہ آپ تو مجھے بددعا دے ہی نہیں سکتے نا لیکن آپ کا دل دکھایا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے، اللہ ناراض نہ ہوا ہو مجھ سے۔

اب اللہ کا نام نہیں لکھ پاتا میں۔ لکھتا بھی ہوں تو وہ نام میری روح سے نہیں بس ہاتھوں سے لکھا جاتا ہے۔ لوگ ے ہاتھ سے بنی خطاطی کو اب نہیں دیکھتے، دنگ ہونا تو دور کی بات ہے اور خریدنا تو اُس سے بھی دور کی بات۔

میں جانتا ہوں، آپ کہیں گے۔ دل میں حسنِ جہاں بسا کر اللہ کا نام لکھو گے تو یہی ہوگا۔ شاید شرک کر بیٹھا ہوں مگر توبہ کی توفیق بھی نہیں ہو پا رہی۔ طٰہٰ عبدالعلی بڑی تکلیف میں ہے آج کل۔ اللہ کو پکارتا ہوں تو وہ نہیں سنتا۔ آپ کو پکار رہا ہوں کیونکہ اللہ آپ کی ہمیشہ سنتا ہے۔ اُس سے کہیں طٰہٰ کو معاف کر دے۔ طٰہٰ کے دل سے حسن جہاں مٹا دے، وہاں اپنا ٹھکانا بنائے۔ طٰہٰ کے ہاتھوں اور روح کو اس قابل رہنے دے کہ وہ اللہ کے نام لکھے تو لوگوں کے دلوں کو موم کر دے۔ اللہ کی کبریائی کے خوف سے۔ منور کرے اللہ کی محبت کے نور سے۔ پر یہ تب ہی ہوگا جب آپ طٰہٰ کو معاف کریں گے۔ بابا مجھے معاف کر دیں۔

آپ کا نافرمان بیٹا
طٰہٰ عبدالعلی

☆☆☆

قلب مومن نے بے یقینی کے عالم میں اپنی ماں کے ہاتھوں سے وہ لفافہ لیا۔ اُس پر اُس کا نام لکھا تھا بے حد خوبصورت رسم الخط میں۔

''اللہ تعالیٰ کی ہینڈ رائٹنگ کتنی خوب صورت ہے۔''

اُس نے اُس لفافے پر نظر ڈالتے ہوئے ایک لمحہ کے لیے سوچا۔ پھر سر اُٹھا کر اپنی ماں کو دیکھا جس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ اُس نے لفافہ لیتے ہوئے نوٹس کی تھی۔ وہ سر تا پا لرز رہی تھی۔ اپنی مسکراہٹ کو ہونٹوں میں اور آنسوؤں کو آنکھوں میں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے اُس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا یا شنگرفی یا گلابی۔ پتا نہیں وہ کون سا رنگ تھا۔ کلر بیلٹ کے سارے رنگوں سے زبانی واقف ہونے کے باوجود مومن بوجھ نہیں سکا مگر کم از کم وہ زرد رنگت نہیں تھی۔ وہ زرد رنگت جو وہ اپنے باپ کے جانے کے بعد اپنی ماں کے چہرے پر دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا۔

وہ ایک خوب صورت سرخ گلاب کی طرح کھل اُٹھی تھی یا شاید جی اُٹھی تھی۔ وہ ماں کو مبہوت دیکھتا رہا۔

''تم خط نہیں پڑھو گے؟'' اُس کی ماں نے جیسے اُسے یاد دلایا۔

''ہاں، مگر اسے کھولا کس نے؟'' اس نے یک دم لفافہ پلٹا اور اُس کا اُٹھا ہوا فلیپ دیکھا۔

''میں نے۔'' کچھ مجرمانہ سے انداز میں اُس کی ماں نے کہا۔ وہ راز جو اُس کے اور اللہ کے درمیان تھا وہ اُس کی ماں بھی جان گئی تھی اور یہ بات اُس وقت مومن کو اچھی نہیں لگی تھی۔ وہ چپ چاپ خط لیے اندر آ گیا۔

میرے پیارے قلبِ مومن!

تمہارے سارے خط اللہ تک پہنچ گئے ہیں اور انہوں نے پڑھ بھی لیے ہیں۔ وہ تمہیں خود اُن سب کا جواب دینا چاہتے تھے لیکن پھر انہوں نے سوچا، وہ تمہارا جواب میرے ذریعے تم تک پہنچا دیں۔ میں 15 تاریخ کو آؤں گا، تمہاری سب باتوں کا جواب لے کر۔

تمہارا دادا
عبدالعلی

جس بے قراری اور بے چینی سے اُس نے لفافہ کھول کر خط پڑھنا شروع کیا تھا۔ اُسی بے قراری کے ساتھ ہی اُس نے خط ختم بھی کیا۔ بے حد مایوسی کے ساتھ۔

''تو یہ خط اللہ تعالیٰ نے لکھ کر نہیں بھیجا۔'' اُس نے عجیب مایوسی سے سوچا۔ ''پردادا یہاں کیوں آرہے ہیں؟'' اُس کے ذہن میں اگلا سوال اُبھرا۔ مگر اُس سے بھی بڑا سوال یہ تھا کہ دادا کو یہ کیسے پتا چلا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کو خط بھیجا تھا۔ اور دادا کو کیوں اُس کے خطوں کا جواب دینے کے لیے اللہ نے چنا۔ کیا وہ بھی اللہ کے پاس رہتے ہیں۔

سوالات کا ایک انبار تھا جس نے اُس کے ذہن کا گھیراؤ کیا ہوا تھا۔

''مومن۔'' وہ اپنی ماں کی آواز پر بے اختیار پلٹا۔ وہ پتا نہیں کب اُس کے پیچھے کمرے میں آگئی۔

''اللہ تعالیٰ نے خود خط کیوں نہیں لکھا مجھے؟'' اُس نے ماں کو دیکھتے ہی بے ساختہ کہا۔

''خود نہیں لکھتے وہ، اُن کے پاس بہت سارے لوگ ہوتے ہیں کام کرنے کے لیے۔ اُنہوں نے کسی کو کہہ دیا ہوگا یہ کام کرنے کے لیے۔'' اُس کی ماں نے اُس کے ہاتھ میں پکڑا خط اُس کے ہاتھ سے لے کر اُسے بڑی احتیاط سے تہ کر کے لفافے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''انہوں نے دادا سے کہا ہے۔'' مومن کو لگا جیسے اُس کی ماں نے خط دھیان سے نہیں پڑھا تھا۔

''ہاں، میں جانتی ہوں۔'' مدھم آواز اُسے سنائی دی۔ اُس کی ماں اب خط کو اُس کی اسٹڈی ٹیبل پر رکھتے ہوئے اُس پر ایک پیپر ویٹ رکھ رہی تھی۔

ایک لمحہ کے لیے مومن کو خیال آیا، وہ ماں کو بتا دے کہ اُس نے خط میں اپنے باپ کو بھیجنے کا کہا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے ہی وہ جھجکا اور پھر اُس نے ماں سے کہہ دیا۔

''لیکن میں نے تو بابا کو بلایا تھا، دادا کو تو نہیں بلایا تھا۔'' اُس کے شکوے کا جواب اُس کی ماں نے ایک پراسرار مسکراہٹ سے دیا مگر اُس مسکراہٹ کے ساتھ اُس کی آنکھوں میں بہت سارے قمقمے سے روشن ہوئے تھے۔

''وہ بھی تو آرہے ہیں۔''

وہ ساکت ہوا پھر خوشی سے بے قابو۔

''آپ کو کیسے پتا چلا؟'' مومن بے اختیار چلایا تھا۔

جواب میں ایک اور مسکراہٹ آئی اور پھر ایک ہنسی۔ اُس نے باپ کے جانے کے بعد آج پہلی بار ماں کو کھلکھلا کر ہنستے دیکھا تھا۔ سرخ ہوتے، چمکتے چہرے کے ساتھ۔ مومن کو یقین آگیا تھا کہ اللہ تعالیٰ واقعی اُس کے بابا کو بھیج رہے تھے اور وہ بھی اُس کے دادا کے ساتھ جن سے وہ کبھی نہیں ملا۔ مگر اس سے بھی زیادہ ناقابل یقین بات یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کو اُس کے سارے خط مل گئے اور انہوں نے اس کے خط پڑھ بھی لیے۔

اُس کی ماں کمرے سے جا چکی تھی اور مومن وہیں کھڑا تھا۔ اپنے دل کی دھڑکنوں کو گنتا...... وہ کل اسکول میں سب کو بتا سکتا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو جو خط لکھتا تھا، وہ اللہ کو مل گئے تھے اور اُسے اُن کا جواب بھی ملنے والا تھا مگر اُس سے پہلے اُسے ایک کام کرنا تھا۔

☆☆☆

وہ بھاگتا جا رہا تھا۔ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ، کھیتوں میں لہلہاتی ہوئی سبز فصل کے بیچوں بیچ اُس پگڈنڈی پر جو اُس جنگل کی طرف مڑ رہی تھی۔ اُس کی سائیکل کا ٹائر پنکچر تھا اور مومن کل تک انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ سارے دیو، جن، بھوت، چڑیلیں اُسے سب بھول چکی تھیں جو اس جنگل میں کہیں نہ کہیں بستے تھے اور جن سے پورا قصبہ بچوں کو ڈراتا تھا۔ یاد تھا تو بس اُسے وہ لیٹر باکس یاد تھا جس میں ڈالے ہوئے خط اللہ تک پہنچ گ

...صدیق جانتا تھا کہ یہ سب جھوٹ نہیں تھا۔ اُس کی ماں کی کوئی طفل تسلی بھی نہیں تھی۔

...وہیں پڑا تھا جہاں اُس نے رکھا تھا۔ اس سوکھے ہوئے درخت کے گرے ہوئے تنے پر جو مسلسل ...والی بارشوں میں اُسی تنے کی طرح نم تھا۔ مومن چلتے ہوئے تنے کے پاس آیا اور اس نے بے تابی سے ...ت کے تنے پر لٹایا اور اُس کا نیچے والا وہ حصہ کھولا جس کو کھول کر خط نکالے جاتے تھے۔ لیٹر باکس ...اُن کے تمیں کے تمیں خط اللہ تک پہنچ چکے تھے۔ مومن کا دل چاہا وہ بے اختیار اُچھلے، چیخے اور ...تھوڑا سا ڈانس کر لے تو جو جواب اُس کے پاس آیا وہ اللہ ہی کی طرف سے آیا تھا۔ اُس نے اپنے منہ ...لر جیسے اپنے کھلے ہوئے ہونٹوں اور کھلی کھلی پڑتی مسکراہٹ کو بیک وقت چھپایا۔ لیٹر باکس کا نچلا ...بند لیا اُسے سیدھا کر کے تنے پر رکھا۔ ایک بار پھر مسکرایا، پلٹا اور برق رفتاری سے دوبارہ بھاگنے لگا۔ پیروں ...نیچے آنے والے درختوں کے خشک اور سبز پتوں نے اس بار کوئی چرمراہٹ نہیں کی کیونکہ وہ سب بارش کے ...انی میں بھیگے ہوئے تھے البتہ جہاں جہاں بھاگتے ہوئے مومن کے قدم پڑ رہے تھے وہاں وہاں پیروں کے ...ان گڑھوں کی شکل میں پڑ رہے تھے۔ کچھ چھینٹے اُڑ کر اُس کی پتلون پر بھی لگے...... پر قلب مومن کو اس وقت ...ں چیز کی پروا نہیں تھی۔ نہ کیچڑ کی نہ جنگل کے ویرانے کی، نہ ہی اس بات کی کہ اُسے وہاں سے بھاگتے ہوئے ایک لمبا فاصلہ طے کر کے واپس گھر پہنچنا تھا۔ اپنی ماں کے پاس حسنِ جہاں کے پاس۔

☆☆☆

جیولری کے اُس کھلے ڈبے کے اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ جو کچھ تھا، اُس ڈبے کے گرد ڈریسنگ ٹیبل پر بکھرا پڑا تھا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے حسن جہاں بیٹھی آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔ سر پر جوڑے کی شکل میں لپیٹے ...ئے بالوں کو اُس نے ہیر پن نکالتے ہوئے کھولا۔ وہ سر سے کندھوں تک آئے پھر کندھوں سے نیچے اُس کی ...مر سے لپٹتے ہوئے گرتے چلے گئے۔

بستر پر لیٹا ہوا قلبِ مومن کروٹ لیے کھلی آنکھوں سے حسنِ جہاں کو دیکھتا گیا۔ اُس کی ماں بے پناہ خوب صورت تھی۔ اُس نے بہت لوگوں سے سنا تھا اور اُن لوگوں میں اُس کا اپنا باپ بھی تھا اور اب ایک بار پھر وہ اپنی ماں کو اُسی طرح اُس آئینے کے سامنے بیٹھا دیکھ رہا تھا جس طرح وہ اُس کے باپ کے جانے سے پہلے بھی کبھار بیٹھ کر تیار ہوا کرتی تھی۔ سنگھار کرتی تھی، زیور پہنتی تھی اور ''حسنِ جہاں'' بن جاتی تھی پھر اُس کی ماں نہیں رہتی تھی کیونکہ اُس پر کسی کی نظر ٹھہرتی ہی نہیں تھی مگر ایسا کبھی کبھار ہوتا تھا...... کسی تہوار پر کسی خاص دن یا اس وقت جب وہ یا اُس کا باپ کسی بات پر بہت خوش ہوتے۔

اپنے باپ کے جانے کے بعد مومن نے کبھی اُسے سنگھار کرتے نہیں دیکھا تھا۔ زیور پہننا تو دور کی بات اُس نے کبھی اپنی ماں کو اس آئینے کے سامنے بیٹھا بھی نہیں دیکھا جس کے سامنے وہ رات کے اس پہر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ رات کے اس پہر اُس کی اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھ کر روتے اور سسکتے ہوئے وہ خط لکھا کرتی جسے وہ اُس الماری والے ڈبے میں ڈال دیتی تھی۔ مومن کو یہ نہیں پتا تھا کہ وہ اُن خطوں میں کیا لکھتی ہیں مگر یہ ضرور پتا تھا کہ وہ یہ خط کس کو لکھتی ہیں۔ اُس کے باپ طٰحہٰ عبدالعلیٰ کو......

''ممی! آپ کے پاس کتنے زیادہ زیور ہیں!'' وہ بہت دیر بستر پر خاموش لیٹا نہیں رہ سکا۔ اُٹھ کر حسنِ جہاں کے پاس چلا آیا اور ڈریسنگ ٹیبل پر بکھرے ہوئے زیورات میں سے ایک ہار اُٹھاتے ہوئے اُس نے کہا۔ حسنِ جہاں اپنے کانوں میں جھمکے پہن رہی تھی، اُس کی بات پر ایک لمحہ کے لیے جیسے وہ ٹھٹکی پھر بے اختیار مسکرائی۔

''سب نقلی ہیں۔'' اُس نے جیسے مومن کو بتایا مگر اُس نے اُس کی بات پر غور نہیں کیا وہ اس وقت اُس خوب صورت امیٹیشن جیولری کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھا۔

''آپ ہمیشہ ایسے رہا کریں۔'' ایک جھومر اُس کے ماتھے کے اوپر بالوں میں لٹکاتے ہوئے اُس نے ماں سے یک دم فرمائش کی۔

''کیسے؟'' وہ ہنسی۔

''ایسے خوب صورت اور خوش۔'' مومن کو جتنے آسان الفاظ میں اُسے سمجھانا آیا اُس نے سمجھا دیا۔

اُس کی ماں نے عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھا، یوں جیسے حیران ہوئی ہو کہ وہ کیسے جانتا تھا کہ وہ خوش نہیں تھی۔ ماؤں کو غلط فہمی ہوتی ہے کہ صرف وہی اولاد کا چہرہ پڑھ سکتی ہیں۔ اُنہیں یہ اندازہ نہیں ہوتا، اُن کی اولاد بھی اُن کا چہرہ ویسے ہی پڑھ سکتی ہے۔

''تمہارے بابا آرہے ہیں...... اب ہمیشہ خوش اور خوب صورت رہوں گی۔'' اُس نے مومن کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔

''میں نے بلایا ہے، اس لیے آرہے ہیں۔'' مومن جتائے بغیر نہیں رہ سکا۔

''ہاں، جانتی ہوں تمہارے بلانے پر ہی آرہے ہیں۔ میرے بلانے پر تو کبھی نہ آتے۔'' وہ بچہ تھا پھر بھی ماں کے لہجے میں چھلکتی اُداسی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

''بابا گئے کیوں تھے؟'' وہ سوال قلبِ مومن نے پہلی بار نہیں کیا تھا۔ ہر روز کرتا تھا۔

''مجھ سے ایک غلطی ہوگئی تھی۔'' جواب وہی آیا جو ڈیڑھ سال سے آرہا تھا۔

''تو آپ معافی مانگ لیتیں۔'' وہ حل بھی مومن ڈیڑھ سال سے اُس کے سامنے رکھ رہا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ معافی مانگنا ایک بات تھی معافی ملنا دوسری۔

''مانگی تھی۔'' اُس کی آواز بھرآئی اور اُس نے مومن سے نظریں چُرالیں۔

مومن ماں کا لہجہ ''بریل'' کی طرح پڑھتا تھا۔

''میں بابا سے کہوں گا، آپ کو معاف کردیں۔'' یہ وعدہ بھی پرانا تھا اور مرہم بھی۔ وہ حسنِ جہاں کے بالوں کو اپنی انگلیوں کے گرد لپیٹ رہا تھا مسحور مدہوش انداز میں، جیسے جادو ٹونا کررہا ہو۔

''بابا آئیں گے تو آپ سفید گلاب لگائیں گی نا؟'' اُس نے جیسے ماں کو یاد دلایا۔

''سفید گلاب تو تمہارے بابا لاتے تھے میرے لیے۔ وہ لائیں گے تو لگالوں گی۔'' حسنِ جہاں کو پتا نہیں کیا یاد آیا۔

''میں لادوں گا آپ کو۔'' اُس نے بے حد پرجوش انداز میں ماں کو اپنی خدمات پیش کیں۔

''تم کہاں سے لاؤ گے؟'' وہ ہنسی۔

''کہیں سے بھی توڑ کر۔'' وہ سوچ میں پڑا۔

''یہ گلاب کا موسم نہیں ہے۔'' حسن جہاں نے اُسے یاد دلایا۔

''میں آپ کے لیے کہیں سے بھی لے آؤں گا۔''

وہ ہنسی اور ہنستی ہی چلی گئی۔ ایسا وعدہ تو کبھی طٰحہٰ نے بھی نہیں کیا تھا۔ اُس کی ہنسی اُس کے آنسو ساتھ لے کر آئی تھی۔ پرانی سہیلی کی طرح۔ مومن نے ماں کی خوب صورت آنکھوں کو ہمیشہ کی طرح پانی سے بھرتے دیکھا۔

''ممی! مجھے آپ روتے ہوئے اچھی نہیں لگتیں۔'' اُس نے جیسے بے قرار ہوکر ماں سے کہا۔ طٰحہٰ بھی یہی کہتا تھا۔ وہ ہمیشہ ہر بات میں اسے طٰحہٰ کی یاد دلاتا تھا۔ حسنِ جہاں نے اُلٹے ہاتھ سے آنسو رگڑے۔ آنکھیں خشک کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پھر اُسے دیکھ کر مسکرائی یوں جیسے اسے خوش کرنا چاہتی ہو۔

''آپ مجھ سے زیادہ پیار کرتی ہیں یا بابا سے؟'' قلبِ مومن نے اُس سے سوال کیا۔

وہ طٰحہٰ کے سامنے بھی اُس سے یہی پوچھا کرتا تھا۔ اُس کے جانے کے بعد آج پہلی بار اُس سے دوبارہ پوچھ رہا تھا۔

''تم سے زیادہ بابا سے اور بابا سے زیادہ تم سے۔'' وہ بے اختیار ہنسی۔ مومن نے بُرا مانا۔

''یعنی زیادہ کس سے؟'' اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔

''جو مجھ سے زیادہ پیار کرتا ہے اُس سے۔'' حسنِ جہاں نے بے ساختہ کہا۔

''وہ تو میں کرتا ہوں۔'' حسنِ جہاں نے قلبِ مومن کی آنکھیں دیکھیں۔ کیا آنکھیں تھیں، کیا معصومیت تھی۔ کیا سچ تھا اور کیا اعتراف تھا۔ محبوب کا اظہارِ محبت عورت دل پر لکھتی ہے۔ اولاد کا اظہارِ محبت روح پر...... پہلا قبر تک جاتا ہے، دوسرا آسمانوں تک ساتھ لے کر جاتی ہے۔

''ممی! مجھے نیند آرہی ہے۔'' اس نے ماں کے بالوں کو اپنی انگلیوں کے گرد سے کھولتے ہوئے یک دم جمائی لی۔

وہ اُسے دیکھ کر رہ گئی۔ اگر وہ نہ ہوتا تو اس کی زندگی میں کیا تھا...... کچھ بھی نہیں۔ وہ قلبِ مومن کو بستر پر جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اُن سارے نقلی زیورات میں جو وہ اپنے اردگرد پھیلائے بیٹھی تھی۔ صرف ایک اصلی تھا اُس کے پاس...... قلبِ مومن۔

☆☆☆

"تمہارے بابا آگئے تو پھر تم کیا کرو گے؟"

اسکول میں اُس کے سب سے قریبی دوست نے لنچ بریک میں اُس سے پوچھا۔ قلبِ مومن کے باپ کے واپس آنے کی خبر اُس کی پوری کلاس میں گردش کر رہی تھی۔ اس خبر کے ساتھ کہ قلبِ مومن نے اللہ کو خط لکھ کر اپنے بابا کو بلوایا تھا...... وہ دنوں میں جیسے وہاں "اسٹار" بن گیا تھا......

"پھر ہم یہاں سے چلے جائیں گے، ممی کہتی ہیں۔" اُس نے اطمینان سے اپنے دوست کو بتایا۔

"اور کہاں جاؤ گے تم لوگ؟" اُس کے دوست نے کریدا۔

"یہ تو نہیں بتایا ممی نے۔" قلبِ مومن نے سر کھجا کر کہا۔

"تم نے اللہ سے اور کیا کیا مانگا ہے قلبِ مومن؟" اِس کے دوست نے چند لمحے بعد اپنے لنچ کا سینڈوچ کھاتے ہوئے بالآخر اُس سے وہ سوال پوچھا جس کا اُسے تجسس تھا۔ قلبِ مومن نے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ ایک بات بتا چکا تھا، ساری باتیں نہیں بتا سکتا تھا۔

اس دن وہ گھر آتے ہوئے بے حد خوش تھا۔ کیونکہ گھر میں بہت کچھ بن رہا تھا۔ اُس کے بابا کا فیورٹ کیک...... اور فیورٹ ڈش اور مومن کا فیورٹ ڈونر کباب۔ اُس کی ماں اُس دن اُس اسٹور میں کام پر نہیں گئی جہاں وہ اسٹور کیپر تھی۔ وہ صبح سے اُس کے بابا کے استقبال کی تیاری میں مصروف تھی۔

مومن کا خیال تھا، وہ گھر پہنچے گا تو بابا وہاں آچکے ہوں گے، مگر ایسا نہیں تھا۔ بابا ابھی بھی نہیں آئے تھے اور اُس کی ماں ایک بہترین لباس پہنے ہوئے تھی۔

"ممی۔" ماں نے دروازہ کھولا اور قلبِ مومن اسے دیکھ کر اپنا سوال بھول گیا۔ حسنِ جہاں کو جیسے اندازہ ہوا کہ وہ کیا پوچھنا چاہتا تھا۔

"بس۔ وہ آنے ہی والے ہوں گے مومن! تم جلدی سے کپڑے تبدیل کرلو۔ میں کھانا بنا رہی ہوں۔" وہ کہتے ہوئے وہاں رُکے بغیر اندر گئی اور اُسی رفتار سے مومن بھی اندر گیا۔

کپڑے تبدیل کرتے ہوئے اُسے کچھ خیال آیا اور وہ ماں کے پیچھے باورچی خانہ میں آگیا۔

"ممی! وہ جو آدمی ہمارے گھر آیا تھا، اس کا کیا نام تھا؟" کام کرتے ہوئے حسنِ جہاں نے اس کے سوال کو دھیان سے نہیں سنا۔

"کون سا آدمی؟" اس نے مومن کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"جس کی وجہ سے بابا خفا ہو کر گئے تھے۔" حسنِ جہاں ساکت ہوگئی۔ ساکت شاید چھوٹا لفظ تھا، وہ برف ہوئی تھی۔ پلٹ کر اس نے قلبِ مومن کو دیکھا۔ وہ ڈیڑھ سال بعد بھی اس شخص کو یاد کر رہا تھا جس کی وجہ سے طلا... وہ سوچ نہیں سکی۔ مومن اسے دیکھ رہا تھا جیسے عدالت کے سامنے کٹہرے میں کھڑے مجرم کو جج دیکھتا ہے۔

"تمہیں سب یاد ہے؟" وہ اُس سے یہ سوال نہیں کرنا چاہتی تھی جو کر رہی تھی۔ مومن نے سر ہلایا۔ وہ آگے بڑھ آئی۔ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھی۔ اسے دونوں کندھوں سے پکڑا اور کہا۔

"وہ کوئی آدمی نہیں ہے۔ تم سب کچھ بھول جاؤ۔" وہ اُس سے عجیب منت بھرے انداز میں کہہ رہی تھی۔ مومن نے سر اثبات میں ہلایا پھر اُس سے پوچھا۔

"وہ دوبارہ تو نہیں آئے گا نا؟" اُس کے انداز میں ایک عجیب سا خوف تھا جیسے وہ ہر اُس چیز کو وہاں آنے سے روک دینا چاہتا ہو جو اُس کے باپ کو خفا کر سکتی تھی۔

"ابھی نہیں۔" حسنِ جہاں نے بے اختیار کہا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، بیرونی دروازے کی بیل بجی۔ ..ن نے یک دم ماں سے اپنے آپ کو چھڑایا۔

"بابا آگئے۔" وہ بھاگا تھا، بیرونی دروازے کی طرف اور حسنِ جہاں بھی اُسی طرح باہر لپکی۔ ڈیڑھ سال ...اُس سے ملنے، اُسے دیکھنے جا رہی تھی جو اُس کا محبوب تھا اور اُس سے خفا تھا اور اب لوٹ آیا تھا تو وہ عجیب ...ثاری اور بے خودی کے عالم میں تھی۔

مومن نے دروازہ کھولا اور دروازے کے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر وہ ساکت ہوا۔ ایسا ہی سکتہ اُس کے پیچھے آتی حسنِ جہاں کو ہوا تھا۔

☆☆☆

وہ چہرے پر پانی کے چھینٹے مارتی ہی چلی گئی۔ چہرے پر کچھ تھا ہی نہیں جو اُسے صاف کرنا ہو مگر پھر بھی آنکھیں بند کیے یوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں لیے پانی کو منہ پر مارنا اُسے اچھا لگ رہا تھا۔ شاید پانی اُس کی شرم ساری دھو ڈالتا جو اُس نے اُس دن محسوس کی تھی اور اُس ذلت کو بھی جو اس وقت اُسے اپنے ماتھے پر چبھ رہی تھی۔

"کچھ تو عقل کرتی مومنہ! سیدھا انکار کر کے ہی آگئی۔" اس نے اپنے عقب میں ثریا کی آواز سنی جو اُسے تولیہ پکڑانے آئی تھی۔

"تو اور کیا کرتی منی اسکرٹ پہن کر دکھا دیتی۔" وہ تلخ ہونا نہیں چاہتی تھی لیکن ہوگئی۔ تولیہ سے گیلے چہرے کو رگڑتے ہوئے اُس نے جیسے اپنی ہزیمت بھی چھپائی۔

"تو اُنہیں دو تین سین کر کے دکھاتی۔ وہ ایکٹنگ دیکھتے تو خود رول دیتے تجھے۔" اُس نے تولیہ ہٹا کر ماں کو دیکھا۔ اُن کی سادگی پر اسے ہنسی آئی حالانکہ اُسے رونا آرہا تھا۔

"اماں! یہاں کسی کو ایکٹنگ، ایکسپریشنز، پرفارمنس نہیں دیکھنی۔ یہاں سب کو ایکٹریس کا صرف جسم دیکھنا اور دکھانا ہوتا ہے۔" اُس نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ ثریا کو بے اختیار جھجک محسوس ہوئی۔ مومنہ کبھی ایسی باتیں تو نہیں کرتی تھی۔

"ایسا بھی کلیوگ نہیں ہے۔" ثریا نے بے اختیار اُس انڈسٹری کا دفاع کرنے کی کوشش کی جس کا وہ کبھی ...رہی تھی۔

"کلیوگ ہی ہے اماں۔ آپ کا زمانہ نہیں ہے یہ۔ اب سینما میں سب شریف اور خاندانی لوگ جاتے ہیں۔ اپنے اپنے خاندان کے ساتھ مگر دیکھنے وہ بھی آئٹم نمبر ہی جاتے ہیں۔" اُس نے پلٹ کر ماں کو جیسے اکیسویں ...ی میں لانے کی کوشش کی۔

"پر ایک چیز پرفارمنس بھی تو ہوتی ہے۔ ایکٹنگ بھی تو ہوتی ہے۔" ثریا نے اپنے زمانے سے چپکے رہنے کی ...ی کوشش کی۔

"وہ آپ کے زمانے میں ہوتی ہوگی اور اُس کی قدر بھی آپ کے زمانے میں ہی ہوتی ہوگی۔ میں جس ...یں ہوں اماں! اس میں صرف گلیمر بکتا ہے۔ قیمت ہوتی ہے ہر چیز کی، "قدر" نہیں۔" وہ ماں سے اب ...یں بات کر رہی تھی۔ جو کچھ اُس کے ساتھ آج ہوا تھا، وہ اُن کا قصور نہیں تھا۔

"...نا پرانا زمانہ تو نہیں تھا میرا۔" ثریا کے جیسے کلیجے پر ہاتھ پڑا۔

"...ں بھی کوئی پندرہ بیس سال پہلے ہی کی تو بات ہے۔" وہ پھر بڑبڑائی۔

"پندرہ بیس سال دو دہائیوں کو کہتے ہیں اماں۔"
وہ دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ ثریا نے جیسے ہتھیار ڈال دیے۔ اُس انڈسٹری کا دفا نہ کرنے کا فیصلہ کیا جس کے لیے وہ اب پرانی اور آؤٹ ڈیٹڈ ہو چکی تھی۔

"یہ فلم مل جاتی تو جہانگیر کا گردہ ٹرانسپلانٹ ہو جاتا۔ مومن کی ہر فلم ہٹ ہوتی ہے۔ یہ فلم بھی ہٹ ہو جاتی تم اسٹار بن جاتیں۔ کام ہی کام ہوتا تمہارے پاس۔ اس کے بعد کوئی فلم نہ بھی ملتی تو بھی ٹی وی پر ہی کام مل جاتا جہانگیر کا علاج۔"

ثریا خود کلامی کر رہی تھی۔ یوں جیسے اسے اُس خیالی محل کو توڑتے ہوئے تکلیف ہو رہی ہو جو وہ کل سے موم کی فلم میں اُسے کام مل جانے کے تصور پر ہی کھڑا کر کے بیٹھ گئی تھی۔ جملے کے آخر تک جاتے جاتے اس ۔ مومنہ کا چہرہ دیکھا اور اس کے چہرے کی ندامت نے جیسے کچھ دیر کے لیے ثریا کی آواز چھینی۔ مومنہ اب ماں کا چہر کسی مجرم کی طرح دیکھ رہی تھی، جس کا جرم ثابت ہو گیا تھا، اب سزا کا اعلان باقی تھا۔

"کھانا...... کھانے کا تو پوچھا ہی نہیں میں نے۔" ثریا کو یک دم خیال آیا۔ اُس کے پاس اب بھی ایک چ ایسی تھی جس کا ذکر کر کے وہ اس صورت حال سے مومنہ اور خود کو بچا سکتی تھی۔

"نہیں۔ بھوک نہیں ہے اماں۔" مومنہ اندر کمرے میں جانے کے لیے پلٹی۔

"شوٹ پر کچھ کھا لیا تھا نا؟" ثریا پیچھے آئی یوں جیسے اپنا احساس جرم کم کرنا چاہتی ہو۔

"ہاں...... کھا لیا۔" اس نے آج کچھ بھی نہیں کھایا تھا لیکن اس کے باوجود اُسے بھوک بھی نہیں تھی۔ کچھ دن ہوتے ہیں اچھے اور کچھ دن ہوتے ہیں بُرے...... مگر مومنہ سلطان کے دن کم بُرے اور زیادہ بُرے کی کیٹیگر میں بٹے ہوئے تھے۔ اندر کمرے میں نیم تاریکی تھی اور ٹھنڈک مگر وہاں جہانگیر بھی تھا۔ اُس کے انتظار می بیٹھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور جہانگیر نے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ اُس کے سوالوں کے جواب دینے کے لی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ مگر شاید اس نے صحن میں ہونے والی ساری گفتگو سن لی تھی۔ بہن کے لیے اس کے پا سوال نہیں تھے مگر اس کی نگاہ میں ہمدردی تھی۔

وہ جس آگ کے دریا سے روز گزر کر آتی تھی وہ دریا اس کی وجہ سے مومنہ کی زندگی میں آیا تھا اور جہانگیر اس پر ندامت تھی، رنج تھا مگر وہ بے بس تھا۔ بالکل اس گھر کے باقی تینوں افراد کی طرح۔ وہ اُن سے یہ نہیں کہ سکتا تھا کہ وہ اُسے مرنے کے لیے چھوڑ دیں۔ وہ کہہ بھی دیتا تو بھی وہ نہ چھوڑتے، کبھی اُن سب نے بہت اچ وقت بھی دیکھا تھا، پہلے تب جب سلطان فلم انڈسٹری میں کام کر رہا تھا پھر تب جب جہانگیر کو چائلڈ آرٹسٹ طور پر کام ملنا شروع ہو گیا تھا، مگر وہ سارا وقت اب صرف یادوں اور خواب کی شکل میں تھا۔ زندگی وہ تھی جو اُ کے سامنے کھڑی تھی۔

"تم ایک دن بہت بڑی اسٹار۔" لمبی خاموشی کے بعد جہانگیر نے اُس کے لیے جو جملہ ڈھونڈا مومنہ اُسے بیچ میں ہی کاٹ دیا۔

"میں خواب نہیں دیکھتی جہانگیر۔ نہ خیالی پلاؤ پکاتی ہوں اور تم مجھے تسلی مت دو۔ مجھے اس کی ضرورت نہ ہے، میں ٹھیک ہوں۔"

اس نے جہانگیر سے کہا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر اور اپنی بات کے آخر تک وہ عجیب انداز میں کمزور پڑی تھی سیاہ حلقے، بجھتی ہوئی آنکھیں، گھلتا ہوا وجود مومنہ سلطان کے ہر حوصلے کو مٹی کر دیتا۔ ہر سوچ کو ردی، ہر خواہش پانی۔ وہ اُس کے سامنے یہ تک نہیں کہہ پائی کہ اگر دنیا میں کوئی چیز اُس کے قدموں کے نیچے سے ریت بن

رُتی ہے تو وہ جہانگیر کی بیماری کا خیال تھا، باقی کسی چیز کو وہ کچھ نہیں گردانتی تھی۔

"میں جانتا ہوں، آپ خطاط بننا چاہتی تھیں۔ آرٹ پڑھنا چاہتی تھیں، میں آڑے آ گیا۔" جہانگیر نے سر جھکا کر کہا۔ وہ غلط وقت پر اُسے یہ سب یاد دلا رہا تھا۔

"خطاطی میں آج بھی کرتی ہوں، آرٹ میں کبھی بھی پڑھ لوں گی۔"

وہ اگلا جملہ جو کہنا چاہتی تھی اُسے کہہ نہیں پائی، "لیکن تمہاری زندگی کو میں کسی ٹائم مشین پر نہیں ڈال سکتی کہ آگے لے جاؤں۔" وہ مزید کچھ کہے بغیر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُسے قلبِ مومن سے اُس لمحہ شدید نفرت محسوس ہوئی، اُس کے سارے جملے اُس کے کانوں میں اب بھی گونج رہے تھے۔

بستر پر لیٹ کر اپنی چادر تاننے کی کوشش کرتے ہوئے اُس نے ایک بار پھر جیسے اپنی اُس دنیا میں جانے کی کوشش کی اور وہ ناکام رہی۔ اس کے اوپر تنی چادر کی کینوپی کے اندر قلب مومن کا چہرہ دکھنے لگا تھا۔ بالکل ایسے جیسے کسی پروجیکٹر کی اسکرین پر۔ اس کی نظریں۔ ان آنکھوں میں اُس کے لیے جھلکنے والی حقارت، وہ رعونت جس سے اُس نے مومنہ کا بازو پکڑا تھا اور وہ جملے۔ وہ سب کچھ جیسے پروجیکٹر کے اوپر چلنے والی کسی فلم کی طرح دیکھ رہی تھی۔

چادر کو اس نے یک دم اپنے سر سے اتارا اور سانس لینے کی کوشش کی۔ پھر وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ قلبِ مومن کا تکبر کسی آکٹوپس کی طرح اُس کی سوچوں کو اپنے شکنجے میں لیے بیٹھا تھا۔ وہ جس انڈسٹری میں تھی وہاں ہتک اور توہین اُس کے لیے ان چکھا پھل نہیں تھے، نہ غرور اور تکبر وہ پرندہ جسے اس نے کبھی دیکھا ہی نہ ہو، مگر پہلی بار کسی نے اس کی اس طرح بے عزتی کی تھی، کام مانگنے پر...... ورنہ کوئی بھی سامنے کچھ بُرا نہیں کہتا تھا...... کہنا بھی ہوتا تو پیٹھ پیچھے کہتا تھا۔ یہ پہلی بار تھا کہ کسی نے صرف کام مانگنے پر اُسے یہ سب کہا۔ اُس نے قلبِ مومن کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔ اُسے دوبارہ کبھی زندگی میں اُس کا سامنا کرنا ہی نہیں تھا......

اور زندگی...... "زندگی میں تو ایسا بہت کچھ ہو جاتا ہے......" اُس نے جیسے خود کو بہلانے کی کوشش کی تھی...... "زندگی میں تو ایک فیصل بھی ہوتا ہے جو نہیں ملتا اور یہ تو صرف ایک فلم تھی۔"

اُسے اپنی تسلی اور بہلاوے پر یک دم ہنسی آئی...... اس کا دماغ فیصل کو کہاں سے لے آیا تھا یا پھر دل تھا جو اُس کو اُس وقت لایا جب اُسے مرہم کی ضرورت تھی...... آنکھیں بند کیے اس نے بے بسی سے اپنا ماتھا چھوا۔ پہلے وہ قلبِ مومن کو اپنے ذہن سے نکالنے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ اب اُسے فیصل کو بھی نکالنا تھا۔ نیند آج اُس کے مقدر میں ہی نہیں تھی۔

☆☆☆

کوئی رنگ کالا ...... کوئی پیلا
کوئی لال گلابی کردا......
بلھے شاہ رنگ مرشد والا
کسے کسے نوں چڑھدا......

وہاں بیٹھا پورا مجمع اُس کلام کے اُن جملوں میں بے اختیار ہاتھ اور بازو اُٹھا اُٹھا کر داد دے اُٹھا تھا اور داد دینے والوں میں نیہا بھی تھی جو اُس کے برابر فرشی نشست پر بالکل پہلی قطار میں تھی۔ گلوکار منجھا ہوا تھا اور پکے سُر کے ساتھ گا رہا تھا اور بار بار اُن جملوں کو دُہرا رہا تھا جس پر اُسے داد مل رہی تھی۔ چالیس، پچاس لوگوں کا وہ مجمع بیٹھے جھوم رہا تھا۔ کچھ کے ہاتھوں میں مشروب کے گلاسز تھے اور کچھ اُس سونف اور چھالیہ کو بار بار لے کر منہ میں ڈال رہے تھے۔ جس کی ٹرے لیے ویٹر بار بار چکر لگا رہا تھا اور کچھ فرشی نشست پر تقریباً نیم دراز آنکھیں بند کیے

سرور کے کسی عالم میں پہنچے ہوئے تھے۔

گلوکار نے بلاشبہ سماں باندھ دیا تھا۔ اس مجمع میں صرف چند لوگ تھے جو گلوکار کو کسی داد و تحسین کے بلند و بانگ اظہار کے بغیر سن رہے تھے اور اُن میں سے ایک قلبِ مومن بھی تھا...... وہ گلوکار پر بغور نظریں جمائے ہوئے تھا مگر اُس کے کہنے پر لہک نہیں رہا تھا نہ دوسروں کے کہنے پر بہک رہا تھا۔ نہ ہاتھ پاؤں اور سر کو گلوکار کی تانوں اور اُس کے میوزک پر ہی ہلا رہا تھا۔ وہ بس سُن رہا تھا۔...... کسی جملے پر وہ محظوظ ہوتا تو اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی اور سر کی ہلکی سی جنبش پر وہ داد دیتا لیکن ایسا شاید اس ڈیڑھ گھنٹے کی محفل میں دو یا تین بار ہی ہوا تھا۔ وہ وہاں نیہا کے اصرار پر آیا تھا ورنہ اُسے صوفی کلام کی محفلوں میں آنے اور وقت گزارنے میں دلچسپی نہیں تھی۔ یہ اُس کے مزاج کی موسیقی نہیں تھی مگر نیہا کو وہ انکار نہیں کرسکتا تھا۔

"Uff.... so spiritual" نیہا نے اُس کے برابر بیٹھے ہوئے گلوکار کی کسی لائن پر جھومتے ہوئے قلبِ مومن کے کان میں سرگوشی کی۔ وہ صرف مسکرا کر رہ گیا۔

Spiritual کیا تھا اُس گانے اور اُس کے کلام میں یہ مومن جان نہیں پا رہا تھا...... آواز کمال تھی طبلہ اور ہارمونیم بجانے والے اپنے کام کے ماہر تھے۔ لیکن بس اس کے علاوہ تو کچھ بھی نہیں تھا جس پر وہاں موجود لوگ "Spiritual" ہو رہے تھے۔

کئی جاگن کئی جاگ نہ جانن
کئی جاگدیاں وی سُتے ہو
(کئی لوگ جاگتے جاگتے لٹ گئے اور کئی سوتے کی حالت میں بھی پا گئے۔)
کیاں نوں رب ستیاں ملیا
کئی جاگدے وی گئے مُٹھے ہو

گلوکار نے اگلا کلام شروع کیا اور قلبِ مومن نے نیہا کے کان میں سرگوشی کی۔ "چلیں؟"

اُس نے حیرانی سے مومن کو دیکھا اور کہا۔ "کہاں؟"

"تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے۔" اُس نے مسکراتے ہوئے نیہا کے کان میں ایک اور سرگوشی کی۔ اُس نے جواباً بے حد تجسس کے عالم میں مومن کا چہرہ دیکھا جس پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ مزید کچھ کہے بغیر نیہا وہاں سے اُٹھ کر اُس کے ساتھ باہر تو آ گئی لیکن وہ اب بھی ایک عجیب سی کیفیت میں تھی۔ اُن کی گاڑی گاڑیوں کی لمبی قطار کے تقریباً آخری سرے پر تھی جو اُس گھر کے باہر سڑک کے کنارے کھڑی تھیں۔ جہاں وہ یہ محفل موسیقی اٹینڈ کرنے آئے تھے۔

"کمال ہی کر دیا۔ مجھے لگ رہا ہے میں صوفی ہو گئی ہوں۔" اُس کے ساتھ چلتے ہوئے نیہا نے اپنے عریاں بازوؤں کو عجیب سرمستی کے عالم میں سر سے اوپر بلند کرتے ہوئے ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت ایک سلیولیس بلاؤز اور لانگ اسکرٹ میں ملبوس تھی۔ وہ مختصر بلاؤز اُس کی کمر اور پیٹ کا تھوڑا سا حصہ دکھا رہا تھا۔ اُس سفید سلک کے بلاؤز اور سیاہ اسکرٹ میں وہ گلے میں بہت ساری لمبی اور چھوٹی زنجیریں اور پتھر پہنے ہوئے تھی۔ جنہوں نے اُس کے سینے کو تقریباً ڈھک دیا تھا۔ باہر چلتی تیز ہوا اُس کے کٹے ہوئے بالوں اور لٹکے ہوئے اسکرٹ کو بار بار اُٹھا رہی تھی اور نیہا دونوں سے بے پروا تھی۔ نہ وہ بالوں کو اُڑ کر اپنے چہرے اور ماتھے پر آجانے سے روک رہی تھی نہ اپنی لمبی خوب صورت ٹانگوں سے بار بار ہوا سے اُٹھنے والے اسکرٹ کو۔ انگلیوں میں دبے سگریٹ کا آخری کش لیتے ہوئے اُس نے گلوکار کے بول گنگناتے ہوئے سگریٹ پھینکا۔

"...ن! میں صوفی ہو گئی ہوں۔" اُس کے ساتھ چلتے ہوئے مومن نے اُس کے پہلے جملے پر کوئی تبصرہ نہیں ...ا، اور نیہا نے جیسے اُس کی توجہ کے لیے دوبارہ وہ جملہ دہرایا۔

"وہ تو تم ہر بار ایسی کسی محفل کو اٹینڈ کرنے کے بعد چند گھنٹوں کے لیے ہو جاتی ہو۔ اس لیے پریشان مت ... چند گھنٹوں کے بعد ٹھیک ہو جاؤ گی تم۔" ساتھ چلتے ہوئے مومن نے اپنے ٹراؤزر کی جیب سے گاڑی کی چابی ...التے ہوئے اُسے جیسے تسلی دی۔

"نہیں یار...... آج کچھ اور ہی کیفیت ہو گئی ہے میری۔" نیہا نے جیسے اُسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ وہ ...متاثر نہیں ہوا۔

"اچھا گڈ فار یو۔" اُس نے ساتھ چلتے ہوئے اسی انداز میں اُس کو کہا۔

"تم یہ قوالی اپنی فلم میں ڈالو نا۔" نیہا نے یک دم گلوکار کی سب سے پہلی قوالی کے بول دہراتے ہوئے مومن سے کہا۔

وہ اُس کی بات پر بے اختیار ہنسا۔ "میری فلم میں قوالی کا کیا کام؟"

"یار Spirituality آئے گی۔" نیہا نے جیسے دلیل دی۔

"یعنی میری فلم کا شو دیکھتے ہی آڈینس سینما میں مسجد ڈھونڈنا شروع کر دے گی۔" اُس نے مذاق اڑانے والے انداز میں نیہا سے کہا۔

"تم سے باتوں میں نہیں جیت سکتی میں...... سجیشن (مشورہ) دے رہی تھی میں...... بالی ووڈ کی فلمز میں نہیں دیکھا۔ ہر فلم میں قوالی ڈالتا ہے سلمان خان اور ہر فلم سپرہٹ۔"

نیہا نے جیسے اُسے قائل کرنے کی کوشش کی۔ وہ سڑک پر اب بھی وہی بول گانے اور لہرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بازو پھیلا پھیلا کر...... وہاں کھڑی گاڑیوں کے ڈرائیورز کی خود پر مرکوز تعاقب کرتی ہوئی نظروں سے بے خبر۔

"قوالی کے بغیر بھی سپرہٹ ہوتی ہے میری فلم۔" مومن کو اس وقت سلمان خان کا حوالہ برا لگا۔

"اُس کی فلم سو کروڑ کرتی ہے۔" نیہا واقعی کسی اور کیفیت میں تھی ورنہ سلمان خان کے لیے اس کے ساتھ بحث نہ کرتی جو مومن کا ناپسندیدہ ترین اداکار تھا۔

"وہ spirituality اور قوالی سے سو کروڑ نہیں بناتا۔ آئٹم نمبر سے بناتا ہے۔" اپنی گاڑی کا لاک دور سے ہی کھولتے ہوئے اُس نے نیہا کو جواب دیا۔ اُس کی گاڑی نے دور ہی سے لائٹس جھپکا کر جیسے اُس کا استقبال کیا تھا۔

"جو بھی ہے لیکن تم میری حالت نہیں دیکھ رہے۔ کبھی اس حالت میں دیکھا ہے تم نے مجھے۔ یہ spirituality نہیں تو کیا ہے۔" نیہا نے اُس کی بات کا بُرا مانا۔

"یہ اُن چرس والے سگریٹوں کا اثر ہے جو تم بار بار ٹیرس پر جا کر پی کر آ رہی تھیں...... spirituality نہیں ہے یہ۔" وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے تم کو بڑا پتا ہے spirituality کا اور بائے داوے میں نے صرف دو ...ٹ پیے تھے...... دو سے مجھے کچھ نہیں ہوتا۔" نیہا نے بھی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اُسے جواب دیا اور ساتھ ہی ...ہ یاد آیا۔ "تم نے صوفی کا نخرا دیکھا؟"

...ن گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بے اختیار ہنسا۔ "تم صُوفی سے صوفی پر آگئیں۔ اتنی جلدی؟"

"بلا مت...... کیا پہن کے آئی ہوئی تھی وہ اور ظاہر یوں کر رہی تھی جیسے پتا نہیں کون سے سیارے کی

ڈیزائنر ہو۔" نیہا کا دماغ واقعی اب اُس صوفیانہ کلام سے سیکنڈز میں اُس ڈیزائنر پر آ گیا تھا جو اُس کی حریف تھی۔
"مجھے اس کے ڈریسز پسند ہیں اس کا سینس آف اسٹائل امیزنگ ہے۔" مومن نے جواباً کہا۔ وہ ایسا ہی تھا، نیہا اُس کی گرل فرینڈ تھی مگر مومن کو جو چیز اچھی لگتی تھی، وہ اُس کے بارے میں کھلے دل سے تبصرہ کرتا تھا۔
"وہ رڈی کولس (مضحکہ خیز) لگ رہی تھی ان کپڑوں میں۔ نہ ہونے کے برابر کپڑے پہنے ہوئے تھے اس نے تاکہ سب مرد اُسے دیکھیں...... چیپ حرکت۔" نیہا کے لہجے میں عجیب طرح کی مڈل کلاس جیلسی گونجی تھی۔
"اگر یہ اسٹریٹیجی تھی تو اس کی اسٹریٹیجی بالکل ٹھیک تھی کیوں کہ سب مرد واقعی اُسے ہی دیکھ رہے تھے 'میں بھی۔ وہ ہاٹ لگ رہی تھی۔" مومن نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اُسے تپایا۔ وہ جانتا تھا نیہا صوفی کو پسند نہیں کرتی۔
"مومن......!" نیہا نے جیسے اُسے خبردار کیا۔
"مجھ سے اگلی فلم میں وارڈ روب ڈیزائن کرنے کی بات کر رہی تھی۔" مومن نے اُس کی للکار کے جواب میں کہا۔ نیہا کو جیسے آگ لگ گئی۔
"اس کی اتنی ہمت۔"
"یار پروفیشنل ہے۔ موقع دیکھ رہی ہے وہ میرے ساتھ کام کر کے۔" مومن نے جیسے اُس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔
"تم اس کے ساتھ کام نہیں کرو گے۔ میں ہی تمہاری اگلی فلم کی وارڈ روب بھی کروں گی...... سنا تم نے۔" وہ ہنسا۔
"سن لیا یار! کر لینا۔ اب غصہ ختم کرو...... تم وہ صوفی ہونے اور Spirituality کی بات کر رہی تھیں...... وہ بتاؤ مجھے۔"
"مذاق مت اڑاؤ میرا۔" نیہا اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔ "وہ سرپرائز کیا تھا جو مجھے دینا چاہتے تھے۔" اُسے یک دم یاد آیا۔ مومن نے جواب دینے کے بجائے اپنی گاڑی سڑک کے کنارے سے سڑک پر لاتے ہوئے کہا۔
"میرے اپارٹمنٹ چلو پھر بتاتا ہوں تمہیں۔" نیہا نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ اسے اس "سرپرائز" کا بے حد انتظار تھا اور توقع بھی لیکن وہ یہ کنفرم کرنا چاہتی تھی، خوشی کے کسی اظہار کے بغیر کہ وہ خوش فہمی کا شکار نہیں ہو رہی۔
اس نے اپنے پینٹ ہاؤس کا دروازہ کی کارڈ سے کھولا اور نیہا کو لیے اندر آیا۔ اندر آتے ہی سب سے پہلے اس کی نظر لابی میں دیوار کے ساتھ پڑے کنسول پر رکھے ایک سفید لفافے پر پڑی۔ وہ یقیناً شکور نے کوریئر سے وصول کرنے کے بعد ہمیشہ کی طرح وہاں رکھا تھا جہاں اُس کی ڈاک وہ رکھتا تھا۔ نیہا اب بھی مسلسل صوفی کے حوالے سے کچھ بولتی جا رہی تھی مگر وہ اس لفافے پر نظر ڈالتے ہوئے چند لمحوں کے لیے اپنے ماحول سے غافل ہوا تھا۔
اُس کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہوئے نیہا رُکے بغیر اندر لاؤنج میں چلی گئی اور مومن سیدھا اُس کنسول کی طرف آیا۔ اُس نے لفافے کو اُٹھا کر دیکھا۔ موتیوں جیسی تحریر میں لفافے پر اُس کا نام لکھا ہوا تھا۔ اُسی انداز میں جس طرح ہمیشہ لکھا ہوتا تھا۔ اُس نے انگلیوں سے جیسے لکھنے والے کے لمس کو اپنے نام پر ہاتھ پھیر کر ڈھونڈا، محسوس کیا، پھر لفافے کو بغیر کھولے اُس نے کنسول کا دراز کھول کر اندر رکھ دیا۔ وہ دراز اُس جیسے بہت سے ان کھلے لفافوں سے بھرا ہوا تھا اور ان سب پر ایک ہی نام تھا۔ قلبِ مومن۔
نیہا ٹیرس پر میز کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی جب وہ وہاں آیا۔ ٹیرس پر رات کے اس پہر پورے شہر کی عمارتوں کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ دور سمندر میں ڈولتی کچھ بوٹس اور جہازوں کی بھی۔ نیہا کے ہاتھ میں ایک

...ن گلاس تھا جس میں وہ فریج سے کچھ پانی ڈال کر لائی تھی اور اب اس ٹیرس پر میز کے سامنے کرسی پر بیٹھی وہ ...ندر کی طرف گردن موڑے اُس پانی کو آہستہ آہستہ پینے میں مصروف تھی۔ ہوا اُس کے بالوں کو اُڑاتی اوپر لے ...جاتی۔ پھر نیچے لے آتی۔ سمندر کی لہروں کی طرح...... اور وہ مومن کے انتظار میں کسی خوب صورت پینٹنگ کی ...یلی لڑکی کی طرح ٹیرس پر لگی خوب صورت لائٹس سے نکلتی روشنی میں بیٹھی تھی۔ مومن کے آنے پر اُس نے گردن ...وڑ کر اُسے دیکھا۔ پھر مسکرائی اور گلاس واپس میز پر رکھ دیا۔
مومن اُس کے مقابل دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اس کے سامنے بورڈ پر فریم کے بغیر ایک پینٹنگ رکھی۔ نیہا بے ساختہ مایوس ہوئی، وہ یہ سرپرائز دیکھنے یہاں نہیں آئی تھی۔ مومن کبھی کبھار پینٹ کیا کرتا تھا اور اکثر اسے پینٹ کرتا تھا اور وہ پینٹنگ بھی اسی کی ہی تھی۔ وہیں ٹیرس پر اسی میز پر اسی طرح ہوا میں اڑتے بالوں اور شیمپین گلاس میں پانی پیتے ہوئے۔
"تمہارا فیورٹ پوز اور میری فیورٹ پینٹنگ۔" مومن نے جیسے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔ نیہا کو لگا وہ جیسے اُس سے داد چاہتا تھا۔
"اٹس بیوٹی فل۔" اس نے پینٹنگ پر غور کیے بغیر کہا۔ وہ ہمیشہ یہیں بیٹھتی تھی۔ اسی طرح پانی پیا کرتی تھی اور مومن نے اسے ماڈلنگ کے لیے بٹھائے بغیر اسے اسی طرح پینٹ کیا تھا۔
نیہا نے ایک نظر پینٹنگ پر ڈالتے ہوئے اپنا گلاس دوبارہ اٹھایا اور تب ہی اسے — میز پر رکھی اُس پینٹنگ میں اپنے ہاتھ کی انگلی میں ایک رنگ جگمگاتی نظر آئی۔ ایک لمحے کے لیے اسے شائبہ ہوا کہ وہ بھی پینٹ کی گئی تھی مگر غور سے دیکھنے پر اسے نظر آیا وہ پینٹنگ نہیں تھی، اصلی تھی۔ اس کے رگ و پے میں جیسے ایک کرنٹ دوڑا۔ اُس نے نظر اُٹھا کر مومن کو دیکھا، وہ مسکرا رہا تھا۔
تم۔" نیہا نے بے حد جوش کے عالم میں اُسے کچھ کہتے کہتے جملہ اُدھورا چھوڑا اور اُس پینٹنگ میں اپنی اُنگلی کے گرد نظر آنے والی رنگ کو اس جگہ سے نکالنے لگی جہاں وہ دھنسی ہوئی تھی۔
"مومن......!" نیہا کی آواز فرطِ جذبات سے بھر آئی تھی۔ وہ اس ڈائمنڈ رنگ کو اب بے حد جذباتی انداز میں اپنی انگلی اور انگوٹھے کی پوروں کے درمیان پکڑے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ مومن نے اس کے ہاتھ سے وہ انگوٹھی لے لی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی انگلی میں وہ رنگ پہنا دی۔
"دس از بیوٹی فل۔" نیہا نے اپنے ہاتھ میں پہنائی گئی اس رنگ کو دیکھتے ہوئے خوشی اور ایکسائٹمنٹ سے کہا۔
"تمہارے ہاتھ سے زیادہ نہیں۔" مومن نے بڑی آہستگی سے اپنے ہاتھ میں پکڑے اُس کے ہاتھ کو ہونٹوں سے چھوا اور پھر اُسے چھوڑ دیا۔
"آئی لو یو۔" نیہا نے کہا۔
"آئی لو یو ٹو۔" مومن نے جواباً کہا۔ نیہا اب اپنے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔ چمکتی آنکھوں کے ساتھ۔
"تمہارا ٹیسٹ ہر چیز میں لاجواب ہے۔" وہ اُس رنگ کو دیکھتے ہوئے مومن کو سراہے بغیر نہیں رہ سکی۔
"یعنی تم ان ڈائریکٹلی اپنی تعریف کر رہی ہو۔" مومن نے برجستہ کہا اور نیہا نے اس کے جملے پر کھلکھلا کر ...تے ہوئے اپنا ہاتھ دوبارہ میز پر دھرے مومن کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔
"میری تعریف کرنے کے لیے تم کافی ہو۔ یقین نہیں آ رہا۔ قلبِ مومن! تم مجھے پرپوز کر رہے ہو۔" نیہا ...وقت خود پر ضبط نہیں کر پا رہی تھی۔
"کیا اچھا لگا مجھ میں؟" اُس نے عجیب سی ادا کے ساتھ مومن سے پوچھا۔ یوں جیسے اپنی تعریف سننا چاہتی

ہو۔ مومن نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر دل کی جگہ پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ہمیں تم یہاں اچھی لگ گئیں۔'' وہ اُس کے جملے پر ہنسی اور پھر اس نے اپنی کنپٹی پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

''دل کو اچھی لگی اور دماغ کو؟''

''میں دماغ سے نہیں سوچتا۔ قلبِ مومن ہوں میں۔ دل ہی فیصلہ کرتا ہے ہر بات کا۔'' مومن نے عجیب بے نیازانہ انداز میں اس سے کہا۔

نیہا نے اپنی انگلیوں کے گرد جیسے کچھ لپیٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے اُس سے کہا۔ ''جب تم اس طرح بات کرتے ہو تو تم لڑکیوں کے دلوں کو اپنی انگلیوں کے گرد لپیٹ لیتے ہو قلبِ مومن۔'' وہ اُس کی بات پر مسکرایا۔

''جانتا ہوں لیکن قلبِ مومن تمہاری مٹھی میں ہے۔'' نیہا اُس کے اعتراف پر عجیب غرور سے مسکرائی پھر ہنس دی۔ اُس کی مسکراہٹ کمال تھی، اُس کی ہنسی جمال۔ اُس کے کانوں میں لٹکتے موتی ہلکورے لے رہے تھے اور اُس کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اپنی گہری سیاہ لمبی پلکوں والی آنکھوں کے ساتھ وہ قلبِ مومن کی آنکھوں اور دل میں بیک وقت کھبی تھی اور اُسے کسی کی یاد دلا گئی تھی۔

''تم حسنِ جہاں جیسی ہو۔'' اُس کے چہرے پر نظریں جمائے وہ جیسے کسی ٹرانس میں بولا تھا۔

وہ ہنسی ''حسنِ جہاں جیسی کیوں؟ حسنِ جہاں کیوں نہیں؟'' اُس نے عجیب غرور سے اُس حوالے کو سمجھے بغیر کہا جو قلبِ مومن کے اندر سے کہیں نکلا تھا۔

''حسنِ جہاں بس ایک ہی تھی۔'' قلبِ مومن نے نیہا کے گلاس کے کناروں پر اُس کی لپ اسٹک سے بنے ہونٹوں کے نشانوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

☆☆☆

''کتنا بڑا موقع تھا مومنہ سلطان! جو تم نے ضائع کیا ہے۔'' مومنہ نے ڈھیٹوں کی طرح اُس کی لعنت و ملامت سنی۔ وہ سیٹ پر اقصیٰ کو اُس سوپ کے لیے میک اپ کرتے دیکھ رہی تھی۔ وہ تیزی سے ہاتھ چلا رہی تھی۔ کیونکہ اُس کا سین شروع ہونے والا تھا اور مومنہ چپ چاپ بیٹھی اُسے دیکھ رہی تھی۔

''اب بولو بھی۔ منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر کیوں بیٹھ گئی ہو۔'' اُس نے بلش آن لگاتے لگاتے مومنہ کو مزید جھڑکا۔

''میں کریکٹر کی ڈیمانڈ پوری نہیں کر سکتی تھی نہ ہی ڈائریکٹر کی۔'' اُس نے بالآخر کہا۔ اقصیٰ نے ہاتھ میں پکڑا برش تقریباً پٹختے ہوئے اُس سے کہا۔

''اس لیے ساری عمر بہنوں اور سہیلیوں کے رول کرو گی اور پھر خالہ اور چچیوں کے۔ نام بنانے کے لیے ''سب'' کرنا پڑتا ہے مومنہ سلطان! اور ''سب'' ہی کر رہی ہیں...... سنا تم نے۔''

''سن لیا۔'' اُس نے بحث ختم کرنے کی کوشش کی۔

''سن لیا مگر سمجھنا مت۔ سیکھنا مت۔ کتنی منتیں کر کر کے میں نے داؤد سے تمہارا آڈیشن کروایا تھا اور تم وہاں لڑ کر آ گئیں۔ وہ بھی قلبِ مومن سے۔ کوئی عقل کا اندھا بھی ایسا نہ کرتا اور تم تو مجبور اور ضرورت مند تھیں مومنہ۔'' وہ جیسے اُسے یاد دلانے کی کوشش کر رہی تھی ۔ مومنہ نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔ یہ جملے تو اب اُس کے ماتھے پر لکھے رہتے تھے لیبل کی طرح۔ کوئی اُسے نہ بھی یاد کرواتا پھر بھی نظر آتا۔

''بدتمیزی اُس نے کی تھی مجھ سے۔ میں نے کیا کیا۔'' اُس نے جیسے خود اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

''وہ کر سکتا ہے۔ ڈائریکٹر ہے۔ سکہ چلتا ہے اس وقت انڈسٹری میں اُس کا، اُس کی فلم میں کاسٹ ہونے

... طواف کرتی ہیں اُس کا۔ وہ سیٹ پر گالیاں بھی دے تو بھی کوئی اُف نہیں کرتا اور تم اُسے کہہ کر ...'' اقصیٰ نے آخری لفظ یوں کہا جیسے وہ گناہ تھا جو مومنہ سے سرزد ہو گیا تھا۔

''...دماغ خراب ہو گیا تھا میرا۔'' مومنہ پچھتائی نہیں لیکن بڑبڑائی۔ اقصیٰ کو وہ صرف اسی طرح خاموش کر سکتی ...اُس کی یہ حکمت عملی بھی غلط ثابت ہوئی تھی۔

''اب پچھتانے کا فائدہ۔'' اُس نے فوراً کہا۔

''پچھتا نہیں رہی۔ مجھے اُس کے پاس جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ آئی ایم سوری۔'' اُس نے اپنی عزت اور انا ...اب کا مار دیا تھا مگر خودداری تھی جو پتا نہیں کیوں اب بھی زندہ رہ گئی تھی۔

''تمہاری وجہ سے اُس نے داؤد کو کتنا ذلیل کیا کہ کہاں سے اُٹھا لائے ہو لڑکیاں آڈیشن کے لیے جن کا نہ ...ئی خاندان ہے نہ کلاس نہ گرومنگ۔'' اقصیٰ کو داؤد کی بے عزتی کا صدمہ نہیں بھول رہا تھا۔

''جس کا خاندان اور کلاس ہے، وہ کیا کر رہا ہے۔'' مومنہ اُس کے جملے پر تپ گئی۔ اقصیٰ نے ملامتی نظروں ...اُسے دیکھا۔

''گھنٹے سے سر کھپا رہی ہوں اور پھر وہی بات...... ٹھیک کہہ رہی تھیں تم کہ...... تمہیں اُس کے پاس جانا ہی ...نہیں چاہیے تھا۔ داؤد نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ فلم ہے فلم...... سوپ اور سیریل سمجھ کر مت آنا اس میں کام ...نے۔'' اقصیٰ کا میک اپ اب ختم ہو چکا تھا اور وہ تیار تھی۔

''میرا مسئلہ اس وقت صرف پیسہ ہے۔ مومن کی فلم بھی صرف پیسے کے لیے ہی کرنا چاہتی تھی ورنہ متاثر نہیں ...وں اُس سے میں۔'' وہ کہے بغیر رہ نہیں سکی۔

''پیسہ چاہیے تھا جہانگیر کے لیے اسی لیے داؤد اور میں نے کوشش کی تھی کہ یہ فلم مل جائے تمہیں مگر تم نے کل ...لو پچھتاؤ گی کہ موقع ملا تھا اور تم نے ضائع کر دیا۔'' مومنہ اُس کے جملے پر جھاگ کی طرح بیٹھی تھی۔

''کیا کروں، معافی مانگ لوں؟'' وہ بے اختیار اُلجھی اور اقصیٰ بے یقینی سے اُس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''وہ ''مومن'' ہے۔ کینہ رکھتا ہے۔ بدلہ لیتا ہے معاف نہیں کرتا...... اور وہ بھی اب......''

''مجھے جانا ہے اقصیٰ! ابا انتظار کر رہے ہیں ہاسپٹل میں۔ جہانگیر کا ڈائیلاسس ہے آج۔ تم سے کچھ پیسے ...ہیے تھے۔'' اُس نے اقصیٰ کی بات کاٹی اور اُس سے اپنا مسئلہ کہا۔ آخری جملہ ہمیشہ کی طرح نظریں ملائے ...بغیر۔ قرض مانگنے والا کیا نظر ملاتا، کیا نظر اُٹھاتا۔

''گھنٹہ بک بک سنی میری...... سیدھا نہیں کہہ سکتی تھیں پہلے ہی۔'' اقصیٰ نے اپنا پرس کھولتے ہوئے اُسے ...ٹا۔ وہ اُس کی ہر ڈانٹ ہر جھڑکی سن سکتی تھی۔ وہ اس بھری دُنیا میں خاندان کے باہر اُس کا خاندان تھی۔ جس ...وہ سب کہہ لیتی تھی، سب مانگ لیتی تھی اور جس کے سامنے وہ ''رو'' لیتی تھی...... پتہ نہیں اُدھار کا وہ کون ...احسان تھا جو دوستی کے کاروبار میں چلتا ہے۔ ہندسوں میں کوئی لین دین رکھا ہی نہیں جاتا اُن میں۔ سب ...ان کی زبان میں درج ہوتا ہے۔ قدر کی زبان میں وصول ہوتا ہے۔

اقصیٰ مومنہ سلطان کی غم گسار، غم خوار تھی اُس پر جان چھڑکنے والی دوست اور وہ مومنہ سلطان حیران ہوتی ...وہ کس صلے کی توقع میں اُس کے ساتھ تھی۔ وہ بھی اُس کی طرح سائیڈ رولز کرتی تھی۔ کالج میں اُس کی ...فیلو بھی رہی تھی۔ اُس کی زندگی کے مسائل مومنہ سلطان جیسے نہیں تھے۔ کم تھے اور اُس کی زندگی میں ایک ...ن تھا جو مومنہ سلطان کی زندگی میں نہیں تھا۔

...دونوں انگیجڈ تھے اور دونوں اپنی شادی کے لیے پیسے جمع کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ داؤد قلبِ مومن ..

کا اسسٹنٹ تھا اور کالج میں اُن کی چوکور کا تیسرا کونا۔ اقصیٰ اسکول کے زمانے سے ایکٹنگ کر رہی تھی کیونکہ اسے اپنے باپ کی وفات کے بعد اپنے تین چھوٹے بھائیوں کو پڑھانا اور ماں کا سہارا بننا تھا اور داؤد اپنی بہن اور بہنوئی کے گھر میں بچپن سے اپنے ماں باپ کی وفات کے بعد سے رہتا تھا اور اُن کے ساتھ تیسری مومنہ سلطان تھی جسے اس دوستی کے آغاز میں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

وہ انٹر میں آرٹ پڑھنے آئی تھی۔ جہانگیر چائلڈ اسٹار کے طور پر بہت اچھا کما رہا تھا اور سلطان اور ثریا کو بھی تھوڑا بہت کام ملتا رہتا تھا۔ زندگی تب مومنہ سلطان کے لیے اچھی تھی اور زیادہ اچھی چوکور کے اُس چوتھے کونے کی وجہ سے ہوئی تھی جس کا نام فیصل تھا۔

مگر پھر سب کچھ بدل گیا تھا اور جو کچھ بھی بدلا، وہ صرف مومنہ سلطان کے لیے بدلا تھا۔ اقصیٰ اور داؤد کی زندگی کے مسئلے تو شروع ہی سے ویسے ہی تھے۔ وہ نہ بڑھتے تھے نہ کم ہوتے تھے لیکن مومنہ کی زندگی میں جہانگیر کی بیماری تباہی کی طرح آئی تھی اور فیصل اُس کی زندگی کا وہ نخلستان تھا جہاں بسنے کے خواب مومنہ دیکھتی رہی تھی۔ نخلستان نخلستان ہی رہا تھا لیکن بس اس کے لیے صحرا میں سراب کی طرح ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اُس نے برآمدے میں کھڑے سلطان کو دور ہی سے دیکھ لیا۔ سلطان نے بھی بالکل اُسی وقت اُسے دیکھا۔ مومنہ کو وہ کچھ مضطرب سا لگا۔ لنگڑاتا ہوا وہ مومنہ کی طرف بڑھا اور اُس نے کہا۔

''کب سے انتظار کر رہا ہوں تمہارا مومنہ...... ڈاکٹر بھی چلا گیا۔'' سلطان نے اُس کے قریب آتے ہی کہا۔

''چلا گیا لیکن آپ نے تو بات کرنی تھی گردہ لینے کی۔'' مومنہ نے کہا۔

''ہاں کی ہے میں نے بات۔ وہ کہہ رہا تھا، پیسے لے آؤ تو مل جائے گا گردہ۔ میچنگ بھی ہو جائے گی پر بغیر پیسوں کے بار بار گردہ لینے کی بات نہ کروں میں۔'' مومنہ کو پتا تھا، ڈاکٹر کے انداز میں کیسی بے زاری ہو گی۔ وہ ہر بار جہانگیر کا ڈائیلاسس کروانے آتے تو اسی طرح کی گفتگو ہوتی تھی اُن کے درمیان۔

''کتنے پیسے لگیں گے گردہ ٹرانسپلانٹ ہونے پر؟''

(یوں جیسے وہ گولڈ کا ریٹ تھا جو ہر ہفتے بدل جاتا تھا۔)

''پانچ، چھ لاکھ۔'' وہ ڈاکٹر رٹے رٹائے انداز میں جواب دیتا۔

''میچ تو ہو جائے گا نا۔'' سلطان پوچھتا۔ (یوں جیسے وہ کپڑے کا وہ تھان کھلوا کر دیکھ رہا ہو جسے خریدنے کی ہمت نہ ہو رہی ہو۔)

''پیسے ہوں تو سب میچ ہو جاتا ہے یہاں خالی خولی باتوں کا کیا فائدہ۔'' ڈاکٹر جواباً اُن سے کہتا۔

''کوئی نقصان تو نہیں ہو گا نا جہانگیر کو نئے گردے سے۔'' سلطان کو تشویش ہوتی۔

(یوں جیسے پہلے پرانے گردے کے ساتھ جہانگیر جنت میں جی رہا تھا۔)

''اُس کا نصیب۔'' ڈاکٹر جواب دیتا اور سلطان کے سارے سوال ختم ہو جاتے اور اس ساری گفتگو کے دوران مومنہ خاموش تماشائی کی طرح کھڑی رہتی۔ ڈاکٹر اُس سے کچھ بے تکلفی دکھاتا۔ کچھ فلرٹ کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ جانتا تھا وہ اداکارہ تھی جس کا مطلب معاشرے کے ہر شخص کی طرح وہ بھی یہی لیتا تھا کہ وہ آسانی سے ''دستیاب'' تھی اور کردار پر سوالیہ نشان بھی لیے ہوئے تھی۔

مومنہ ڈاکٹر کی ''ان'' نظروں کو نظر انداز کرتی۔ مسکراتے ہوئے اُس کی ذومعنی باتوں کو سنی ان سنی کر کے ڈھٹائی سے ہنستی اور ڈاکٹر کے اس خیال کی تصدیق کرتی کہ ہر اداکارہ کریکٹر لیس ہوتی ہے...... آسانی سے

...یاب ہونے والی بدکردار عورتیں۔

اور مومنہ سلطان اُس ہراسمنٹ کو نظر انداز کرنے پر مجبور تھی اور اُس کے ساتھ ساتھ سلطان بھی۔ اُس ہاسپٹل میں اُس ڈاکٹر کے طفیل جہانگیر کو زندگی کی بوندیں مل رہی تھیں۔ قطرہ قطرہ تو اُس کے سامنے مومنہ ...لان حیا اور شرافت کا ڈھنڈورا کیا پیٹتی۔ وہ اُس کے بھائی کا مسیحا تھا اُس کی جان بھی لے لیتا تو وہ دے دیتی۔ ...معمولی سی ذلت تھی جو وہ کسی بس اسٹاپ پر کھڑے کسی لوفر لفنگے کے ہاتھوں بھی برداشت کر لیتی تھی۔ یہ تو پھر اُس کے بھائی کا علاج کرنے والا ''کوالیفائیڈ'' ڈاکٹر تھا۔

''جہانگیر کا ڈائیلاسس ہو گیا؟'' اُس نے سلطان کے چہرے پر جیسے کوئی اچھی خبر ڈھونڈنا چاہی۔

''ابھی ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر نے کچھ اور ٹیسٹ دیے ہیں۔'' سلطان نے کچھ کاغذ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ مومنہ نے کچھ کہے بغیر وہ کاغذ لے لیے۔ سلطان اندر چلا گیا۔ مومنہ وہیں کوریڈور میں پڑی ایک بنچ پر ایک بوڑھی عورت کے برابر بیٹھ گئی جو تسبیح پڑھ رہی تھی۔

''ڈائیلاسس ہے کسی کا؟'' مومنہ کے بیٹھتے ہی اُس نے پوچھا۔

''ہاں......'' مومنہ نے مدھم آواز میں کہا۔ اُن کاغذات پر لکھے ٹیسٹوں کا مطلب تھا مزید قرض اور مومنہ کو سوچنا تھا کہ فوری قرض وہ اب اور کس سے لے سکتی تھی۔

''کس کا؟'' عورت نے اُس کی عدم دلچسپی کی پروا کیے بغیر اُس سے پوچھا۔

''بھائی کا۔'' اُس نے پھر مختصر جواب دیا۔

''جوان ہے؟'' عورت نے تسبیح کے دانے گھماتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' اس بار چند لمحے خاموشی رہی۔ مومنہ نے سکون کا سانس لیا۔ اُن سوالوں کے رُکنے پر۔

''میرا بھی بیٹا ہے ڈائیلاسس پر۔ پہلے بڑے والے کا گردہ فیل ہوا پچھلے سال۔ اب چھوٹے والے کا۔'' مومنہ نے بے اختیار سر اُٹھا کر اُس عورت کو دیکھا۔ جہاں وہ بیٹھے تھے وہاں سب کی ایسی ہی کہانیاں تھیں لیکن وہ پھر بھی اُس عورت کے لیے دُکھی ہوئی تھی۔

''تو بڑا والا......؟'' مومنہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا سوال کرے اُس کے بڑے بیٹے کے بارے میں...... ...ان اُس عورت نے جیسے اُس کا سوال بھانپ لیا۔

''اُسی کے لیے تسبیح کر رہی ہوں۔ آج برسی ہے اُس کی۔ بس اب دُعا کرنا کہ چھوٹا والا بچ جائے۔ ایک ہی ...وہ گیا ہے ناں۔'' کسی نے جیسے مومنہ کی پسلی میں کچھ دے مارا۔ سانس ہی نہیں لی گئی اُس سے۔ اُس کا بھی تو ایک ...بھائی تھا اور وہ اُس کے لیے اس عورت کی طرح تسبیحات نہیں پڑھنا چاہتی تھی۔ کاغذ پر لکھے ہوئے سارے ...کے الفاظ اب آپس میں گڈمڈ ہونے لگے تھے۔ دن میں کہی ہوئی اقصیٰ کی بات اُسے ایک بار پھر یاد آئی۔

''کیسا موقع گنوایا تم نے مومنہ! زندگی بھر پچھتاؤ گی تم۔'' اُس کا دل چاہا، وہ وہاں سے اُٹھے اور بھاگنا ...کر دے۔ بھاگتی جائے، بھاگتی جائے۔ یہاں تک کہ سب کچھ کہیں بہت پیچھے رہ جائے۔

''تم کہاں جا رہی ہو بیٹا؟'' اُس بوڑھی عورت نے یک دم پوچھا۔ اُس نے ہاتھ سے دور سلطان کی طرف ...

''...آ رہے ہیں شاید میرے بھائی کا ڈائیلاسس ختم ہو گیا۔'' سلطان کی چال میں لنگڑاہٹ اُس ہاسپٹل ...بڑھ جاتی تھی۔ پاؤں میں پائے جانے والے جس نقص کو اُس نے زندگی میں کبھی گردانا نہیں تھا۔ ...میں آ کر خواہ مخواہ ہی اُسے لنگڑے کا لیبل دے رہا تھا حالانکہ یہ اُس کی ٹانگ کا لنگ نہیں تھا، اُس

کے بیٹے کی بیماری کا بوجھ تھا جو اُسے دو پیروں پر متوازن ہو کر چلنے نہیں دیتا تھا۔ پر اُس نقص کے ساتھ اُس عمر میں بھی وہ جہانگیر کے ساتھ ہسپتالوں میں دوڑا دوڑا پھرتا تھا۔

مومنہ کھڑی باپ کو دیکھتی رہی جو اُس کے قریب پہنچنے سے پہلے پہلے اپنے سارے آنسو پونچھ لینا چاہتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اور مومنہ...... وہ رونا چاہتی ہی نہیں تھی۔ اُسے لڑنا تھا۔ جہانگیر کی زندگی کے لیے......

☆☆☆

ایک بہت بڑے کینوس پر ایک بوڑھا ہاتھ ایک آیت لکھ رہا تھا اُسی دودھیا روشنی میں

فلا تغرنکم الحیوۃ الدنیا

(سورۃ فاطر 6)

فضا میں اُس آیت کو کوئی بے حد خوش الحانی سے پڑھ رہا ہے۔ وہ بوڑھا ہاتھ اس آیت کو مکمل کر لیتا ہے تو یک دم وہ خوب صورت، خوش لحن مردانہ آواز بھی بند ہو جاتی ہے جو اس آیت کی تلاوت کر رہی ہے۔ آسمان سے پڑنے والی روشنی اب اُس کینوس کے پار سفید لباس میں ملبوس ایک عورت کو رقصاں درویش کی طرح گول چکر کاٹتے ہوئے رقص کرتی ایک عورت پر پڑتی ہے جو ایک نقطے کے برابر نظر آ رہی ہے۔ تیز گھومتا ایک نقطہ اور پھر اُس نقطے کا سائز بڑھتا بڑھتا ایک عورت کے وجود میں ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ وہ اب اتنی تیز رفتاری سے گول چکر کاٹ رہی ہے کہ اُس پر نظر جمانا مشکل ہو گیا ہے اور پھر وہ رقص کرتا وجود آگ کے شعلے میں تبدیل ہو جاتا ہے یوں جیسے جل اُٹھا ہو اور پھر یک دم تاریکی چھا جاتی ہے۔

☆☆☆

مومن اپنے بستر سے ہڑبڑا کر اُٹھا۔ کمرہ نیم تاریک تھا اور اُس کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ ناہموار سانسوں اور کانپتے ہاتھوں سے اُس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ آن کیا۔ وہ خواب بڑے عرصے بعد اُس نے دیکھا تھا اور ہر بار کی طرح اس بار بھی اس خواب کو دیکھنے کے بعد وہ کانپتے ہوئے عجیب سی ہیبت کے عالم میں جاگا تھا۔ نہ وہ اُس بوڑھے ہاتھ کو پہچان پا رہا تھا نہ اُس جگہ کو، نہ اُس روشنی کو، نہ اُن آیات اور اُن کے مفہوم کو اور نہ ہی اُس درویشوں کے لباس میں رقص کرتی ہوئی عورت کو مگر اس کے باوجود وہ خواب بچپن سے جیسے اُس کے تعاقب میں رہتا تھا۔ ہر بار کینوس کی آیات بدلتی تھیں۔ پر وہ بوڑھا ہاتھ وہی رہتا تھا۔ ہر بار خواب میں رقص کرنے والا بدلتا تھا۔ کبھی وہ ایک مرد ہوتا تھا۔ کبھی وہ ایک عورت...... اور قلبِ مومن دونوں کے چہرے پہچاننے کی جستجو میں اُنہیں شعلوں میں تبدیل ہوتا غائب ہوتا دیکھتا رہتا تھا...... مگر ہر بار کچھ بھی نہ پہچاننے کے باوجود وہ جیسے یہ جان جاتا تھا کہ اُس نے اُس خواب میں کس کو دیکھا تھا۔ جیسے وہ اس رات جان گیا تھا۔

اُس کا سر اس وقت شدید درد سے پھٹ رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اُٹھ کر واش روم میں گیا تھا۔ چہرے پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے اُس نے جیسے اُس درد سے لڑنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ واپس کمرے میں آ کر اُس نے گلاس میں پانی ڈالا اور پھر سر درد کی دو گولیاں پھانکیں۔ جب تک اُس کا درد کم نہیں ہوتا، وہ دوبارہ سو نہیں سکتا تھا۔ رات کا پچھلا پہر تھا اور اُس کے کمرے کی شیشوں کی دیواروں سے کراچی کی روشنیاں رات کے اس پہر بھی نظر آ رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر گلاس وال کے سامنے کھڑا پچھلی رات کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے شہر کو دیکھتا رہا پھر اُس نے پلٹ کر اپنے کمرے کی الماری میں سے ایک پرانی البم نکالی اور البم لے کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

پہلا صفحہ پلٹتے ہی ایک بے حد خوب صورت لڑکی ایک چھ ماہ کے بچے کو گود میں لیے ہوئے تھی۔ اُس بلیک اینڈ وائٹ تصویر میں بھی اُس لڑکی کے تیکھے نقوش اور خوب صورت آنکھیں کسی کی نظر کو بھی اُلجھا سکتی تھیں۔ قلبِ مومن کی آنکھوں میں جیسے نمی آئی۔ اُس نے اگلا صفحہ پلٹا پھر اگلا۔ ہر تصویر میں وہ لڑکی اسی بچے کے ساتھ تھی پر اب وہ بچہ چھ ماہ کا نہیں تھا۔ وہ آہستہ آہستہ بڑا ہو رہا تھا اور پھر کئی صفحوں بعد وہ پہلی تصویر آئی۔ جو ایک بے حد خوبرو مرد کی تھی۔ کوئی قلبِ مومن کو دیکھتا اور اُس تصویر کو تو کوئی رشتہ جوڑے بغیر نہ رہ پاتا۔

قلبِ مومن نے اگلا صفحہ پلٹا۔ وہ اس البم کا آخری صفحہ تھا۔ جس پر اُسی لڑکی مرد اور بچے کی تصویر تھی۔ وہ اُن تینوں کی اکٹھے کھنچوائی گئی آخری تصویر تھی۔ جس میں اُس مرد اور عورت کے درمیان وہ سات سال کا بچہ کھڑا تھا۔ اُن دونوں کے ہاتھ پکڑے یوں جیسے زنجیر ہو مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا طلحہ عبدالعلی اور حسنِ جہاں کی اس خوب صورت داستان کا خاتمہ اُسی کڑی سے ہوا تھا جو اُن دونوں کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔ وہ قلبِ مومن تھا...... طلحہ عبدالعلی اور حسنِ جہاں کی اکلوتی اولاد۔

☆☆☆

”ندیم صاحب نے تو جہانگیر کو دیکھتے ہی کہا تھا کہ میں اس میں، ایک اور وحید مراد دیکھ رہا ہوں، یہ بچہ بڑا ہو کر ایک اور چاکلیٹ ہیرو بنے گا۔“

”مانتے ہی نہیں تھے کہ میرا بیٹا ہے۔ مذاق کرتے تھے کہ کہاں سے اُٹھا لائے ہو تم لوگ یہ نواب کی اولاد۔“ سلطان اپنی بات کہہ کر خود ہنسا اور اُس کے ہنسنے پر ثریا اور جہانگیر بھی۔ مومنہ اپنے لیے ٹرے میں کھانا لے کر اندر آئی اور ہزاروں بار سُنے ہوئے وہ جملے اُس نے ایک بار پھر سُنے۔ وہ ساری گفتگو ہر اُس رات ہوتی جب جہانگیر کا ڈائیلاسس ہوتا تھا۔ پتا نہیں ثریا اور سلطان جہانگیر کا حوصلہ بحال کرنا چاہتے تھے یا اپنا...... وہ اُن کی باتیں سنتے ہوئے کھانا لے کر کمرے میں آ کر بیٹھ گئی۔

اُس کمرے کی دیواروں پر سستی لکڑی کے لگے ریکس جہانگیر کے ایوارڈز، شیلڈز اور ٹرافیز سے بھرے پڑے تھے اور اُن میں کہیں وہ سونے کا پانی چڑھے ہوئے تاج بھی تھے جو وقتاً فوقتاً چائلڈ آرٹسٹ کے طور پر اُس کی رسم تاج پوشی کے دوران مختلف پریس کلبز اور ادبی تنظیمیں کیا کرتی تھیں۔ جہاں جہانگیر کے بچپن میں ثریا اور سلطان بڑے شوق سے جایا کرتے تھے اور وہ بھی۔ اُسے تالیاں بجانے کا بے انتہا شوق تھا جہانگیر کے لیے اور سیٹیاں بھی جو بجانا اُس نے سلطان سے سیکھا تھا اور پھر ہر تقریب کے بعد سب انعام یافتہ افراد کا گروپ فوٹو اور پھر جہانگیر اور لمّاں ابا کے ساتھ اُس کا فیملی فوٹو جسے فوٹو گرافرز اُس وقت سلطان اور ثریا کے اصرار پر کھینچتے تھے مگر بعد میں اخبار میں تصویر صرف جہانگیر ہی کی لگتی۔ وہ تینوں اُس میں سے حذف کر دیے جاتے۔ وہ پاکستان کا سب سے مہنگا چائلڈ آرٹسٹ رہا تھا۔ مہنگا اور ٹیلنٹڈ۔

مومنہ اُس کے کمرے میں بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے ہمیشہ دیواروں پر لگی اُن تصویروں کو دیکھتی رہتی جو اُن سپر اسٹارز کے ساتھ جہانگیر کی تھیں جن کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے زمانہ ترستا تھا۔

”لمّاں! جب میں ٹھیک ہو جاؤں گا تو پھر ایکٹنگ کروں گا۔“ اُس نے جہانگیر کو کہتے سُنا اور وہ نوالہ لینا بھول گئی۔

”ہاں...... ان شاء اللہ...... اور اس بار تو بیسٹ ایکٹر کا ایوارڈ لینا ہے میرے بیٹے نے۔“ ثریا نے جیسے اُس کے خواب کی پینگ بڑھائی۔ جہانگیر اور مومنہ کی نظریں ملیں۔ وہ مسکرا دی۔

”آپا کو تو جس دن سے فلم نہیں ملی، موڈ ہی آف ہو گیا ہے ان کا۔“ اُس نے مومنہ کو چھیڑا تھا۔ وہ جانتی تھی وہ چاہتا تھا وہ کچھ بولے۔

''تمہارا اور میرا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ دیکھو، اُس دیوار پر میرا ایک بھی ایوارڈ نہیں ہے۔ سارے ایوارڈز، ساری شیلڈز تمہاری ہیں۔'' مومنہ نے جیسے اُس ڈرامے میں اپنا رول پلے کرنا شروع کیا جو وہ سب مل کر جہانگیر کے لیے کرتے تھے۔

''ہاں یہ تو ہے لیکن تم بھی میری طرح چائلڈ آرٹسٹ بن جاتیں تو میرے جتنے نہیں لیکن کچھ نہ کچھ ایوارڈز تو جیت ہی لیتیں تم۔'' وہ جواباً اُس ڈرامے میں اپنا رول ادا کرنے لگا۔

''ارے اس کا بس چلے تو یہ تو آج بھی نہ کرے اداکاری۔ یہ کہاں قدر جانتی ہے ایکٹنگ کی۔ آرٹسٹ کی۔'' ثریا نے مداخلت کی۔ مومنہ خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔ سلطان کو حسنِ جہاں یاد آ گئی۔

''حسنِ جہاں قدر کیا کرتی تھی آرٹسٹوں کی۔'' مومنہ نے یک دم کھانے کی ٹرے اُٹھائی اور کمرے سے نکل گئی۔

''پتا نہیں ابا کو ہر بات پر حسنِ جہاں کیوں یاد آ جاتی ہے۔'' اُس نے جیسے چڑ کر سوچا۔

''اور اب گھنٹوں اُس کی مثالیں دیتے رہیں گے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے، ابا کو حسنِ جہاں سے محبت تھی، صرف کام نہیں کرتے تھے اُس کے ساتھ اور اماں...... اماں جہانگیر کے عشق میں مبتلا ہیں اور میں......؟ میں ان سب کے۔ ہم سب دائروں میں چل رہے ہیں۔ کوئی دائرہ کسی دوسرے دائرے سے ملتا ہی نہیں۔''

برآمدے کے تخت پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے اُس نے برآمدے کی کھلی کھڑکی سے نظر آتے جہانگیر، ثریا اور سلطان کی تکون کو دیکھا۔ وہاں جیسے اُس کی کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔ مگر مومنہ سلطان کو اس کی شکایت بھی نہیں تھی۔ جہانگیر اُن کے گھر کا ''ہیرو'' تھا اور فلم انڈسٹری صرف ہیرو کی پرستش کرتی ہے۔ اُس کے ماں باپ کا خواب تھا۔ اس فلم انڈسٹری میں ایک ''ہیرو'' اُن کے خاندان سے بھی ہوتا۔ مومنہ سلطان کے لیے انہوں نے کبھی ایسا خواب نہیں دیکھا تھا۔ اُسے ضرورت اور مجبوری اس میدان میں لے آئی تھی۔ جہاں کے کانٹے صرف عورت کے پیروں کو زخمی کرتے۔

☆☆☆

''آئینہ مجھ سے پیار کرتا ہے۔ میں تم سے اور تم کسی اور سے۔ تینوں پاگل ہیں اور تینوں خالی ہاتھ رہیں گے۔''

قلبِ مومن اپنے اسٹوڈیو میں رات کے اس پہر آڈیشنز کی فوٹیج دیکھنے میں مصروف تھا اور اسکرین پر اس وقت مومنہ سلطان کے اُس نامکمل آڈیشن کی فوٹیج چل رہی تھی۔ وہ غضب کی ایکٹریس تھی۔ کمال کا آئی کانٹیکٹ تھا اُس کا۔ کیمرہ اور کیمرے کے ذریعے دوسری طرف بیٹھی آڈینس کے ساتھ۔ اُس کے تاثرات بے حد جان دار تھے۔ ڈائیلاگ ڈیلیوری اور آواز قاتل۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار اُس کے آڈیشن کی فوٹیج پر آ رہا تھا۔ اس آڈیشن کی فوٹیج کو جیسے اُس کا گرتا دوپٹہ بھی خراب نہیں کر پایا تھا۔ اُس کا فٹ ورک بہترین تھا۔ وہ فریم میں تھی اور فریم میں ہی رہی تھی۔ اداکاری اُس کے لیے جیسے خالہ جی کا گھر تھا۔

اُس کے آڈیشن کو دیکھتے ہوئے قلبِ مومن کے ذہن میں اُس کے ساتھ ہونے والی پوری ملاقات گھومی۔ وہ اگر اتفاقاً اس فوٹیج کو نہ دیکھ لیتا تو شاید اس ملاقات کے بعد مومنہ سلطان اُسے بھی یاد تک بھی نہ رہتی مگر اس وقت وہ ہر دس پندرہ منٹ کے بعد نئی ایکٹریسز کے آڈیشن دیکھنے کے بعد دوبارہ اُس کے آڈیشن پر آ جاتا۔ اُن درجنوں اسٹائلش اور خوب صورتی اور گلیمر کے معیار پر ہر لحاظ سے پورا اُترنے والی لڑکیوں میں سے اُسے کوئی ایک ''اداکارہ'' نظر نہیں آئی تھی۔ فوٹیج کو آخری بار دیکھ کر اُس نے اُسے ڈیلیٹ کر دیا۔ یہ کام اُس نے داؤد کے

ذمہ لگایا تھا مگر داؤد شاید دانستہ طور پر اُسے یہی موازنہ اور مقابلہ دکھانا چاہتا تھا جو وہ اس وقت ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ کر رہا تھا مگر اس کے باوجود مومنہ کے لیے اُس کی فلم میں کوئی گنجائش پیدا نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

گہری نیند میں مومنہ کو یوں لگا تھا جیسے اس کی آنکھ کسی کھٹکے سے کھلی تھی۔ اس نے غنودگی کے عالم میں آنکھیں کھولے کمرے کو دیکھا۔ کمرے میں ثریا سو رہی تھی برابر کے بستر پر۔ وہ اپنی چادر اتارتے ہوئے بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے جہانگیر کے کمرے سے کچھ آوازیں آئی تھیں۔

اپنے کمرے سے نکل کر اس نے صحن میں چارپائی پر گہری نیند سوئے سلطان کو دیکھا پھر وہ جہانگیر کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ جاگا ہوا اپنے بستر پر بیٹھا تھا اور اس کا بستر اس کے ایوارڈز سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر مومنہ کو دیکھا۔ وہ بھی اسے دیکھتی رہی پھر پاس چلی آئی۔

''کیوں جاگ رہے ہو جہانگیر! کچھ چاہیے؟'' وہ کرسی پر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

''آپا! تم مجھے مرنے نہ دینا۔'' عجیب بے بسی کی کیفیت میں اس نے مومنہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب خوف تھا۔ ''تم مجھے بچا لینا۔'' وہ اس کے ہاتھ بھینچے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے جہانگیر کو لپٹا لیا۔

''نہیں مرنے دوں گی۔'' اس نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ وہ اس کے سینے میں منہ چھپائے ہوئے سسک رہا تھا اور اس کے بستر پر ہر طرف اس کا ''عروج'' پڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

''میں تمہیں سمجھ نہیں پائی مومنہ!'' اقصیٰ نے اسے ہونق ہو کر دیکھا۔ وہ صبح سویرے اس کے گھر پر تھی اور اس کی درخواست سن کر اقصیٰ کو لگا تھا، وہ پاگل ہو گئی ہے۔

''میں خود بھی اپنے آپ کو سمجھ نہیں پائی۔'' وہ چائے کا کپ گود میں رکھے اس کے بستر پر بیٹھی بڑبڑائی تھی۔

''تم مومن کو سمجھتی کیا ہو آخر؟ تم جاؤ گی اس کے پاس اور وہ تمہاری معذرت قبول کر کے رول دے دے گا تمہیں...... آل گڈ۔'' اقصیٰ نے جھنجھلاتے ہوئے اس سے کہا۔

''ایک کوشش کر لینے میں کوئی حرج تو نہیں؟'' مومنہ اپنی بات پر مصر تھی۔

''وہ تمہیں رول نہیں دے گا۔ میں تمہارے سامنے وہ باتیں دہرانا نہیں چاہتی جو اس نے تمہارے بارے میں داؤد سے کی تھیں۔ تم کیوں بے عزت ہونا چاہتی ہو؟''

''مجھے اس وقت شہرت اور پیسے کی ضرورت ہے اقصیٰ! عزت اب ترجیح نہیں رہی میری۔ تم ایک دفعہ داؤد سے کہو، مومن سے میری ملاقات کروا دے، ایک بار۔'' وہ منت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی اور اقصیٰ اس کے اس لہجے کے سامنے ٹکی نہیں رہ سکتی تھی۔

''تم چاہتی ہو، داؤد بے روزگار ہو جائے اور ہماری شادی پھر لٹک جائے تو ٹھیک ہے۔ دوستی کے نام پر یہ بھی سہی۔'' اس نے تن فن کرتے ہوئے فون اٹھا کر داؤد کا نمبر ملانا شروع کر دیا۔ مومنہ چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

قلبِ مومن کا پینٹ ہاؤس میوزک کی تیز آواز سے گونجتے ہوئے ٹیرس پر بنے ڈانس فلور پر تھرکتی اسپاٹ والی رنگین روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ وہ ویسی ہی معمول کی ایک پارٹی تھی جس کے لیے وہ پینٹ ہاؤس مشہور

تھا۔ ویٹرز ہارڈ اور سوفٹ ڈرنکس سرو کرتے ہوئے ٹیرس پر بنے اس بار میں آجا رہے تھے جو بوقت ضرورت اور بار بی کیو ایریا کے طور پر بھی استعمال ہو جاتا ہے۔ ایک ڈی جے مختلف انواع کا میوزک بجاتے ہوئے ماحول کو گرمائے ہوئے تھا اور ہر بدلتے میوزک کی بیٹ پر ڈانس فلور پر جوڑے تھرک رہے تھے۔ مہمانوں کی آمد و رفت جاری تھی اور وہاں موجود کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو ایک دوسرے سے واقف نہ ہو۔

پاکستانی ٹی وی، ماڈلنگ اور فلم انڈسٹری سے منسلک اپنی اپنی فیلڈ کے بہترین ناموں میں سے تھے اور وہ سب وہاں قلب مومن کی فلم کی کامیابی اور اس کے ایوارڈ کو سلیبریٹ کرنے آئے ہوئے تھے۔ شوبز کی فیلڈ سے منسلک کوئی ایسا بڑا اسٹار نہیں تھا جو اس وقت وہاں نہ ہوتا۔ قلب مومن کے دعوت نامے کو کوئی رد کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا اور اس کی نظروں اور گڈ بک میں رہنا اس وقت ہر ایکٹر اور ایکٹریس کی ضرورت تھی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اپنی کسی فلم میں مین لیڈ کو دوبارہ کاسٹ نہیں کرتا۔ وہ بہت سے بڑے برانڈز کی کمرشل فلمز بھی شوٹ کرتا تھا اور قلب مومن ان کمرشلز میں صرف ان ہی کو لیتا تھا جن کو وہ چاہتا تھا۔ برانڈز کے مطالبات کو وہ اکثر نظر انداز کرنے کا عادی تھا اور اس کا ہر کمرشل ٹی وی اور ڈیجیٹل اسکرین پر دھوم مچانے کی تاریخ رکھتا تھا۔ تو قلب مومن کے نخرے اگر برانڈز نہ اٹھاتے تو کیا کرتے اور ایکٹرز اس کے آگے پیچھے نہ پھرتے تو کیا کرتے۔

قلب مومن اس وقت داخلی دروازے کے قریب مہمانوں کے استقبال کے لیے نیہا کے ساتھ موجود تھا۔ نیہا وہاں پر بالکل ایک میزبان کا کردار ادا کر رہی تھی۔ قلب مومن کی گرل فرینڈ کے طور پر وہ شوبز کے حلقوں میں اب بڑی اچھی طرح متعارف ہو چکی تھی اور قلب مومن کی گرل فرینڈ کے لیبل کو اس نے ایک ڈیزائنر کے طور پر اپنے بزنس کو پھیلانے اور کلائنٹس کو بڑھانے کے لیے بہترین طریقہ سے استعمال کیا تھا۔ اس کے پاس آنے والوں میں اب انڈسٹری کی ہر بڑی ایکٹریس اور ماڈل شامل تھی جو اس کے ذریعہ قلب مومن تک رسائی پانے کے متمنی تھے۔ نیہا بڑی چالاکی اور ذہانت سے ان کی اس خواہش کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کر رہی تھی۔ شوبز جیسا بزنس کوئی اور نہیں ہوتا۔

اس سارے ہنگامے میں لاؤنج میں لگی ہوئی وہ خطاطی کسی عینی شاہد کی طرح اس دیوار پر اشارہ تھی جس کے نیچے پڑے صوفوں پر نیم برہنہ ماڈلز اور ایکٹریسز مشروب کے گلاسز ہاتھ میں لیے مخمور بیٹھی ہوئی تھیں یا پھر چل پھر رہی تھیں۔

''مومن! یہ ضوفی ہے میں نے اسے انوائٹ کیا تھا، تم سے ملوانے کے لیے۔'' وہ لمبے قد کا کسرتی جسم رکھنے والا مناسب شکل وصورت کا ایک نوجوان لڑکا تھا جسے نیہا نے قلب مومن سے ملوایا تھا۔ قلب مومن نے کسی ردعمل کے بغیر اس کا استقبال کرتے ہوئے خوش دلی سے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''آپ سے پہلی بار ملاقات ہو رہی ہے۔'' ضوفی نے جواباً بے حد نروس انداز میں مومن سے کہا۔

''ہاں، لیکن میں آپ کا بہت بڑا فین ہوں۔'' اس نے بے حد گرم جوشی سے قلب مومن سے مصافحہ کیا۔ وہ جو اسکن ٹائٹ ٹی شرٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کی مختصر آستینیں اس کے Biceps کو، اس کا وی گلا اس کے سینے کے مسلز کو ڈسپلے پر رکھے ہوئے کسی شوپیس کی طرح دکھا رہا تھا۔

''تھینک یو۔'' مومن مسکرایا لیکن اس نے ضوفی میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ وہ کسی اور کی طرف متوجہ ہونے والا تھا جب نیہا نے ایک بار پھر اسے ضوفی ہی کی طرف متوجہ کیا۔

''ضوفی نے ابھی ابھی ماڈلنگ اور ایکٹنگ شروع کی ہے اور بہت بے تاب ہے وہ کسی فلم میں کام کرنے کے لیے۔'' مومن نے نیہا کی بات اب بھی دھیان سے نہیں سنی تھی۔ اس کی توجہ اپارٹمنٹ کے بار بار کھلنے والے

دروازے پر مبذول تھی جہاں سے چند چند منٹوں کے وقفے سے کوئی نہ کوئی مہمان نمودار ہو رہا تھا۔

نیہا اور ضوفی نے اس کی عدم توجہ بیک وقت نوٹس کی اور ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر نیہا نے جیسے کوشش نہ چھوڑتے ہوئے اس سے دوبارہ بات کا آغاز کیا تھا۔

''میں سوچ رہی تھی مومن! اگر تم اپنی فلم میں......''

''ایکسکیوز می ڈیر!'' اس سے پہلے کہ وہ بات مکمل کر پاتی، مومن کسی مہمان کو آتا دیکھ کر نیہا کی بات سنے بغیر اس کا بازو تھپکتے ہوئے چلا گیا۔ ضوفی اور نیہا دونوں کچھ نادم سے ہوئے تھے۔ ضوفی نے نیہا سے کہا۔

''میں نے کہا تھا نا، اس سے پہلے بات کر لینا۔'' اس کا لہجہ شکایتی تھا۔

''کر لوں گی یار! ٹینشن کیوں لے رہے ہو؟'' نیہا نے جواباً اس کا کندھا تھپکا۔ ''ابھی کچھ دیر میں دوبارہ بات کرتی ہوں اس سے۔ اسے ذرا مہمان ریسیو کر لینے دو۔'' وہ اسے لیے ہوئے ٹیرس کی طرف گئی۔

دور ایک جرنلسٹ کے ساتھ کھڑی شیلی نے تیکھی نظروں سے نیہا اور ضوفی کو دیکھا تھا۔ وہ جب سے آئی تھی اس کی نظروں کا مرکز نیہا اور مومن ہی رہے تھے۔

''You were like a goddes in this movies''

اس کے سامنے کھڑی ڈسک کی فیچر رائٹر اس کی تعریف کر رہی تھی۔ شیلی دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس نے اپنے بالوں کو تھپکا اور مسکرائی مگر اس کی نظریں اب پھر نیہا پر تھیں جو ضوفی کو ٹیرس پر چھوڑ کر واپس مومن کے ساتھ کھڑی مہمانوں کو ریسیو کر رہی تھی۔

''ان کا کچھ چل رہا ہے کیا؟'' اس جرنلسٹ نے شیلی کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے تجسس سے پوچھا۔ شیلی ایک دم گڑبڑائی اور ہنسی۔

''نہیں نہیں، مومن سنگل ہے۔'' شیلی نے کہا۔

''لیکن اس کا رویہ تو بالکل میزبان جیسا ہے۔'' جرنلسٹ نے اصرار کیا۔

''گرل فرینڈ ہے یار! اور وہ تو مومن کی کئی ہیں۔'' شیلی نے دوبارہ کہا۔

''میں نے تو خبر لگائی تھی کہ مومن اور تم ڈیٹنگ کر رہے ہو۔'' جرنلسٹ نے اس بار شیلی کو چھیڑا۔ وہ قہقہہ مار کر خوش دلی سے ہنسی۔

''اچھا۔ میں نے نہیں پڑھی۔''

''ایسا سین ہے کیا؟'' جرنلسٹ نے کریدا۔

''Keep Your Fingers Crossed''

شیلی نے معنی خیز انداز میں اس کو شہہ دی۔ نیوز میں اسٹار بننے کے لیے انڈسٹری کے Heart throb (دل کی دھڑکن) کے ساتھ کسی بھی حیثیت میں نتھی رہنا ضروری تھا اور شیلی ایسے تعلقات کی افادیت پر یقین رکھنے والوں میں سے تھی۔

ناز نے دور کھڑے قلب مومن کو بڑی حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ ایک ابھرتی ہوئی ماڈل تھی اور ایک بڑے ایوارڈ شو میں بیسٹ ماڈل کا ایوارڈ جیت چکی تھی۔ اس وقت وہ ایک مشہور فیشن ڈیزائنر کے ساتھ قلب مومن کی اس پارٹی میں آئی تھی اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس فیشن ڈیزائنر کو ڈمپ کر کے قلب مومن کے ساتھ جا کھڑی ہوتی جو چند لمحے پہلے ان دونوں کے ساتھ گپ شپ کر کے وہاں سے گیا تھا اور جس نے ناز کے نام نہاد لباس سے جھلکنے والے تمام اثاثہ جات پر کچھ زیادہ غور نہیں کیا تھا۔ ناز جانتی تھی وہاں موجود سب

...ئن۔ اسی ''ڈسپلے'' کے لیے آئی تھیں۔ قلب مومن اپنی فلموں میں گلیمر کے علاوہ کچھ پیش نہیں کرتا تھا اور وہاں ...''گلیمر'' کے سب تیر تلواروں سے لیس ہو کر آئی۔

''شیلی کے ساتھ کوئی چکر چل رہا ہے مومن کا؟'' ناز نے اس فیشن ڈیزائنر سے پوچھا جس کی ہمراہی میں وہ آئی تھی۔

''شیلی......ہاہاہا۔'' وہ فیشن ڈیزائنر استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

''شیلی مومن ٹائپ نہیں ہے۔'' اس نے دور مومن کا بازو پکڑے شیلی کو دیکھتے ہوئے ناز کو تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

''اور وہ جو دوسری لڑکی ہے۔'' ناز نے نیہا کو دیکھتے ہوئے کریدا۔ ''گرل فرینڈ ہے مومن کی......اب دیکھو اسے کب ڈمپ کرتا ہے......تم انٹرسٹڈ ہو رہی ہو کیا؟'' اس ڈیزائنر کو یک دم خیال آیا۔

''صرف فلم میں۔'' ناز نے گڑبڑا کر کہا۔ ''اس کے کیریئر کو یہاں تک پہنچانے میں اس ڈیزائنر کا بہت بڑا ہاتھ تھا اور ناز کو اچانک خیال آیا کہ اسے یہ ساری معلومات اس ڈیزائنر سے نہیں لینی چاہیے تھیں۔

''مومن میں Loyalty (وفاداری) نہیں ہے۔'' اس ڈیزائنر نے جیسے ناز کے انکار کے باوجود اسے خبردار کیا۔

''ڈمپ تو سب ہی کر دیتے ہیں یہاں کام نکلنے کے بعد لیکن مومن......'' ڈیزائنر نے بے حد معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے ایک جتانے والی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے گلاس سے سپ لیا۔

''میں تمہارے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔'' ناز کو اس فیشن ڈیزائنر سے اظہار محبت ...ش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، ان کا تعلق اتنا ہی ''خالص'' تھا۔

اور قلب مومن کے بارے میں ایسے سوال و جواب کرنے والی ناز تنہا نہیں تھی اس پارٹی میں۔ وہاں موجود ہر لڑکی اپنے آپ کو جیسے قلب مومن کی بھینٹ چڑھا دینے کے لیے تیار پھر رہی تھی۔ یہ محبت نہیں تھی، بزنس تھا۔ شوبزنس......قلب مومن کا ساتھ ان میں سے کسی کو بھی آسمان پر پہنچا دیتا، ان تین ہیروئنز کی طرح جن کی زندگیاں قلب مومن کی فلموں نے بدلی تھیں......اور آسمان کس کو اچھا نہیں لگتا۔ قلب مومن اس سب سے باخبر تھا۔ اپنی اہمیت سے، اپنی ضرورت سے، اپنے اسٹارڈم سے۔ ہر چیز سے۔ وہ پھندوں میں پھنسنے والا نہیں تھا۔ ...ام میں آ جانے والا صیاد نہیں تھا، نہ چال میں قابو آتا تھا۔

''جان! یہ میں تم سے ملوا رہی تھی ضوفی کو۔'' نیہا تیسری بار ضوفی کو مومن کے پاس لے کر آئی تھی اور یہ پہلا ...وقع تھا جب مومن نے ضوفی پر بالآخر غور کیا تھا۔ وہ اسے اس طرح بار بار اس کے پاس کیوں لا رہی تھی۔ ...ٹے موٹے ریفرنسز چلتے رہتے تھے لیکن اتنی شدت اور بے تابی سے تو کبھی نیہا نے کسی کو اس سے ملوانے کی ...شش نہیں کی تھی، مومن کو پہلی بار خیال آیا تھا۔

''ضوفی کی خواہش ہے تمہارے ساتھ کام کرنے کی۔'' وہ اب اس سے کہہ رہی تھی۔

''خواہش نہیں خواب ہے سر! آپ میرا آئیڈیل ہیں، آپ کی کامیابی پر مجھے رشک آتا ہے۔ آپ کے ...کا مجھ سے بڑا فین کوئی نہیں ہے پاکستان میں۔'' ضوفی نے اس کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا ...کیے۔ مومن نے اسے درمیان میں ہی ٹوکا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دوسرے ہاتھ میں پکڑے ...سے ٹیرس اور لاؤنج میں موجود لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''تمہیں پتا ہے یہ سب کون ہیں؟'' ضوفی الجھا۔ اس نے نیہا کو دیکھا۔ نیہا کو لگا، مومن کچھ نشے میں ہے۔

"یہ سب اسٹارز ہیں۔" ضوفی نے کچھ اٹک کر کہا۔

مومن مسکرایا۔ "نہیں، یہ سب میرے فینز ہیں اور پاکستان میں ان سے بڑھ کر میرا مداح کوئی نہیں۔ یہ سب میرے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں، یہ خواب ہے ان سب کا۔" وہ ضوفی کے جملے دہرا رہا تھا۔ ضوفی کو عجیب ہتک محسوس ہوئی۔

"تو یار! دو نا اسے فلم میں چانس۔" نیہا نے جیسے صورت حال سنبھالی۔

"کیسا چانس؟" مومن نے جواباً بے حد سپاٹ لہجے میں اس سے پوچھا۔

"اپنی فلم کے لیے آڈیشن کرواس کا...... تم خود متاثر ہو جاؤ گے ضوفی کی اسکرین پریزینٹیشن اور ٹیلنٹ سے۔" نیہا نے ملائم لہجے میں کہا۔

"I Don't think so (میں ایسا نہیں سمجھتا)۔" مومن نے سر سے پاؤں تک ضوفی کو دیکھنے کے بعد اسی اطمینان سے گلاس ایک سے دوسرے ہاتھ میں بدلتے ہوئے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ ضوفی اور نیہا کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ ضوفی نے بے حد اپ سیٹ ہو کر شکایتی نظروں سے نیہا کو دیکھا۔ اس نے ایک بار پھر اسے تھپکتے ہوئے تسلی دی تھی۔

"نشے میں ہے ابھی اس لیے اس طرح کی باتیں کر رہا ہے...... لیٹ ہم سو براپ۔"

"کیا خوب صورت شاہکار ہے آرٹ کا۔"

اس ڈیزائنر نے مومن کو روکتے ہوئے اس کیلی گرافی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ شاید پہلی بار مومن کی کسی پارٹی میں آیا تھا اور پہلی بار اس کیلی گرافی کو دیکھ رہا تھا۔

مومن اس کی تعریف پر مسکرایا اور اس نے کہا۔ "تھینک یو۔"

"سر! آرٹسٹ کون ہے؟" اس ڈیزائنر نے مزید پوچھا۔ چند اور لوگ بھی اب اپنے ڈرنکس پکڑے اس کیلی گرافی کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے تھے۔

"عبدالعلی......" ایک لمحے کے توقف کے بعد مومن نے بالآخر کہا۔

"امیزنگ۔" اس ڈیزائنر نے مزید سراہا۔ "اس کے اسٹروک، کلرز اور خط دیکھیں، بریلینٹ۔" وہ اس کیلی گرافی کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔

"لکھا ہوا کیا ہے؟" ایک ماڈل نے اپنے امریکن لب و لہجے میں مومن سے پوچھا۔

"قرآن پاک کی آیت ہے۔" مومن نے بتایا۔ وہ ماڈل بے اختیار ہنسی۔

"آف کورس۔ وہ تو جانتی ہوں میں لیکن اس کا مطلب کیا ہے؟"

بیک وقت ان لوگوں نے مومن کو دیکھا۔ مومن نے محقق انداز میں پیش کی گئی اس خطاطی پر نظر دوڑائی مدھم آواز میں کہا۔

"میں نہیں جانتا۔" وہ کہہ کر پلٹا اور اس سے پہلے کہ وہ وہاں سے ہٹ جاتا، اس کے سامنے اس کا ملازم ایک مہمان لے کر آیا تھا اور آنے والے مہمان کو دیکھ کر قلبِ مومن جامد ہو گیا تھا۔ مشروب کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا ہو۔

(باقی آئندہ ماہ ان شا

عطیہ خالد

بھابی

رفیعہ پھوپھو کے آنے کی خبر ایسی تھی جیسے کسی کے مرنے کی خبر مل گئی ہو۔ صف ماتم سی بچھ گئی تھی چار گھروں میں۔ وہ تو جانتی بھی نہیں ہوں گی کہ ان کے ایک فون نے کیسے ہر گھر پر بجلی گرا دی ہے۔ کل رات ان کا فون آیا تھا، اللہ حافظ کہنے سے پہلے انہوں نے بس اتنا کہہ دیا تھا۔

"بھائی جان! میں نے ٹکٹیں کروالی ہیں، ہفتے کو ان شاء اللہ میں آپ سب کے پاس ہوں گی۔"

ماما نے فوراً دوسری چچیوں کو فون کیا۔ رات گئے تک فون پر ہی بحث و تکرار ہوتی رہی۔ ماما نے تو سونے سے پہلے سر درد کی گولی بھی لی۔ سر پر پٹی الگ باندھی۔

پھوپھو پشاور رہتی تھیں۔ سنا تھا کہ تھوڑی غریب ہیں۔ ان کے شوہر چھوٹے موٹے سرکاری ملازم تھے۔ آخری بار دادی کے مرنے پر آئی تھیں۔ پھر ہر بار کہتیں کہ اس عید پر آؤں گی، اس عید پر آؤں گی لیکن وہ کبھی کسی بھی عید پر آ نہیں سکیں۔ فون وہ باقاعدگی سے کرتی رہتی تھیں۔ جب ہم چھوٹے تھے تو ایک بار پشاور ان کے پاس رہنے کے لیے گئے تھے لیکن ان کا گھر اتنا چھوٹا تھا کہ ماما دو دن بعد ہی ہمیں واپس لے آئی تھیں۔ وہ دو دن ہم نے تو بہت مزے



میں گزارے لیکن ماما کچھ خاص انجوائے نہیں کر سکی تھیں۔ اس وقت ان کا ایک دو سال کا بیٹا تھا۔ اب تو وہ چار بچوں کی والدہ محترمہ بن چکی تھیں۔

اس سال میں میٹرک میں پاس ہوئی تو انہوں نے مجھے پشاوری چپل بھیجی تھی۔ میری فرینڈز کو بہت پسند آئی تھی۔ پسند تو ماما کو بھی بہت آئی تھی اسی لیے انہوں نے پھوپھو سے ایک ساتھ پانچ ویسی ہی چپلیں بھیجنے کے لیے کہا تھا۔ ہر مہینے پھوپھو ایک چپل بھیج دیتیں۔ ماما بہت چڑتی تھیں۔ کہتی تھیں۔

''ایک ساتھ نہیں بھیج سکتی۔ یہ بھی عجیب ٹنٹنا ہے بھئی۔''

شام تک سب چچا ہمارے گھر جمع ہو چکے تھے۔ طے یہ پایا تھا کہ رفیعہ پھوپھو جو پورا ایک مہینہ رہنے کے لیے آرہی ہیں، انہیں چاروں مل کر ایک ایک ہفتہ اپنے پاس رکھیں گے۔ کیونکہ پاپا کسی نواب کے صاحبزادے نہیں تھے جو پھوپھو اور ان کے چار بچوں کو پورا ایک مہینہ کھلاتے۔ ان کی ناز برداریاں کرتے۔

تھوڑی بحث تکرار ہوئی اور سب چچا مان گئے۔ اس بات — پر تکرار ہوتی رہی کہ انہیں لینے اسٹیشن کون جائے گا۔ جو جائے گا اس کے پٹرول کا خرچا کہاں سے نکلے گا وغیرہ۔ دراصل پھوپھو لمبے عرصے سے آئی نہیں تھیں تو کسی کو ان کے آنے کی عادت نہیں رہی تھی۔ پھر وہ غریب تھیں تو کسی کو ان کی خوشامد کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ ان پر سب کو ترس تو بہت آتا تھا لیکن انہیں ان سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ ورنہ پاپا کی ایک چچا زاد کزن تھیں، عید پر سب سے پہلے پاپا ان سے ملنے ڈیفنس جاتے تھے۔ عید کا کیک اور ایک ایک ہزار روپیہ ہر بچے کو عیدی دے کر آتے تھے۔ ان کے شوہر ایک بہت بڑے بینک میں منیجر تھے۔ پاپا نے اس بینک سے لون لیا ہوا تھا۔ قسط دینے میں کچھ وقت لگ جاتا تو انکل بات سنبھال لیتے تھے۔

جس دن پھوپھو گھر آئیں، اس دن ماما نے بہت ساری بھنڈیاں پکالی تھیں۔ انہوں نے کہا۔

''یہ غریبوں کے بچے کھاتے بھی بہت ہیں، دیکھنا جھٹ پٹ ختم ہو جائیں گی۔''

پھوپھو کے بچوں نے اتنا کھایا کہ بھنڈیاں اگلے دن کے لیے بھی بچ گئیں اور انہیں پھر سے وہی کھانی پڑیں۔ ماما بار بار یہی کہتی تھیں کہ رزق ضائع کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ پھوپھو تو خود بہت صوم و صلوۃ کی پابند تھیں۔ وہ تو فریج میں جتنے پرانے سالن ہوتے، وہ نکال کر اپنے اور بچوں کے آگے رکھ دیتیں۔ ہاٹ پاٹ میں سے روٹی کے ٹکڑے چن چن کر کھاتیں۔ جب پھوپھو اپنے بچوں کو یہ سب کھلاتیں تو ماما کہتیں۔

''دیکھو، کیسے رغبت سے کھا رہے ہیں۔ اگر میں نے انہیں برگر پا پزا منگوا دیا تو ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ گوشت ووشت کھانے کی کہاں عادت ہوتی ہے انہیں۔''

پھوپھو میرے لیے ہاتھ کا بنا ہوا ایک پرس لائی تھیں۔ ایکسپو سنٹر میں نمائش میں وہ پرس پورے اٹھارہ سو کا مل رہا تھا۔ ماما نے لے کر نہیں دیا تھا اور میری پاکٹ منی کم پڑ گئی تھی۔ پھوپھو وہ لے کر آئیں تو مجھے بہت حیرت ہوئی۔

''پھوپھو! یہ تو بہت مہنگا ہے...... کیوں لیا آپ نے......؟؟؟''

''تمہاری پھوپھو یہ مہنگے پرس بناتی ہے۔ یہی کام کرتی ہوں میں گھر میں۔''

ماما کے کان کھڑے ہو گئے۔ ''اچھا...... کتنے لائی ہو......؟''

''ایک ایک ہر بھائی کی بچی کے لیے......''

''لو...... خود بناتی ہو تو بھابھیوں کے لیے بھی لے آتیں۔ پر کیوں جی۔ ہم کیوں یاد آتیں تمہیں۔''

''یہ بات نہیں ہے بھابھی! اس کا میٹریل...... وہ بس ذرا...... وہ تو خود لینا پڑتا ہے...... تو......'' کہتے کہتے پھوپھو شرمندگی سے پسینہ پسینہ ہو گئیں۔

''گیارہ سال بعد اپنے بھائی کے گھر آئی ہو تو اپنے بیٹے کو ہی رو رہی ہو۔ واہ کیا محبت ہے اکلوتی بہن کی۔''

پھوپھو تو اتنی شرمندہ ہوئیں کہ نظریں نہیں ملا پا رہی تھیں۔ فوراً ایک اور پرس نکال کر ماما کو دیا۔

''آپ یہ رکھ لیں بھابھی! شجاع بھائی کی بیٹی ابھی بہت چھوٹی ہے۔ اسے میں یہیں سے کچھ لے دوں گی۔''

ماما کی تیوری کے بل پھر بھی کم نہیں ہوئے۔ وہ چاہتی تھیں کہ انہیں چاروں پرس مل جائیں تاکہ وہ اپنی بہنوں کو بھی دے سکیں۔ آخر کو یہی بہنیں تو انہیں اپنے ساتھ سیلون اور پارلروں میں لیے لیے پھرتی تھیں۔

آلو بینگن، بیسنی روٹیوں، خشک برائے نام گھی لگے پراٹھوں، ڈھیر پیاز، ٹماٹر اور ایک انڈے کے آملیٹ کا ہفتہ ختم ہوا تو چچا شجاع پھوپھو کو لینے کے لیے آگئے۔

پاپا تو پھر مسکرا لیتے تھے، یہ چچا صاحب تھے کہ مسکرانا ہی بھول گئے تھے۔ بار بار کہتے جاتے تھے۔ ''بجلی کا بل بہت آتا ہے۔ اب ان کے کمرے کا پنکھا سات دن چلے گا۔ اُوپر سے دودھ کا خرچا۔ میرے بچے گلاس بھر دودھ پینے کے لیے ترسے جاتے ہیں۔ اب تو انہیں چائے بھی نصیب نہیں ہوگی۔''

چچا سلیم کا اپنا جنرل اسٹور تھا۔ لیکن بس وہ اور ان کی بیوی خاندان بھر میں بدنام تھے کہ ہر وقت روتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں، ہے نہیں...... کچھ ہے ہی نہیں...... کہاں جائیں...... کیا کریں۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی رونا روتے رہتے تھے۔ اسٹور کا بل بہت آگیا۔ اسٹور میں آگ لگ گئی۔ اسٹور میں چوری ہو گئی۔ شاید ان کا ماننا تھا کہ اگر وہ ایسے رو رو کر دکھاتے رہیں گے تو انہیں نظر نہیں لگے گی۔

پھوپھو چلی گئیں۔ مجھے تو رہ رہ کر ان کا خیال آرہا تھا۔ پھر ماما کو فون پر باتیں کرتے ہوئے سنا۔

''بس لے جاؤ نا بھئی۔ تم اسے اپنے گھر لے جاؤ، وہ تو بہت رو پیٹ رہا ہے۔ دو دن نہیں رکھ سکا رفیعہ کو۔ ہاں بھئی تم ہفتہ ہی رکھنا۔ ایک دن اوپر نہ کرنا۔ باقی کے بچے دنوں کا بھی کچھ کر لیں گے۔ ٹکٹیں جلدی کروا دیں گے رفیعہ کی۔ جاؤ لے جاؤ اسے اپنے گھر۔''

پھوپھو چچا شوکت کے گھر آگئیں۔ چچا شوکت کی بیٹی میری ہم عمر اور میری ہم جماعت تھی۔ پھوپھو کے ساتھ میں بھی وہاں رہنے کے لیے چلی گئی تھی۔ مجھے تو چچی نے ہاتھوں ہاتھ لیا، پاپا کی وجہ سے ہی سارہ کا ایڈمیشن میرے اسکول میں ہوا تھا۔ لیکن پھوپھو کو وہ آڑے ہاتھوں لے رہی تھیں۔ چچی نے آلو گوشت پکانے کی ہمت تو کر لی تھی لیکن وہ ایسے پٹخ پٹخ کر دستر خوان لگا رہی تھیں کہ پھوپھو کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔

چچی کام سے تھک گئی ہوں گی، یہ سوچ کر پھوپھو نے اپنی بچیوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے کھانا کھانا چھوڑ دیا۔ دستر خوان سمیٹنے لگیں۔ پھوپھو نے برتن دھوئے۔ کچن کی صفائی کرنے لگیں۔ انہوں نے یہ کام کچھ اتنی پھرتی سے کیے کہ میں اور سارہ دنگ رہ گئیں ان کی پھرتیاں دیکھ کر۔

چچی کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ اگلے دن انہوں نے ان سے سارے گھر کی صفائی کروا ڈالی۔ جالے اتروائے۔ پردے دھلوائے۔

تیسرے دن، پھوپھو بیٹیوں کے ساتھ مل کر چھت پر ڈرائنگ روم کا قالین دھو رہی تھیں۔ اسٹور کی صفائی کر رہی تھیں۔ پھوپھو بھی ایسی طاق تھیں کاموں میں کہ سارا گھر جگمگ جگمگ کرنے لگا تھا۔ چچی تک حیران تھیں کہ یہ ان ہی کا گھر ہے۔ انہوں نے مین گیٹ تک سرف ڈال کر ایسے دھویا تھا کہ پرانا گیٹ نیا ہو گیا تھا۔ ان کے دونوں بیٹے صبح اٹھتے ہی چچا کی گاڑی دھوتے تھے۔ لان کی گھاس تک ان کے دس سالہ بیٹے نے کاٹ دی تھی۔

پھوپھو کو آلو قیمہ، پراٹھے انڈے، ملائی والی چائے تو ملتی رہی لیکن اس کی انہوں نے قیمت چکائی

تھی۔ وہ فجر سے پہلے اٹھتی تھیں اور سارے گھر کا کام ایسے سمیٹنا شروع کر دیتی تھیں جیسے وہ ہمیشہ سے اس گھر میں رہتی رہی ہیں۔ کچن کے مرچ مسالوں کے ڈبے تک دھو ڈالے تھے انہوں نے۔

انہوں نے ہمیں بھی نماز کی عادت ڈال دی تھی۔ ہمارے سروں میں تیل ڈالتیں۔ مساج کرتیں۔ چچی کے سر میں بھی تیل ڈال کر مساج کرتیں۔ پھر بھی جب چچی کا دل ہوتا تب ہی ہنستیں۔ مشکل سے ہی تب ان کی تیوری کے بل کم ہوتے۔ پتا نہیں پھوپھو کا کیا حال تھا لیکن میرا اپنا دم گھٹتا تھا۔ میں نے کبھی چچی کا مزاج ایسے برہم نہیں دیکھا تھا۔ ہمارے آنے پر تو وہ بڑا کھلاتی تھیں۔ چکن بروسٹ، ملائی کوفتہ کھلاتی تھیں۔ ماما بھی تو انہیں ڈیزائنر کرتے لا لا کر دیتی تھیں۔ دونوں مل کر سیل پر بھی جاتی تھیں۔

☆☆☆

چچا فصیح عین وقت پر چکمہ دے گئے تھے۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اسلام آباد چلے گئے تھے۔ بس اتنا کہہ دیا تھا کہ سسر کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ہاسپٹل میں ہیں۔ چچی نے رو رو کر برا حال کر لیا ہے۔ پھوپھو کو چچی کے ابو کی بہت فکر ہوئی۔ فون کر کے چچی سے حال پوچھنا چاہا لیکن فون کٹ گیا۔ بات نہیں ہو سکی۔

پھوپھو شاید نہیں جانتی تھیں لیکن میں اور سارہ اچھی طرح سے جانتے تھے کہ اب میرے پاپا اور دو چچاؤں میں کیسی کھینچا تانی ہو رہی ہے۔ نوبت یہاں تک آ گئی کہ ناشتہ تمہارا، دوپہر کا کھانا میرا، اور رات کا کھانا بھائی صاحب آپ کا۔ ماما نے تو فون کر کے فصیح چچا کو خوب کھری کھری سنائیں کہ کیسے بہانہ بنا کر چکمہ دے کر چلے گئے۔ سسر تو اچھے بھلے ہیں، گھر میں ہیں۔ پر وہ جھوٹ پر جھوٹ بولتے رہے۔ الٹا یہ کہا کہ بچوں کی چھٹیاں تھیں، ان کا بھی حق ہے کہ بچے گھوم پھر لیں۔

”گیارہ سال بعد آئی ہے تمہاری بہن۔ گیارہ سال تم اپنے بچوں کو ہر سال گھماتے ہی رہے ہو۔“

”تو چار دن آپ اور رکھ لیں۔ باتیں ایسے رہی ہیں جیسے ہر سال مہمان نوازی کرتی رہی ہوں۔“ فصیح چچا کی زبان بالکل عورتوں کی طرح چلتی تھی۔ ان کا دماغ بھی عورتوں کی طرح چلتا تھا اسی لیے تو بھاگ گئے تھے۔

پھوپھو کے جانے میں ابھی بھی پورے پندرہ دن رہتے تھے۔ یہ پندرہ دن ہمارے خاندان عذاب بنے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی میرا اور سارہ کا دل چاہتا کہ ہم پھوپھو کے پاس جائیں اور ان سے کہیں کہ..... ”پھوپھو! اپنے گھر واپس چلی جائیں پلیز دوبارہ پھر کبھی مت آئیے گا۔ جنہیں آپ بھائی ہیں، وہ اب کسی کے شوہر ہیں۔ پھر آپ پیسے والی نہیں ہیں۔ انہیں کیا فائدہ دے سکتی ہیں۔ آپ دعاؤں کی انہیں ضرورت نہیں ہے۔“

دل ہی دل میں ہم یہ دعا کرتے تھے کہ کچھ ہو جائے کہ پھوپھو خود ہی جانے کی سوچ لیں۔ لیکن شاید وہ محبت کی ماری ہوئی تھیں۔ اپنے شہر میں گیارہ سال بعد آئی تھیں۔ مشقت بھری زندگی گزارتی رہی تھیں۔ اب تھوڑا آرام چاہتی تھیں۔ اپنے بھائی بھابیوں کے ساتھ رہنا چاہتی تھیں۔ دکھ سکھ کہنا چاہتی تھیں۔ پھر نہ جانے انہوں نے کیسے ٹکٹ پیسے جمع کیے تھے۔ کتنے سال لگے تھے انہیں یہ جمع کرنے میں۔

☆☆☆

ایک ہفتہ اور ایک دن پھوپھو کو چچا شوکت طرف ہو چکا تو ماموں منظر آ گئے۔ جب سے پھوپھو آئی تھیں، وہ گاہے بگاہے کئی بار پھوپھو سے ملنے لیے آ چکے تھے۔ پھوپھو اور پاپا انہیں منظر بھائی تھے۔ وہ ان کے خالہ زاد بھائی تھے۔ ہم انہیں ماموں کہنے لگے تھے۔ ان کی حیثیت بھی پھوپھو جیسی تھی۔ کبھی سال چھ مہینے بعد گھر آتے تھے۔ یہ ان مہمانوں میں سے ایک تھے جنہیں چائے پانی کر، چائے پانی پلائے بغیر رخصت کر دیا جاتا

ماما ہار کر خود ہی ایک گلاس پانی مانگ لیتے ہیں۔ سلام کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ماما کو ایسے ہر رشتے دار سے بہت چڑ تھی جو صرف ملنے اور حال چال پوچھنے آ جاتا تھا۔

”کبھی کوئی کام وام ہو تو انسان آئے جائے۔ یہ کیا منہ اٹھا کر آ جانا۔ یہاں وہاں کی بات کرنا اور چائے بننا۔ ہمارے پاس تو اتنا ٹائم نہیں۔“

چچا شوکت کے گھر سے وہ پھوپھو کو بہت شوق سے اپنے گھر لے گئے تھے۔ سب کو پہلی بار ماموں منظر نعمت اور رحمت دونوں لگے تھے۔ چلو وہ کسی کام تو آئے۔ وہ مجھے اور سارہ کو بھی بہت شوق سے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ماما ناراض تو بہت ہوئیں لیکن پھر چپکے سے یہ بھی کہہ دیا۔

”ذرا نظر رکھنا۔ تمہاری پھوپھو ضرور انہیں بھی کچھ دے گی۔ گیارہ سال بعد آئی ہے۔ لائی تو بہت کچھ ہے لیکن مجال ہے جو ہمیں ہوا لگنے دے۔“

ماموں منظر کے پاس ایک پک اپ تھی۔ وہ لوڈنگ کا کام کرتے تھے۔ وہ اپنے فیکٹری کے مالک کے بنگلے کے پیچھے تین کمروں کے کواٹر میں رہتے تھے۔ مالک کی فیملی ملک سے باہر رہتی تھی تو ماموں گھر کا خیال بھی رکھ لیتے تھے۔ ماموں کا گھر چھوٹا تھا، اس لیے مہمانوں کے لیے انہوں نے اپنے مالک سے کوٹھی کا لان استعمال کرنے کی اجازت لے لی تھی۔ بچوں کو سمجھا دیا تھا کہ پھول نہ توڑیں بس اچھل کود کر لیں۔ شام کو سب وہاں ٹہل لیں۔

میں اور سارہ ماموں کے گھر پہلی بار آئے تھے۔ دوسرے دن یہاں بھی بھنڈیاں ہی بنی تھیں۔ لیکن اس سالن میں ایسا ذائقہ تھا کہ میں جس نے کبھی بھنڈی نہیں کھائی تھی، میں ایک پوری روٹی کھا گئی۔ پھوپھو کے بچے بھی بہت سیر ہو کر کھا رہے تھے۔ پھوپھو نے گھور کر بچوں کو دیکھا اور کہا۔

”چلو بس...... اللہ کا شکر کرو اب۔ بہت کھا لیا۔“

”خبردار رفیعہ! جو بچوں کو کھانے سے روکا۔ یہ اپنا رزق اپنے ساتھ لائے ہیں۔ کھانے دو جتنا کھاتے ہیں۔“

بس پھر کیا تھا ہم بھی لہک لہک کر کہنے لگے۔ ”مامی جی! ایک گرما گرم روٹی اور۔“ کچن سے مامی کی آواز آئی۔ ”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ لو آئی روٹی کہ بس آئی۔“

یہاں بھی وہی سبزیاں، دالیں، چٹنیاں تھیں جو ماما نے بڑی چالاکی سے پھوپھو کو سات دن کھلائی تھیں۔ لیکن ہمارے گھر کے کھانوں، اور ان کھانوں میں بہت فرق تھا۔ انہیں کھانے کو جی نہیں کرتا تھا، انہیں کھا کھا کر جی نہیں بھرتا تھا۔ کھانے میں ذائقہ شاید نیت اور خلوص سے آتا ہے۔ مرغ مسلم بھی وہ مزا نہ دے جو چٹنی روٹی دے دے۔ دستر خوان پر تو بس رونق ہی رہتی۔

ماموں صبح اٹھ کر سب بچوں کو پک اپ میں بھر کر نہر کنارے لے جاتے تھے۔ وہاں ہم سب خوب ہنگامہ کرتے۔ پھر شام کو کام سے واپسی پر ماموں ہم سب کو کسی پارک میں لے جاتے تھے۔ پھوپھو اور مامی گول گپے کھا لیتی تھیں۔ ہمیں ماموں آئس کریم لے دیتے تھے۔

یہاں بھی پھوپھو بہت کام کرتی تھیں۔ مامی سالن بنا لیتیں، پھوپھو آٹا گوندھ کر روٹیاں بنا لیتیں۔ مامی گرما گرم پراٹھے پکا پکا کر اندر دستر خوان پر بھیجتی رہتیں اور پھوپھو ناشتے کے برتن سمیٹ کر صاف کرتیں۔ پھر پائپ لگاتیں اور سارا گھر دھو کر چمکا دیتیں۔ دونوں مل کر بازار سبزی لینے چلی جاتیں۔ مل کر بنا لیتیں۔ پھوپھو نے مامی کی چھوٹی بچیوں کے لیے فراکیں بھی سلائی کی تھیں۔ وہ مامی کے سر میں تیل ڈال کر مساج کرتیں۔ مامی بھی پھوپھو کو اپنے سامنے بٹھا کر ساری دنیا کے لطیفے سناتیں۔ دونوں گھنٹوں باتیں کرتی رہتیں۔ بیٹی کو آواز دے کر چائے بنواتیں۔ کبھی نمک پارے منگوا لیتیں۔ کبھی سموسے۔

ہم کوٹھی کے باغ میں جھولے لیتے رہتے تھے۔ کبھی کرکٹ کھیل لیتے۔ شام کو ماموں بھی وہیں

آجاتے تھے۔ کبھی ہم ریس لگاتے۔ کبھی کیرم کھیلتے۔ پھوپھو کے بچے یہاں آکر ایسے کھل اُٹھے تھے کہ ان کی صحت اچھی ہونے لگی تھی۔ ہمارے گھر میں تو ماما نے انہیں ایک کمرے میں بند کردیا تھا۔ یہ کرو، وہ نہ کرو، یہاں آؤ، یہاں نہ بیٹھو، وہاں نہ بیٹھو۔ یہ گلدان ٹوٹ جائے گا۔ یہ قالین خراب ہو جائے گا۔ پھوپھو بھی بہت خوش دکھائی دیتی تھیں۔ میرے اور سارہ کے گھر تو وہ بس ڈری ڈری رہتی تھیں۔

چھٹی والے دن پھوپھو اور مامی بھی ہمارے ساتھ نہر آگئیں۔ ماموں آم لے آئے تھے۔ پرسوں پھوپھو واپس جارہی تھیں۔ اس لیے ماموں نے کہا کہ ”دو دن وہ بچوں کو خوب گھمائیں پھرائیں گے۔“ بچے خوشی سے ماموں کی پیٹھ پر چڑھ گئے۔

”دیکھو بچوں! دعا کرو اپنے ماموں کے لیے۔ میرے دادا کی تھوڑی سی جائیداد تھی۔ اگر مقدمہ لڑے بغیر مجھے اس میں سے حصہ مل جائے تو کیا ہی بات ہے۔ پھر میں اپنا گھر لے لوں گا۔ پھر ہر سال آیا کرنا ماموں کے گھر رہنے کے لیے۔“

پھوپھو کے بچوں نے تو فوراً آموں سمیت ہاتھ اٹھا کر دعا کرنی شروع کر دی۔ پھوپھو بھی زیرلب آمین کہتی رہیں۔ وہ تو جی جان سے چاہتے ہوں گے کہ ہر سال ایسے پیارے ماموں کے گھر آئیں۔ جہاں ہر دن عید تھا اور ہر رات شب رات۔

☆☆☆

ماموں نے لاکھ کہا کہ ٹکٹیں آگے کروالو لیکن پھوپھو نہیں مانیں۔ رات کو سونے سے پہلے ہم نے بھی کہا تو انہوں نے بس اتنا کہا۔

”کسی پر اتنا بوجھ ڈالنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا بیٹا!“

پھوپھو چلی گئیں۔ ہماری ان کے بچوں سے بہت دوستی ہوگئی تھی۔ بہت شریف اور فرماں بردار بچے تھے وہ سب۔ جب میں اسٹیشن پر ان سے ملتے ہوئے روئی تو ماما نے مجھے گھور کر دیکھا۔

”تمہاری کب سے اتنی چہیتی ہوگئی پھوپھو۔ دیا کیا ہے اس نے تمہیں جو یوں جی جان لگا کر آنسو بہا رہی ہو۔“

پھوپھو اور پھوپھو جیسے مہمان بھلا کیا دے سکتے ہیں۔ وہ تو مجھے یہ احساس دلا گئی تھیں کہ ہم کتنے تھڑدلے اور کنجوس ہیں۔ ہم جیسے امیر دراصل کتنے غریب ہیں۔

☆☆☆

ماموں منظر اپنے نئے گھر کی مٹھائی لائے تھے۔ بہت چہک رہے تھے۔

”مبارک ہو ماموں! اب اگلے سال پھوپھو آپ کی طرف آئیں گی۔ تیار رہیے گا۔“

”اگلے سال، وہ کیوں بھلا......میں نے تو ٹکٹیں بھیج بھی دیں۔ جمعے کو سب بچے یہاں ہوں گے۔ میری بہن آئی تو اپنے ساتھ کیسی رحمتیں لائی۔ میرے تو کتنے ہی کام سنور گئے۔ ابا جی ٹھیک کہتے تھے۔ مہمان اپنے ساتھ خیر و برکت لاتا ہے۔ کتنی ہی بلائیں ٹلوا کر چلا جاتا ہے۔ بس ابا جی کی یہ بات میں کبھی نہیں بھولا۔“

ماموں منظر کی یہ بات مجھے اس وقت ٹھیک طرح سے سمجھ میں آئی جب چچا فصیح کا واپس آتے ہوئے ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ انہیں زیادہ گہرے زخم تو نہیں آئے تھے لیکن بارہ لاکھ کی گاڑی تباہ ہوگئی تھی۔ چچا شوکت کے اسٹور میں واقعی میں آگ لگ گئی تھی اور چوری بھی ہوگئی تھی۔ چچی تو صدمے سے بیمار ہی ہوگئیں۔ پاپا کے لون کے ساتھ کچھ ایشوز کھڑے ہونے لگے تھے۔ وہ اینٹی ڈیپریشن کی دوائیں لینے لگے تھے۔ ایک دن میں فوڈ آڈر کر رہی تھی تو ماما نے بڑا چڑ کر کہا۔

”شرم کرو، تمہارا باپ قرضے میں ڈوبا پڑا ہے تمہیں عیاشیاں سوجھ رہی ہیں۔“

میں نے فون واپس رکھ دیا۔ میں ماما سے کہہ نہیں سکی کہ پاپا بینک کے مقروض نہیں ہیں۔ وہ تو بس ایک پیارے، ایک عزیز کی محبت کے مقروض ہیں۔ وہ قرض ادا کر دیتے تو شاید یہ قرض ادا نہ کرنا پڑتا۔ پھوپھو کے ساتھ آئی خیر و برکت کو سمیٹ لیتے تو ڈپریشن کو جھیلنا نہ پڑتا۔

☆

نازیہ رزاق

تیرا عہد وفا

جون کی چلچلاتی دھوپ نے ہر ذی روح کو ادھ موا کر رکھا تھا۔ چرند پرند بھی اپنے آشیانوں میں گھسے، خشک زبانیں لیے، کسی بادل کے ٹکڑے کی بھیک مانگ رہے تھے۔ ایسے میں اس نیم سرکاری یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس بھی کسی سایہ دار جائے پناہ کی تلاش میں ٹولیوں کی صورت درختوں تلے بے زار کھڑے تھے۔

ناولٹ



دوپہر کے ڈھائی بجے کا وقت تھا، یوں طلبہ کی تعداد خاصی کم تھی۔ ایسے میں وہ تینوں بھی ایک سنگی پر سرخ چہرے لیے بیٹھی تھیں۔

انتہا ہوگئی، انتظار کی
آئی نہ کچھ خبر، ماما بابا کی

ماہم نے اپنی ڈھیلی پونی کو کسا، منرل واٹر کا گھونٹ بھرا اور ماہ نور کے کندھے پر سر گرا کر دہائی دی۔ ماہ نور نے اسے نرمی سے پیچھے کیا، اپنا دوپٹہ مزید آگے کھسکایا اور فائل سے خود کو ہوا دینے لگی۔ اب ماہم نے بائیں جانب بیٹھی ماہ رخ کو ترچھی نگاہوں سے بھانپا، جو کھٹ پٹ پیغام لکھ رہی تھی۔

"کیا ہے یار! مارو یہ ماہ نور تو ہے ہی سدا کی بور۔ اوپر سے تم بھی اس دن کو مزید یوم حشر بنانے پر تلی ہو۔ یار کوئی بات تو کرے؟"

"اوہ، ماہ نور! تمہاری ریمپ والی دوست ادھر آ رہی ہے اور ساتھ اس کا ہینڈسم کزن بھی ہے۔" ماہ رخ نے سب کو الرٹ کیا۔ علوینہ ماڈلز کی سی چال چلتی ہوئی آ رہی تھی۔

"ارے نورا! یار تم لوگ ابھی تک ادھر ہی ہو؟ کوئی مسئلہ ہے تو میں ڈراپ کر دیتی ہوں۔"

"نہیں وینا! دراصل بابا شاید کسی میٹنگ میں ہیں، اس لیے انہیں دیر ہوگئی۔ اب تو آتے ہی ہوں گے، تمہارا شکریہ۔" ماہ نور کے سنجیدگی سے کہنے پر سب کے ارادوں پر اوس پڑ گئی، علوینہ ہاتھ ہلاتی چلی گئی۔

"اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتی۔ کچھ دیر میں چکرا کر گرنے والی ہوں۔" ماہم پھر سے شروع ہوئی۔

"اس ڈرامے کی قطعی ضرورت نہیں کیونکہ

آ گئے ہیں۔" ماہ نور نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ سب بے چینی سے آگے بڑھیں، بابا گاڑی سے نکل رہے تھے مگر ان کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔

"سوری بیٹا! ہم لیٹ ہو گئے۔ مگر اس سب کی وجہ تمہارے عبید انکل ہیں۔ میرے یونیورسٹی فیلو اور سب سے اچھے دوست۔" لڑکیاں ان سے ملنے لگیں۔ وہ شستہ انگریزی میں بابا سے گفتگو کر رہے تھے۔ ـــــ وہ شان دار شخصیت کے مالک تھے۔

"لگتا ہے ماہ نور نے بھی نہیں پہچانا۔ باقی دونوں تو چھوٹی تھیں ناں۔" اب وہ براہ راست ماہ نور سے مخاطب ہوئے تھے۔

"میں نے پہچان لیا ہے انکل! آپ نے اسلام آباد جانے سے پہلے جو بیسکز کی کتاب مجھے دی تھی وہ آج بھی میرے لیے اتنی ہی کار آمد ہے تو میں کیسے بھول سکتی ہوں آپ کو۔" وہ مسکرا کے اس کا سر تھپتھپانے لگے۔

"اچھا چلتا ہوں یار! تم بھابھی اور بچیوں کو لے کر آنا ہماری طرف۔ ہمیں خوشی ہوگی۔"

"ارے نہیں عبید بھائی پہلے آپ لوگ ہمارے گھر آئیں گے۔ ابھی تو آپ لوگ نئے شفٹ ہوئے ہیں تو میزبانی پہلے ہمیں ہی کرنے دیجیے۔" صالحہ ماہم کو دوپٹا درست کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔

"صاحب زادے تھوڑے مصروف ہیں، بس جس دن بھی فراغت ملی ہم حاضر ہو جائیں گے۔"

عبید انکل کے رخصت ہونے کے بعد بھی ان ہی کی باتیں ہوتی رہیں۔ گھر آتے ہی سب ہی نے اپنے اپنے کمروں کا رخ کیا مگر ماہ نور نے دوپہر کے کھانے کے لیے ملازمہ کو ہدایات دیں۔

☆☆☆

صالحہ اور کبیر کی ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی۔ دونوں فطین دماغوں اور آسمانی عزائم والے تھے۔ صالحہ بنیادی طور پر دیہاتی تھیں مگر خود پر سے یہ لیبل ہٹانے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسی یونیورسٹی میں پڑھانے لگیں۔ کبیر احمد سے شادی کے بعد وہ خود کو مکمل تصور کرنے لگیں مگر زندگی میں ننھی ماہ نور کی آمد نے ایک ناگوار ہل چل مچا دی۔ صالحہ کی رفتار سست ہوئی تو انہیں بوڑھی ساس کی افادیت معلوم ہوئی۔ سطوت جہاں نے ماہ نور کو دیکھتے ہی بے ساختہ کہا۔

"یہ ہے اصل صالحہ! کیسی چمکتی پیشانی ہے اس کی۔" یوں ماہ نور کو ایک نرم سی گود مل گئی۔ وہ تدبر اور دانائی کے ہاتھوں پلنے لگی۔ پھر جب ماہ نور نے سطوت جہاں کو کھو کے، ماہ رخ اور ماہم جیسی ساتھیوں کو پایا تو وہ چھوٹی بچی دانا بن گئی۔ وہ گورنس کے ساتھ الجھتی اپنی بہنوں کی فکر میں ہلکان رہتی۔

وقت گزرتا رہا اور وہ خاموش ہوتی گئی کیونکہ اب گھر میں ماہ رخ اور ماہم کی آوازیں اڑان بھرتی تھیں۔ کسی مہمان کے سامنے صالحہ جھٹ کہتیں۔

"ماہم بیٹا! آنٹی کو وہ پوئم سناؤ، جس پر آپ کو پرائز ملا ہے۔"

ماہم اور ماہ رخ دونوں شروع ہو جاتیں۔ ماہ نور ہولے ہولے مسکراتی رہتی۔ آہستہ آہستہ وہ خود ہی پس منظر میں چلی گئی۔ اس کی بہنیں اس پر جان دیتی تھیں مگر انجانے میں وہ اس کی زندگی کا ریموٹ اپنے ہاتھوں میں لے رہی تھیں۔

"ماہ نور بیٹا! جلدی کرو۔ ہمیں مزید شاپنگ بھی کرنی ہے۔" شاپنگ کے دوران صالحہ اسے اکساتیں مگر وہ مزید الجھ جاتی۔ رنگ اسے پریشان کرتے تب ماہ رخ جلدی سے کہتی۔

"ماہ نور تم وہ پیچ لو، تم پر سوٹ بھی کرے گا۔" وہ لیتی، چاہے یہ رنگ اسے زہر لگ رہا ہوتا۔ وقت اس قوت فیصلہ کا امتحان ـــ لینا چاہتا تھا کہ امتحان کسی "تیاری" نہیں، دیکھتا...... وہ تو بس تیار کرتا ہے۔

☆☆☆

"ماما! زارا کی سالگرہ ہے اس نے مجھے دعوت دی ہے۔ کسی ریسٹورنٹ میں ہے، کیا میں چلی جاؤں؟ یونیورسٹی میں گرمیوں کی چھٹیاں چل

...۔ پانچویں سمسٹر کے پیپرز ہو چکے تھے۔ وہ گھر ... فارغ ہی ہوتی تھی۔

صالحہ جو اپنے بالوں میں رولرز لگائے، ... پر بکھیرے رکھے لیٹی تھیں، بولیں۔

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔ جاؤ، اچھا ہے آؤٹنگ ... بائے گی تمہاری...... اور ہاں سنو، اب ماہم یا ماہ ... کو ساتھ نہ باندھ لینا۔ اپنے اندر تھوڑا کانفیڈنس ... لوگوں کو خود فیس کرنا سیکھو۔"

ماہ نور نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر "او کے" کہہ کر چل دی۔

"ڈنر کے لیے کچھ بنا دوں۔ ماما تو خود کہیں گئی ... ں گی پھر یہ دونوں کیا کریں گی۔" وہ خود کلامی کے انداز میں کہتے ہوئے، شائستہ کو ہدایات دینے لگی۔

ان کا گھرانہ آئیڈیل تھا مگر اسے کچھ کمی محسوس ... تی۔ شاید گرہستی کی، جس میں صالحہ ناکام رہیں۔ ... میں ملازم تھے مگر وہ مطمئن نہ ہو پاتی۔ صالحہ چڑ ... باتیں، غصے میں کہتیں۔

"تمہیں کسی ایسے خاندان میں ہونا چاہیے تھا ... ہاں لڑکیوں کی زندگی کا محور و مقصد جھاڑو پونچھا ... نا، نت نئی ہانڈیاں بنانا اور کشن کورز یا وال ہینگنگ ... کاڑھنا ہی ہوتا ہے۔" ماہ نور خود بھی اس مصنوعی اور تیز ... ار ماحول سے خود کو کٹا ہوا محسوس کرتی۔ اسے خود ... معلوم نہ تھا کہ آخر وہ چاہتی کیا ہے؟

☆☆☆

اس وقت وہ ریسٹورنٹ کے پرکیف ... ل میں بے چین سی بیٹھی پہلو بدل رہی تھی۔ ... ورنٹ کا نیم تاریک، خواب ناک سا ماحول ... کے اعصاب پر سوار ہوئے جا رہا تھا۔

"زارا! اور کون کون آ رہا ہے؟"

وہ اپنے دوپٹے کو مزید ماتھے تک پھیلا رہی ... ے شرٹ اور سگریٹ پینٹ میں وہ یقیناً ... رہی تھی۔ زارا بڑے انہماک سے اس کا ... میں مصروف تھی۔ وہ اپنی ماں بہنوں جیسی ... ایک نامعلوم سی کشش تھی اس میں، سنہری رنگت، بادامی آنکھیں، بادامی بال اور گلابی سے ہاتھ۔ اس کے ہاتھ بہت خوب صورت تھے، جنہیں وہ پریشانی میں مسلتی، جیسے اب مسل رہی تھی۔

"بس تم اور علوینہ۔" زارا نے لاپروائی سے جواب دیا۔ پھر سیل فون سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ کچھ دیر میں علوینہ بھی چلی آئی۔

"اچھی لگ رہی ہوں ناں...... تم بھی بہت اچھی لگ رہی ہو، برتھ ڈے گرل سے بھی زیادہ۔"

وہ چہک رہی تھی، اسجد اسے اپنی نظروں میں رکھے ہوئے تھا۔

"یار زارا! اب جلدی کرو۔ مجھے پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔" وہ دوستوں کے ساتھ باہر آتی جاتی رہتی تھی مگر آج دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔

"او کے پھر تم لوگ کچھ دیر باتیں کرو، میں ابھی آئی۔" زارا سیل فون سمیت نظروں سے اوجھل ہوئی، ماہ نور انگلیاں چٹخانے لگی۔

"کوئی مسئلہ ہے کیا؟ ماہ نور آپ ایزی فیل نہیں کر رہیں؟" اسجد نے علوینہ سے تائید چاہتے ہوئے ماہ نور سے کہا۔

ارے ہاں یار! ریلیکس ہو جاؤ۔ تمہیں زارا نے نہیں بتایا تھا کہ اسجد بھی آ رہا ہے؟" علوینہ نے پوچھا۔ فون پر میسج ٹون بجی تو دیکھتے ہوئے بولی۔

"ایک منٹ، میں زارا کو دیکھ لوں۔ پتا نہیں کہاں پھنس گئی ہے۔" ماہ نور اب صحیح معنوں میں مضطرب ہوئی۔ دل میں جانے کون سا الارم فٹ ہوتا ہے، جو برے وقت کے قدموں کی چاپ کو کوسوں دور سے جانچ لیتا ہے اور دھڑکن کو گھنٹی کے طور پر یہ زور زور سے بجانا شروع کر دیتا ہے۔ جیسے قدیم یونانیوں کا "مندر کا گھنٹہ" جو خاص موقعوں پر زور زور سے بجا کر رعایا کو خبردار کر دیا جاتا۔

"ماہ نور! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" اسجد گلا کھنکار کے بولا اور ماہ نور کی بات کا انتظار کیے بغیر کہنے لگا۔

"دراصل ماہ نور! آپ مجھے اچھی لگتی ہیں، شروع دن سے ہی...... اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں

اپنی فیملی کو آپ کے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔"

ماہ نور جانتی تھی وہ اسے پسند کرتا ہے مگر اتنی جلدی اسے پرپوز بھی کردے گا، یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ فطری طور پر وہ سٹپٹائی، پھر سنبھل کے مضبوط لہجے میں بولی۔

"اسجد پلیز...... میں ان لڑکیوں میں سے ہرگز نہیں ہوں جو یوں ریسٹورنٹس میں بیٹھ کے شادی کی ڈیٹ بھی فائنل کرلیں۔ آج کے بعد مجھ سے اس قسم کی گفتگو ہرگز مت کیجیے گا۔ مجھے دیر ہورہی ہے، چلتی ہوں۔ زارا اور علوینہ کو بتادیجیے گا۔"

وہ ٹھہرے ہوئے دوٹوک انداز میں کہتے ہوئے اپنا بیگ اٹھانے لگی، جب اسجد نے افراتفری میں میز پر دھرا اس کا سرد ہاتھ تھاما۔

"پلیز ماہ نور! آپ جو بھی فیصلہ کریں، مجھے منظور ہے مگر اس طرح چلے جانے سے زارا اور علوینہ نہ جانے کیا سوچیں۔"

وہ تیز تیز بول رہا تھا، شاید لفظوں کا انبار لگا کر راستہ مسدود کردینا چاہتا تھا مگر اس کے الفاظ کا گلا ایک دھاڑ نما پکار نے گھونٹ دیا۔

"ماہ نور......" ماہ نور نے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں کبیر احمد اور عبید صاحب کھڑے تھے۔ زرد رنگت اور سرد جسم کے ساتھ وہ تقریباً بے جان لاشہ ہی ہوگئی۔ اسجد نے جلدی سے ہاتھ چھوڑ دیا۔ کبیر احمد سرد تاثرات اور بھینچے ہوئے جبڑوں کے ساتھ ضبط کی آخری منزلوں پر تھے۔

"اگر یہ سب ختم ہوگیا ہو تو چلیں؟" ماہ نور کے زبان مفلوج ہوگئی۔ اسجد بھی ہوش میں لوٹا، جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہوتے ہوئے وضاحت کرنے لگا۔

"وہ دراصل سر! میں ماہ نور سے......"

"بس بہت ہوگیا۔ اب مجھے کوئی وضاحت مطمئن نہ کرپائے گی۔ جو میں دیکھ چکا ہوں، سمجھانے کو کافی ہے۔ ویسے بھی اگر کنویں کا پانی ہی گندا ہوجائے تو گھڑا بدلنے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

کبیر احمد بات مکمل کرکے رکے نہیں۔ جبکہ ذات کے پرخچے اڑ جانا کسے کہتے ہیں وہ ماہ نور نے آج جانا۔

زارا اور علوینہ بھی ہاتھ میں کیک تھامے آچکی تھیں اور کچھ کچھ سمجھ بھی چکی تھیں۔ ماہ نور اس قدر شاک میں تھی کہ اس جہنم سی جگہ سے جانا محال ہوگیا۔ عبید صاحب جو سب خاموشی سے سن رہے تھے وہ آگے بڑھے اور ماہ نور کو شفقت سے اپنے ساتھ لگائے وہاں سے نکل گئے۔

☆☆☆

گھر کا ماحول عجب گھٹن زدہ سا ہوگیا۔ خاموشی سارے گھر میں گھومتی پھرتی۔ اس دن کبیر احمد گھر آکر مکمل خاموش ہوگئے مگر صالحہ نے بنا ماہ نور سے بات کیے چیخ چیخ کر اپنی ساری ذمہ داری پوری کرلی۔ ماہ نور گھپ اندھیروں میں چھپ گئی، اس کی ذات جو ہمیشہ پس منظر میں رہی تھی، ایسے بھیانک انداز میں منظر عام پر آئی تھی کہ اس کا دل زندگی سے جیسے اٹھ سا گیا، وہ مایوسی کی انتہا کو جا پہنچی۔

ماہ نور کے لیے بھی زندگی نے ایک نیا در وا کیا تھا مگر وہ انجان بنی رہی۔

کبیر احمد نے اس کی شادی طے کردی تھی اور یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ کسی کو ردعمل دکھانا بھی یاد نہ رہا۔

ماہ نور مکمل خاموش تھی، دکھ اور شاک کی کیفیت اب خودترسی اور منتقم مزاجی میں ڈھل رہی تھی۔

صالحہ کی اپنی پریشانیاں، کم وقت زیادہ کام۔ وہ اکثر ملازموں کو جھڑکتی پائی جاتیں۔ ماہ نور ماہم کے توسط سے صرف اتنا جان سکی کہ بابا نے اس کا رشتہ عبید انکل کے گھر طے کردیا ہے۔ ایک دن وہ لوگ آئے اور چیدہ چیدہ معاملات طے کرگئے۔ ماہ نور خاموش تماشائی سی بیٹھی رہی۔ کسی کو صفائی پیش کرنے کی ضرورت ہی نہ جانی۔ اب بابا کسی سے بھی بیاہتے، شادی کا نتیجہ وہ ٹھان چکی تھی، طے کرچکی تھی۔ اب کرنا تو اس نے وہی تھا۔

☆☆☆

"نور بیٹا! سارا دن ایسے کیوں بیٹھی رہتی ہو؟ اور کچھ نہیں تو اپنا خیال ہی رکھا کرو۔ شادی کی تیاریوں میں حصہ لیا کرو۔" صالحہ کے کہنے کے باوجود وہ نیم در

تبدیل بدلنے میں مصروف رہی، وہ پھر سے بولیں۔

چلو ان تینوں ڈریسز میں سے رنگ پسند کرلو۔ انہوں نے اس کے پہلو میں خوب صورت جوڑے رکھے۔"

"جب شادی جیسا فیصلہ آپ لوگ خود کرسکتے ہیں تو پھر جوڑے کے رنگ پسند کرنے سے کیا فرق پڑے گا۔"

سب کی گردنیں اٹھیں، وہ ایسی تو نہ تھی، اتنی سرد، برف سی۔ بر فیلے الفاظ بولنے والی لڑکی، لاؤنج کے داخلی دروازے میں کبیر احمد رکے تھے۔ صالحہ غصے سے پھٹ پڑیں۔

"کیا ثابت کرنا چاہتی ہو، اب اس سب بکواس سے تم؟"

"کچھ نہیں...... کچھ بھی نہیں کیونکہ ثابت وہاں کیا جاتا ہے جہاں ثبوت طلب کیے جائیں ورنہ تو باقی وضاحتیں ہی رہ جاتی ہیں اور مجھے کسی کو کوئی وضاحت نہیں دینی۔" وہ لاؤنج سے نکلی تو نظر کبیر احمد پر بھی پڑی مگر وہ بے خوف رہی۔ کبیر احمد پہلی بار کچھ سوچ کر سہمے۔

☆☆☆

مہندی کے فنکشن سے پہلے، عصر میں نکاح تھا۔ وہ زرد جوڑا پہنے تیار تھی۔ صالحہ اور کبیر احمد کی گھبراہٹ عروج پر تھی۔ اگر نکاح کے وقت انکار کردیا تو...... مگر وہ سکون سے ایجاب وقبول کا مرحلہ طے کرگئی۔ سسرال والے ہٹے تو اسے گھونگھٹ میں بے حس بیٹھا دیکھ کر صالحہ کا دل دہلا۔ اسے گلے لگا کر بے ساختہ روئیں۔ ماہم اور ماہ رخ الگ چمٹ گئیں۔

"نور، میرا بیٹا! تم بھول جاؤ ناں اس قصے کو۔ بس بابا کو غصہ آگیا تھا۔ وہ غیر یقینی صورت حال کو ہینڈل نہیں کرپائے۔ وہ تو تمہیں......" گھٹی گھٹی آواز میں تلافی کی جارہی تھی پھر نجانے کیوں فرد جرم عائد کرتے ہوئے آوازوں کو بڑھادیا جاتا ہے۔ ماہ نور کی آنکھیں خشک رہیں، بولی تو بس اتنا۔

"ماما پلیز بس کریں، آپ تو ایسے رو رہی ہیں جیسے میں ہمیشہ کے لیے جارہی ہوں۔" صالحہ بے اذن ہوئیں۔

"ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں؟ میں سچ میں ایسا ہی کرنے والی ہوں۔ ایک الزام آپ لوگوں نے لگایا، دوسرا داغ

میں خود لگوالوں گی' ڈیٹس اٹ۔" وہ واش روم میں گھس گئی تب بھی صالحہ خاموش اور بے یقین سی بیٹھی تھیں۔

☆☆☆

شادی شان دار رہی، ہر شے عمدہ تھی۔ لوگ دبی دبی آواز میں جلد شادی کی وجہ بھی دریافت کرتے رہے۔ کچھ بظاہر خوش بھی ہوتے رہے۔

معاذ عبید خاقانی شان دار مرد تھا۔ ایک بڑی کنسٹرکشن کمپنی میں سینئر آرکیٹیکچر، کیمبرج کا فارغ التحصیل۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا۔ صالحہ پوری محفل میں گردن اکڑائے گھومتیں، سوچتیں۔ کولیگز تو ابھی تک لڑکے کے اور خاندانی پس منظر کے کریڈٹس ہی گن رہی ہوں گی۔

ماہ نور کو جب پہلو میں بٹھایا گیا تو ہر ایک اس جوڑی کو سراہ رہا تھا۔۔ معاذ پر سکون لگ رہا تھا۔ رخصتی کے وقت کبیر احمد نے خود پر ضبط کیا۔

"نور بیٹا! وقت خود یہ ثابت کردے گا کہ تمہارے بابا کو صرف تمہاری خوشیاں عزیز تھیں۔ میری بیٹی بہت فہم رکھنے والی ہے، یہ میں بخوبی جانتا ہوں۔" بے وقت الفاظ، بے وقعت ہوجاتے ہیں۔

ماہ نور نے صرف ایک نظر انہیں دیکھا۔ شکوہ، دکھ، غصہ...... اس نظر میں سب کچھ تھا۔ ماہ نور کا ملال کم نہ ہوا۔

جو لوگ کسی بات پر ردعمل نہیں دیتے، جب کسی بات پر دیتے ہیں تو شدید دیتے ہیں اور وہ بھی ان ہی لوگوں میں سے تھی۔

☆☆☆

"کبیر! کہیں ہم نے ماہ نور کے ساتھ کچھ غلط تو نہیں کردیا؟" کمرے کی خاموش فضا میں صالحہ کی آواز نے دراڑیں ڈالیں۔ انہیں ماہ نور کی شکوہ کناں آنکھیں اور سرد تاثرات بھلائے نہ بھولتے۔

"غلط تو ہوا ہے ہم سے اور شاید بچپن سے کچھ نہ کچھ غلط ہی ہوتا آیا ہے اس کے ساتھ۔ بچپن میں اسے پیار کرنے کا وقت نہیں تھا ہمارے پاس۔ تو اسے اماں کے پاس چھوڑ آئے اماں اسے چھوڑ گئیں تو ہم نے اسے اپنی چھوٹی بیٹیوں کے لیے چھ
دیا۔ وہ ہمارے ساتھ رہتے ہوئے ہمارے درمیا
بھی تھی ہی نہیں۔ اب شاید اسے چھوڑنے کا یہ
طریقہ اپنایا ہے ہم نے۔ اللہ کرے وہ اس "وار"
بھی سہہ جائے۔"

کبیر احمد کی آواز اسی کمرے کی تاریک
میں دفن ہوگئی اور شہر کے دوسرے کونے میں مو
ان کی بیٹی غلطیوں کی ابتدا کرچکی تھی۔

☆☆☆

کمرہ نفاست سے سجایا گیا تھا۔ بھینی بھ
خوشبو سی تھی جو فسوں سا پھیلا رہی تھی۔ معاذ کمر
میں آیا تو ٹھٹکا۔ دلہن سمٹ کر کونے میں بیٹھی تھی
سر جھٹک کر قریب آن بیٹھا۔ الفاظ ڈھونڈے گئے

"دراصل میں اس بارے میں قطعی لاعلم ہوں
اس موقع پر کیا کہا جاتا ہے۔ پہلا پہلا تجربہ ہے نا
ویسے بھی سب اتنی جلدی میں ہوا کہ......"

یہ معاذ کا انداز تھا، تفصیلاً بولتا۔ دھیما دھیما
جیب ٹٹول کے مخملی کیس نکالا گیا۔ دوستانہ انداز
ماہ نور کا ہاتھ تھامنا چاہا مگر ہاتھ درشتی سے جھٹکا
ایک پل کو چپ ہی رہ گیا پھر سنبھل کے بولا۔

"اوکے، اوکے...... ٹیک یور ٹائم! یقیناً آ
بھی میری طرح اس شاک کے زیر اثر ہوں گی
پرابلم نہیں۔ میں سمجھ سکتا ہوں، یہ آپ کا ویڈ
گفٹ ہے۔" مخملیں کیس اس کی جانب سرکا
ڈریسنگ روم میں گھس گیا۔

اگلی صبح روایتی ہنگامہ خیزی سمیت اتر
سائرہ مہمانوں کو بیڈٹی دینے میں مصروف تھیں
بھتیجی سے بولیں۔

"سمیعہ بیٹا! معاذ کے کمرے کا دروازہ
کریں، کیا اٹھ گئے وہ لوگ؟" سمیعہ دیکھنے آئی
تک سک سا کمرے سے نکل رہا تھا۔

"اوہ...... میں آپ کو ہی دیکھنے آرہی تھی
بھائی! اور آپ کی دلہن؟" استفہامیہ انداز میں
کے پیچھے جھانکا۔

"وہ آرہی ہیں، آؤ ہم چلتے ہیں اور سناؤ کیسی ہو اور تمہارا فیشن ڈیزائننگ کا شوق کہاں تک پہنچا؟"

وہ اسے لیے سیڑھیاں اتر گیا۔ اوپر ماہ نور ابھی بھی اپنی جگہ سے نہ ہلی تھی۔ معاذ کے بار بار کہنے پر بھی وہ خاموش سی رہی تو وہ کچھ الجھ گیا۔

☆☆☆

ولیمہ کے اختتام پر سب ہی تھکن اور خوب صورت یادیں دلوں میں لیے واپس لوٹ گئے۔

دوپہر میں وہ سسرال گیا۔ ماہم اور ماہ رخ کے ساتھ وقت بہت اچھا گزرا۔ مگر کچھ تھا جو وہ شدت سے محسوس کرتا رہا۔ ماہ نور کا رویہ، اس کی سرد مہری اور کم آمیزی۔

وہ اپنے گھر میں اجنبیوں کی طرح تین گھنٹے گزار کر چلی آئی پھر انکل آنٹی کا احساس دلاتا کہ ماہ نور شروع سے کم گو ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ماہ نور نے بستر کو اپنے لیے پرسکون پایا۔ مگر جب ہاتھ کپڑوں سے ٹکرایا تو بے حد ناگواری محسوس کی۔ اٹھ کر ڈریسنگ روم میں کپڑے تبدیل کیا، سادہ جوڑا پہنا...... منہ پر پانی کی چھپا کے مارے اور تھکے تھکے قدموں سے باہر آئی۔ معاذ کاؤچ پر نیم دراز فون پر مصروف تھا اسے دیکھ کر سنبھل کر بیٹھا۔ ماہ نور نے بالوں کا ڈھیلا جوڑا بنایا اور کروٹ کے بل لیٹ گئی۔

"جی جواد صاحب! میں پہلے ہی عرض کرچکا ہوں کہ میں ان دنوں رخصت پر ہوں پھر بھی میں توقیر صاحب سے بات کرتا ہوں۔ ہم اپنا سو فیصد ہی دیں گے۔ مہربانی جناب، اوکے۔" وہ بات کے دوران بھی ادھر ہی متوجہ تھا۔ فون بند کیا، گہری سانس لے کر ماہ نور کے رویے کو نظرانداز کیا پھر اٹھ کر بیڈ کی دوسری جانب آ بیٹھا۔ ماہ نور نے آنکھیں زور سے میچ لیں۔ معاذ نے ہاتھ بڑھا اس کا رخ موڑنا چاہا مگر ہاتھ کو لگنے والا جھٹکا شدید تھا۔ معاذ کو پہلی بار شدید ناگوار محسوس ہوا۔

"دیکھیں ماہ نور! اگر کوئی پرابلم ہے تو مجھ سے ڈسکس کرسکتی ہیں مگر یہ رویہ...... کم از کم میری سمجھ سے بالاتر ہے۔" آواز کچھ تیز تھی۔ ماہ نور نے بے خوفی سے سوال نظرانداز کرتے ہوئے اپنے اوپر چادر تان لی۔

جن لوگوں کو کچھ اچھا ہونے کی امید نہیں ہوتی، انہیں بہت برا ہونے کا خوف بھی نہیں رہتا۔ امید ہمیشہ خوف میں مبتلا رکھتی ہے اور یہ خوف بے یقینی کی صورت میں ہوتا ہے۔

معاذ نے ہاتھ بڑھا کر چادر سرکائی۔ اب ماہ نور نے باقاعدہ اس کا ہاتھ جھٹکا۔ ہتک سے وہ سرخ پڑ گیا۔ کچھ لمحے لب بھینچے بیٹھا رہا پھر تن فن کرتا ڈریسنگ روم میں گھس گیا۔ کچھ دیر بعد نکلا۔ چیزوں کی اٹھا پٹخ کی۔ بیڈ کی دوسری جانب آ کر لیٹ گیا۔

کیا چیز ہے یہ؟ مجھے لگا کوئی پرابلم ہوگی اور یہ سمجھ رہی ہے میں مرا جارہا ہوں اس سے بات کرنے کے لیے...... اب میری طرف سے جائے بھاڑ میں، دیکھوں گا بھی نہیں محترمہ آفت صاحبہ کو۔

اس کو اس دوراہے پر لے آؤں گی کہ شکل بھی دیکھنا پسند نہ کرے گا میری اور یقیناً میں یہ کرسکتی ہوں۔ اپنے ماں باپ کی ذمہ دار بیٹی جو ہوں، میں سب کرسکتی ہوں۔

پہلا آنسو تکیے پر گرا، اسے پھر سے سب کچھ یاد آیا جو کبھی بھولتا ہی نہ تھا۔ یادوں کے دروازے پر اذیت تاک لگائے بیٹھی رہتی کہ جیسے ہی در وا ہو وہ اندر گھس جائے۔ آنسوؤں میں تسلسل جاری ہوگیا۔

"آہ میری ساری عمر کی ریاضت کو ایک پل میں بے مول کردیا گیا۔ میں تو وہ مومن نکلی جیسے دم قضا کفر کا فتویٰ لگادیا گیا۔ اللہ...... میں کیسے بھول پاؤں گی سب، میں تو اپنے لاشے کو گھسیٹتی گھسیٹتی ابھی سے تھکنے لگی ہوں۔ بابا آپ نے بری بیٹیاں تو دیکھی ہی نہیں، اب میں آپ کو دکھاؤں گی بری لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں اور کہاں تک جاسکتی ہیں۔" بے دردی سے آنسو رگڑے۔ دونوں کی سوچیں الگ...... مقاصد بھی الگ مگر راستہ ایک ملا تھا دونوں کو، ساتھ چلنا تو

تھا ہی......

☆☆☆

اب میری مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں اس سب پر کیسے ری ایکٹ کروں؟

معاذ نے قدرے غیر آرام دہ حالت میں صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ وہ عفان کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ عفان اس کا دوست، کولیگ بھی۔ ولیمہ کی رات والی تلخی کے بعد وہ اگلی صبح ہی کبیر احمد کے گھر جا دھمکا۔ بنا کسی سے بات کیے، بنا کسی سے پوچھے۔ وہ پریکٹیکل شخص تھا۔ کبیر احمد اور صالحہ سے صاف، سیدھی بات پوچھ بیٹھا۔ ابھی ماہ نور سے کوئی جذباتی وابستگی نہ تھی اس کی، اس لیے کسی انہونی ہونے کے نتیجے پر راستے سے ہٹنا آسان تھا اس کے لیے۔ اس لیے بڑے سبھاؤ سے بات ان تک پہنچائی۔ وہ سن سے بیٹھے رہے پھر سب کچھ اسے بتا دیا۔ بچپن سے اب تک کی ہر بات، وہ سپاٹ سا سنتا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر عفان کی طرف آیا۔ ابھی اس کی ولیمہ کی تھکن تک نہ اتری تھی کہ دولہا میاں ''مصائب کی ٹوکری'' تھامے اس کے در پر چلے آئے۔ کسی بھی شادی کے اتنے جلد نتائج اس نے پہلی بار دیکھے تھے۔

عفان اپنی گردن سہلاتے ہوئے، ذرا سست انداز میں جبکہ خضر گوندل، ان دونوں کا مشترکہ بیچ میٹ، پوری توجہ سے اسے سنتا رہا۔ وہ پیشے کے اعتبار سے سائیکاٹرسٹ تھا، اس پورے واقعہ میں ماہ نور کی سائیکی نے اسے چونکایا تھا۔ معاذ کی پوری بات سن لینے کے بعد وہ عادتاً اپنے چشمے کو اوپر چڑھاتے ہوئے بولا۔

''اپنے سسر کی پوری بات سنتے ہی تمہارے دماغ میں پہلی بات یا خیال کون سا آیا؟''

''مجھے افسوس ہوا...... میرا مطلب ہے انکل جیسے پڑھے لکھے شخص سے مجھے کم از کم یہ امید نہ تھی۔ انہیں اپنی بیٹی کو اعتماد میں لینا چاہیے تھا، اس سے بات کرنی چاہیے تھی جبکہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ اس لڑکے میں انٹرسٹڈ نہیں ہے۔ اگر وہ کھل کے آپس میں بات کر لیتے تو شاید نوبت یہاں تک نہ آتی اور پھر بنا کچھ پوچھے اور بنا کچھ بتائے اس کی شادی طے کر دی گویا اپنی بداعتمادی کی سند تھما دی اس کے ہاتھ میں، نکاح نامے کی صورت۔''

وہ کرسٹل ٹیبل پر اپنا فون انگلی سے گھماتا رہا۔ خضر کے چہرے پر جوش لہرایا، وہ مزید آگے ہو کے بولا۔

دیکھو معاذ! تمہاری بیوی اسپلٹ پرسنالٹی کا شکار ہو رہی ہے اس وقت۔ اسپلٹ پرسنالٹی مطلب دوہری شخصیت، ایک نفسیاتی بیماری۔ متعدد قسمیں ہیں اس بیماری کی مگر اس کیس میں معاملہ تھوڑا الگ ہے۔ ایک بندے کا قطعی مثبت رویے سے قطعی منفی رویے کی طرف مائل ہو جانا، یہ الارمنگ سچوئشن ہے۔ انہیں اس مقام پر پہنچانے میں ان کے ماں باپ کی غفلت بھی شامل ہے۔ تم خود سوچو ایک مزدور جو سارا دن کی سخت مشقت کے بعد تین چار سو کما کے گھر لوٹ رہا ہو اور کوئی جیب کترا ہاتھ کی صفائی دکھا جائے، اوپر سے گھر والے مزدور کو ہی وہ جیب کترا سمجھیں تو سارا دن اینٹ سیمنٹ کرنے والا مزدور وہی اینٹ اٹھا کے مار دینے کی پوزیشن میں آ جائے گا ناں اور یہی ہو رہا ہے اب بھابھی کے ساتھ بھی۔

میں نے اسی لیے پہلے یہ پوچھا کہ تم نے کیا سوچا۔ دراصل میں تمہاری اٹیچشن جاننا چاہ رہا تھا۔ اگر بے زاری کا اظہار کرتے تو مشورہ ہوتا کہ لڑکی کو چھوڑ دو۔ لیکن اب چونکہ تم انٹرسٹڈ ہو اس لیے ان کا علاج بھی تم ہی ہو۔ تم یوں سمجھو کہ تمہارے گھر قدرت کی طرف سے ایک پارسل آیا ہے جس پر بڑا بڑا ہینڈل ود کیئر لکھا ہوا ہے۔ اب تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہیں آگے کیا کیا کرنا ہے۔''

عفان بھی ساری سستی بھلائے بیوی کو رام کرنے کے نسخے بننے لگا۔

☆☆☆

ماہ نور اپنی زندگی کی ہر صبح کو تاخیر میں رکھنا چاہتی تھی مگر وقت جیسے اس سے ضد باندھ بیٹھا تھا، ٹلتا ہی نہ۔ معاذ جانے کب سے باہر تھا، وہ بھی باہر نکل آئی۔ سارے گھر میں خاموشی کا رقص جاری تھا مگر ہولانے والی نہیں...... سکون دیتی خاموشی۔ ایک جانب سے اسے آوازیں سنائی دیں وہ ادھر چل دی۔ گھر بہت بڑا تھا یقیناً — بہت خوب صورت بھی۔ ستائش اس کی نگاہوں میں خود بخود آ بسی۔

ڈائننگ روم کے داخلی دروازے پر وہ رکی۔ سامنے سائرہ آنٹی ملازمہ کے ساتھ کچن میں کھڑی نظر آئیں جبکہ عبید انکل اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔ وہ اجنبیوں کی طرح یہاں وہاں دیکھنے لگی، سائرہ آنٹی کی نگاہ پڑی۔

''ارے ماہ نور بیٹا! آپ اٹھ گئیں؟ وہاں کیوں کھڑی ہیں، ادھر آیئے۔'' بہت خوب صورت لب و لہجہ، سب سے بڑھ کر وہ خلوص جو زبان سے لے کر نگاہوں تک میں تھا۔ ساری اکھڑ مزاجی، انگلیاں دانتوں میں دبائے، ڈائننگ روم کے دروازے پر ہی کھڑی رہ گئی اور وہ آگے بڑھ گئی۔ آنٹی نے گلے لگایا، سر چوما۔ پکڑ کے انکل کے برابر صوفے پر بٹھا دیا، وہ انگلیاں چٹخانے لگی۔

''بلقیس! ماہ نور کا ناشتا ادھر ہی لے آؤ۔'' ماہ نور سٹپٹائی۔ انکار کرنا چاہتی تھی مگر انہوں نے کچھ پوچھا ہی نہ تھا۔ اس نے بھی غصہ مصلحت کے صندوق میں بند کیا اور ناشتا کرنے تک انکل اس سے ہلکی پھلکی بات کرتے رہے وہ بھی جواب دیتی رہی۔ آنٹی نے کچن سمیٹا اور چائے لے کر ان کے ساتھ شامل ہو گئیں۔ لگتا ہی نہ تھا کہ اس گھر میں کوئی شادی ہوئی ہے۔ ہر شے قرینے سے اپنی جگہ پر موجود...... ماہ نور فطری طور پر متوجہ ہوئی۔ سائرہ آنٹی خوب صورت خاتون تھیں۔ ماہ نور متاثر ہوئی، اور لاشعوری طور پر مطمئن بھی۔

☆☆☆

معاذ رات ڈھلے گھر لوٹا۔ انکل بھرے بیٹھے تھے۔ خوب گوشمالی کی۔ وہ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا پھر......

''اماں، بابا! آپ سے بات کرنی ہے، ذرا آیئے گا۔'' کہہ کر اسٹڈی روم میں گھس گیا۔ کال آئی تو وہ ادھر متوجہ ہو گئی۔ رات دیر تک وہ اسٹڈی روم میں ہی مصروف رہا، ماہ نور سو گئی۔

☆☆☆

معاذ نے آفس جانا شروع کیا۔ انکل نے یونیورسٹی۔ سائرہ آنٹی کہیں نظر نہ آئیں تو وہ گھبرا کے باہر نکل آئی۔ آنٹی لان میں پودوں کے ساتھ مصروف نظر آئیں تو وہیں چلی آئی۔ ستمبر کے ابتدائی دن تھے۔ ساون کی صبح ذرا ٹھنڈی سی تھی۔ ماہ نور کو لان بہت اچھا لگا۔ ہر قسم کے پھل کا درخت تھا، پھول بھی کافی تھے۔ اسپینش گھاس بہت مخملیں سی تھی۔ ماہ نور کو بے ساختہ اپنے گھر کا لان یاد آیا، جہاں موسمی پودے تو بڑے شوق سے لگائے جاتے مگر مصروفیات نے کبھی لان کو پر رونق نہ ہونے دیا۔ ماما کا خیال تھا کہ لان کو ختم کر کے سوئمنگ پول بنوا لیا جائے مگر بابا متفق نہ تھے۔

ماہ نور بیٹا! کچھ چاہیے تھا؟'' سائرہ آنٹی نے سفید گلاب کے پودے پر ایک سفوف چھڑکتے ہوئے پوچھا۔

''جی نہیں، میں تو ایسے ہی......'' اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔

''ذرا یہ سرخ گلاب تو دیکھیں۔ اگر کانٹ چھانٹ کی ضرورت ہے تو کر دیں ورنہ یہ گروور چھڑک دیں تنوں پر۔'' وہ خاموشی سے پودے دیکھنے لگی۔ سائرہ نے جانچا وہ محنتی تھی، ذمہ دار اور صاف دل بھی۔ وہ اسے مصروف کرنا چاہتی تھیں۔ معاذ نے بھی یہی کہا تھا انہیں، اسے گھر پسند تھا۔ اچھا گھر اس کی کمزوری تھی اور وہ اسے گھر میں ہی مگن کرنے والے تھے۔ وہ اسے نارمل کرنا چاہتے تھے۔ آہستہ آہستہ، نہ بہت اچھی، نہ بہت بری۔ بس ایک عام انسان۔ اب وہ اسے عرق گلاب بنانا سکھا رہی تھیں اور وہ تندہی سے سیکھ بھی رہی تھی اور کامیاب لوگ وہی ہوتے

گلے کا قیمتی ہار۔۔۔ بنا رشتوں میں دراڑ

یہ کہانی پرانی روایات میں بندھے ایک ہی خاندان کے افراد کے گرد گھومتی ہے جن کو اپنی خاندانی حویلی کے بڑوں کی ضد، ہٹ دھرمی، غلطی، نفرت، سازش اور بے حسی کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ خاندان کے ان بڑوں میں سب سے گھناؤنا کردار ممتاز اور نور جہاں ادا کرتی ہیں، جو رشتے میں نند بھاوج ہیں۔ دونوں خواتین حویلی کے وارث اکبر علی کو خاندانی وراثت میں ملے سو سال پرانے ہار "نولکھا" کے عشق میں گرفتار ہیں۔ اس ہار کے حصول کی ضد اور تسلط کے چکر میں یہ دونوں خواتین اپنے اگلی نسلوں کی محبتوں اور رشتوں کو برباد کرنے سے بھی نہیں چوکتیں حویلی کا انتظام اکبر علی نے بصد احترام اپنے سب سے بڑے بھائی انور علی کے سپرد کیا ہوا ہے جو باقی افراد کے درمیان آگ لگا کر اسے ہوا دیتا ہے تاکہ وہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہو سکے۔ زین علی اکبر علی کا اکلوتا لاڈلا بیٹا ہے جو اپنی پھوپھی زاد کزن تحریم کو پسند کرتا ہے۔ تحریم ایک سلجھی ہوئی لڑکی ہے جو دقیانوسی باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔ وہ بھی دل ہی دل میں زین کو پسند کرتی ہے۔ زین کی پھوپھو ممتاز بھی دونوں کی شادی کی خواہاں ہے لیکن اس شادی کو اپنے خاندانی ہار کے حصول و تسلط کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے۔ زین کی چچازاد کزن شفق زین کی دلہن بننے کے خواب بچپن سے ہی دل میں بسائے ہوئے ہے۔ دراصل شفق کی ماں نور جہاں نے شفق کی آنکھوں میں یہ خواب سجائے ہیں کیوں کہ اس کی پیدائش کے بعد نور جہاں کے سسر منظر علی (مرحوم) نے اپنے اکلوتے پوتے زین سے بچپن میں ہی شفق کی بات پکی کر دی تھی۔ نور جہاں کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے لیکن حویلی میں بہت رتبہ حاصل ہے۔ نور جہاں شفق کے ذریعے اس خاندانی ہار کا حصول چاہتی ہے۔ کیوں کہ روایت کے مطابق "نولکھا" زین کی بیوی کو ملے گا۔ شفق اور تحریم میں بہت اچھی دوستی اور پیار ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتیں لیکن دونوں نے ہی زین سے متعلق اپنے دل کی بات ایک دوسرے سے چھپائی ہوئی ہے۔ دونوں میں بہنوں جیسا پیار ہے جوان دونوں کی ماؤں کو کھٹکتا ہے۔ نور جہاں اور ممتاز ایک دوسرے کو اپنا ازلی دشمن سمجھتی ہیں۔ دل کی بات بتانے میں پہل شفق کرتی ہے تو تحریم کو احساس ہوتا ہے کہ زین سے شادی کر کے وہ شفق کے حق پر ڈاکہ ڈالے گی۔ تحریم شادی سے انکار کر دیتی ہے تو زین اپنی ضد پر اڑ جاتا ہے۔ شفق کو زین کے ارادوں کا پتہ چلتا ہے تو تحریم کی طرف سے اس کے دل میں بال آ جاتا ہے۔ شفق اور تحریم میں بہت دوریاں آ جاتی ہیں۔ زین کی حالت خراب ہوتی ہے تو شفق اپنے دل پر پتھر رکھ کر تحریم کو زین سے شادی کرنے پر راضی کرتی ہے۔ تحریم کی زین سے شادی کی صورت میں نولکھا ہار ممتاز کے ہاتھ لگ سکتا ہے۔ نور جہاں ہر ممکن کوشش کرتی ہے وہ ہار حویلی میں واپس آ جائے لیکن بے سود۔۔۔ تحریم دل کے ہاتھوں مجبور ہے مگر شفق کا حق مارنے کا پچھتاوا اسے ہر دم رہتا ہے۔ شفق اور تحریم میں دوریاں کم نہیں ہو پاتیں۔ رقابت کے جذبے تلے دونوں اپنی اپنی ماؤں کی طرح ایک دوسرے کو اپنا ازلی دشمن سمجھنا شروع کر دیتی ہے۔ نولکھا ہار کو حاصل کرنے کے لیے یہ خاندان تمام انسانی قدروں کو بھول کر بری طرح منتشر ہونے لگتا ہے۔ خون میں خون کے خلاف زہر ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ دوستیاں دشمنی میں بدل جاتی ہیں۔ بدگمانی کے ناگ سر اٹھاتے ہیں اور انسانیت ذلت کے گڑھے میں گرنے لگتی ہے ایسے میں کہانی میں ایک زبردست موڑ آتا ہے جہاں سے کہانی ایک ناقابل فراموش انجام تک پہنچتی ہے۔

نولکھا ہار کس کی قسمت میں لکھا ہے؟

آخر کار زین کو جیتنے میں کون کامیاب ہوگا۔۔۔ شفق یا تحریم؟

Tuesday **8:00** pm

#TvOnePK

TV ONE

#TvOnePK



نولکھا

کاسٹ: ثروت گیلانی، کرن حق، بشریٰ انصاری، بہروز سبزواری، مرزا زین بیگ، گلِ رعنا، ثناء عسکری، حارث وحید اور ارجمند حسین۔

تحریر: ثناء شبیر، ریما علی سید۔ پروڈیوسر: عبداللہ کادوانی، اسد قریشی۔ ڈائریکٹر: شہزاد

ہیں جنہیں سیکھنے کا عمل ہمیشہ اچھا لگتا ہے۔

"آنٹی آپ نے میڈیسن میں ڈگری لی تو پریکٹس کیوں نہیں کی؟"

وہ لاؤنج میں چلی آئیں۔ آنٹی نے ہاتھ میں پکڑے جگ میں سے سیب کا جوس گلاس میں انڈیلا۔ اس کی معلومات پر حیران ہوئیں اور گلاس اسے تھمایا۔

"بس بیٹا! نا اہلی کہہ لیں یا کچھ اور...... میں دراصل دہری ذمہ داریوں سے ہمیشہ کتراتی ہوں۔ میرے امی، ابا، بہن، بھائی سب ڈاکٹر۔ سب نے مجھے زبردستی اس تعلیم میں دھکیلا، حالانکہ میں تو شروع سے ہی لان، کچن اور بیک یارڈ (پچھلا صحن) کی دیوانی تھی۔ اسٹور روم میں گھس کر اس کی صفائی کرتا بلکہ صفایا کرتا" ہنستے ہوئے "وہاں سے جو کچھ ملتا میں ـــ اپنے کمرے کی دیواروں سے چپکا دیتی، رفتہ رفتہ میرا کمرہ...... کمرہ کم، عجائب گھر زیادہ دکھنے لگا مگر مجھے گھر سے جنونی سا عشق تھا اور ابھی بھی یہ عشق قائم ہے۔ بہت ٹیلنٹڈ ہوتی ہیں وہ عورتیں جو گھر اور جاب ساتھ ساتھ لے کر چلتی ہیں مگر میں صرف اس گھر میں قید رہنا چاہتی ہوں۔ لوگوں کو یہ سوچ حیران کرتی ہے مگر کیا کیا جائے، ہماری سوچ ہی کنویں کے مینڈک جتنی ہے جس کا سارا آسمان صرف یہ گھر ہی ہے۔" ماہ نور سنتی رہی۔ کیا رب نے اتنے حالات سے اس لیے گزارا کہ وہ اس گھر میں آسکے۔ ایسے گھر کی خواہش تو ہمیشہ سے اس کے اندر تھی۔ وقت کبھی نہیں چاہتا کہ کوئی اس کی دو پاٹوں والی گھومتی چکی سے نکلے۔ ماہ نور کے لیے کوئی بھی فیصلہ مزید مشکل ہوگیا۔

چلو آؤ، تمہیں بیک یارڈ دکھاؤں۔ معاذ کہتا ہے پنجاب کی پچھتر فیصد کاشتکاری ہمارے بیک یارڈ میں ہی ہوتی ہے اور وہ ایسا تب کہتا ہے جب...... آوازیں مدھم ہوتی گئیں۔ ماہ نور کی سوچ کو روک دیا گیا تھا۔

☆☆☆

ساون کبھی چھاجوں چھاج برستا تو کبھی دھرتی کو پیاس سے پاگل کیے رکھتا۔ آج بھی موسم میں پھر سے نمی اترنے کو تھی۔ سورج بھی آج بادلوں کے تیور جانچ کے افق پار منہ چھپائے بیٹھا تھا۔ ہوا تیز تھی۔ ماہ نور ٹیرس کے کاؤچ پر بیٹھی تھی، چائے کا کپ قریب دھرا تھا۔ سامنے والے بنگلے میں مسز احمد اپنے بیٹوں کے ساتھ مگن تھیں۔ جب وہ گھر کے اندرونی حصے کو بڑھ گئے تو وہ سر جھٹک کے سیدھی ہوئی۔ آج وہ کچھ زیادہ ہی اداس تھی۔ عبید انکل اس کی کتابیں لے آئے تھے اور یونیورسٹی ساتھ چلنے کا حکم نامہ بھی تھمایا تھا۔ وہ شدید مشکل کا شکار نظر آئی، کیا کرتی؟ علوینہ، زارا، اسجد کا سامنا کیسے کرتی۔ دوسروں کو جلد شادی کی وجہ کیا بتاتی۔ اس کے لیے میتھ فیلڈ سائنٹسٹ بننا تو جیسے خواب ہوگیا۔ اب وہ گھر میں مگن ہونا چاہتی تھی تو پھر سے اسی مقام کی طرف دھکیلنا شروع کردیا گیا تھا۔

اس نے سر ہاتھوں میں گرالیا۔ معاذ سے تعلقات ہنوز سرد تھے۔ وہ اسٹڈی روم میں سوتا، کمرے کی صرف وارڈ روب استعمال کرتا۔ وہ نارمل ہونا بھی چاہتی تو بہت سے مسائل سر اٹھائے کھڑے تھے۔ اک ذرا سی غلط فہمی نے زندگی کو آزمائشوں کے سپرد کر ڈالا تھا۔ آہٹ پر اس نے سر اٹھایا' سائرہ کاؤچ کی دوسری جانب بیٹھی تھیں۔

"آپ پریشان ہیں بیٹا؟ کوئی پرابلم ہے تو حل کرلیتے ہیں۔" انہوں نے اس کے بال سہلائے، ماہ نور کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ کچھ توقف کے بعد وہ بھاری آواز سے آہستہ آہستہ سب بتانے لگی۔

"اب ان حالات میں آپ ہی بتائیں کہ میں کیا کروں؟ کیسے سب کا سامنا کروں؟ اس سب میں بھلا میرا کیا قصور؟" آخر میں وہ جھنجلائی۔

"آپ دراصل اس لڑکے سے خوف زدہ ہیں، اس کا سامنا کرنے سے ڈر رہی ہیں۔ بیٹا! ریسرچ یہ کہتی ہے کہ مرد کا محرک اس کی آنکھ ہے۔ عورت کو دیکھتے ہی اس کے اندر لاشعوری طور پر تبدیلیاں ہوتی ہیں،

وہ تبدیلیاں فطری ہیں۔ اگر آپ کو سن الرجی ہے تو کیا سورج بجھا دیں گی؟ نہیں...... بلکہ کوئی راستہ ڈھونڈیں گی اس سے بچنے کا۔ اب وہ کیا راستہ ہوگا یہ آپ پر منحصر ہے۔ مگر زندگی میں آگے بڑھنا، کامیابیوں میں سے اپنا حق وصولنا آپ کا حق ہے۔

زمانے کے خوف سے آپ کو اپنی منزل نہیں بدلنی چاہیے، ہاں اگر راستہ تکلیف دیتا ہے تو اسے چھوڑ کر کسی اور راستے ہولیں۔ مگر فیلڈ سائنٹسٹ تو آپ کو بننا ہی ہوگا۔ یہ میرا، آپ کے انکل اور معاذ سب کا مشترکہ خواب ہے۔" وہ مسکرائیں۔

"بیٹا! زندگی میں دوبارہ کبھی مت سوچیے گا کہ زندگی میں آپ کے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا۔ زندگی سب کو ایک سا سوال نامہ نہیں دیتی کہ جس پر ایک سا نپا تلا فارمولا لگایا اور...... سوال و پرچا ختم۔ زندگی سب کو الگ الگ سوالات سے دوچار کرتی ہے اور فیصلہ آپ پر چھوڑ دیتی ہے کہ کون سا فارمولا لگا کر اسے حل کرنا ہے۔" سائرہ آنٹی نے اسے خود سے لگایا، پھر اٹھیں۔

آنٹی!" اس نے پکارا۔ وہ رکیں۔ "آنٹی! عورت کا کیا ہوتا ہے؟" وہ معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

"کان۔" وہ بولیں۔

کیا؟ وہ حیران ہوئی۔

"کان ہوتے ہیں بیٹا! جو مرد جتنا چرب زبان ہوگا، خواتین میں اتنا ہی مقبول ہوگا۔ عورت مرد کی آنکھیں، گال، ہونٹ نہیں دیکھتی...... وہ اس کی باتوں پر، وعدوں پر مٹ جاتی ہے۔" ماہ نور نے مسکرا کر ان کی پیروی کی۔

☆☆☆

اس نے یونیورسٹی جانا شروع کیا۔ خود کو بڑی سی سیاہ چادر میں چھپالیا۔ اس کے بدلے ہوئے رنگ دیکھ کر سب الجھ گئے۔ سب سمجھے کہ شوہر دقیانوسی سوچ والا ہے۔ دل آزاری کے خوف سے خاموش رہے۔ زارا اور علوینہ بھی اس کی سنجیدگی دیکھ کر محتاط رہیں۔ صالحہ اور کبیر احمد اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ صالحہ نے اپنی ناگواری کو دبایا اور اپنے آفس میں بلا کر سمجھاتی رہیں۔ ماہ اور ماہ رخ نے اسے معاذ کی محبت سمجھا۔ اس سب کے باوجود ماہ نور نے خود کو پرسکون محسوس کیا۔

صالحہ اسے گھر آنے کی دعوت دیتی رہیں تاکہ حالات جان سکیں۔ کبیر احمد کے آنے پر وہ اٹھ گئی۔

☆☆☆

اتوار کا دن تھا۔ فراغت کے لمحات میں سب ہی سستی دکھا رہے تھے۔ انکل دوستوں سے ملاقات کے بعد اب اسٹڈی روم میں بیٹھے تھے۔ ماہ نور فریش سی اپنی کچھ کتابیں لیے لاؤنج میں چلی آئی۔ معاذ کمرے سے نکل کر فون پر بات کرتے ہوئے صوفے پر نیم دراز ہوا۔ اب وہ چینل بدلنے میں مصروف تھا۔ ماہ نور کو کوفت سی ہوئی اسے دیکھ کر۔

وہ بہت نفیس طبیعت کا تھا، ان لوگوں میں سے تھا جو رات کو بھی سفید بے شکن لباس اور بال باقاعدہ سیٹ کر کے سوتے ہیں۔ طبیعتاً بھی سلجھا ہوا تھا، شاور لیتا تو باہر نکلنے سے پہلے واش روم باقاعدہ وائپ کرتا۔ اپنے میلے کپڑوں، موزوں کو ان کی مخصوص جگہ پر رکھتا۔ کھانے کے بعد ایکسکیوز کرتا پھر جگہ چھوڑتا۔ برتن یہاں وہاں کبھی نہ چھوڑتا، گویا وہ مہذب قسم کا شخص تھا۔ بس ایک خرابی تھی وہ جہاں، بیٹھتا وہیں آرکیٹکچر کی کتابیں پھیلائے رکھتا۔ بہت دنوں کے مشاہدے کے بعد وہ بالآخر جان ہی گئی، وہ شعوری طور پر کتابیں پھیلاتا تاکہ وہ جہاں بیٹھے اسے پڑھنے کے لیے کوئی کتاب میسر ہو۔ وہ اس بات حیران ہوئی تھی، اب وہ عفان سے کچھ بات کر رہا تھا، سامنے کچھ فائلز کھلی تھیں۔

"اچھا عفان! فاروق فیبرک اسٹوریج کا کنٹریکٹ ملا ہے چھ شہروں میں۔ ہاں میں تمہیں ایلویشن وغیرہ ای میل کرتا ہوں۔ کالمز کی ترتیب اور ان کا ڈایا میٹر حمزہ کو کہو فوراً کیلکولیٹ کرے پھر میں فاؤنڈیشن لے آؤٹ بنا کے کل آفس کے بعد ملتا

ہوں۔اچھا سنو، باٹم 4-8 کا ہے اور لافٹر ون بائے ون کا۔حمزہ سے تفصیلی بات کرنا، نہیں یار! چھٹی نہیں کرسکتا۔کل آواری کا گراؤنڈ فلور دیکھنے جانا ہے، ان کا پہلے تھائی گرانڈ فلور تھا اب اطالوی کرسٹل فلور بنوا رہے ہیں۔نقیب صاحب نے اس بار پھر مجھے اسائن کردیا ہے، اب دیکھو......"

باتیں کرتے ہوئے وہ اٹھ گیا تو ماہ نور تیزی سے کھلی ہوئی فائلز تک آئی۔ وہ مختلف نقشے دیکھنے لگی، خاصی بھاری بھرکم تعمیراتی اصطلاحات تھیں جو اس کے سر کے اوپر سے گزر گئیں، وہ مزید الجھ گئی۔ اٹھ کے واپس اپنی جگہ پر آئی۔عبید انکل کمرے سے نکل کر آئے تو وہ تیزی سے ان تک آئی۔

"انکل یہ اِل لیگل ہے ناں۔کمپنی کے ساتھ وعدہ خلافی۔ مطلب اپنی کنسٹرکشن کمپنی چلانا۔"عبید انکل مسکرائے۔

"بیٹا! یہ تو شیڈز ہیں، مطلب کینیڈین طرز تعمیر پر ہے۔ بڑے بڑے شاپنگ مالز اور اسٹور رومز اور آفسز۔ یہ بہت مختلف طرز کے ہوتے ہیں، ان کی تعلیم بھی الگ ہے۔ معاذ نے کینیڈین یونیورسٹی "کے جے یو" سے ڈیڑھ سال کی ڈگری لی ہے۔ کمپنی کو اس پر بھلا کیا اعتراض ہوگا۔"وہ ہنسے۔"اور آپ کو لگا اِل لیگل کمپنی چلاتا ہے وہ...... ارے اتنی ہمت نہیں ہے، ہمارے بیٹے میں۔خاصا ڈرپوک سا ہے۔"

کمرے سے نکلتے معاذ کو دیکھ کر شرارت سے بولے۔ماہ نور پریشان ہوئی، اگر انکل نے راز کھول دیا تو......؟ اتنے میں ڈور بیل بجی۔معاذ ادھر گیا۔ دروازہ کھولنے پر ایک نسوانی چیخ سنائی دی اور معاذ کی آواز۔

"عمائمہ باجی!" انکل اور ماہ نور قدرے پریشان سے دروازے کی طرف گئے۔ داخلی دروازے کی قریب اکتیس بتیس سالہ قدرے فربہی مائل، سرخ وسفید لڑکی آنسو آنکھوں میں بھرے معاذ کے پہلو سے لگی کھڑی تھی۔ بچوں کو معاذ بہت پیار کررہا تھا۔انکل اور آنٹی نے بھی کم وبیش معاذ والا ردعمل دکھایا۔وہ بے تحاشا خوش نظر آرہے تھے، اسے لیے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔

معاذ ابھی بھی دونوں بچوں کو اٹھائے ان کے بال بار بار چوم رہا تھا۔اسے بچے بہت پسند تھے اور معصب اور خشم میں تو اس کی جان تھی۔

"ماذ از شی یور ڈارلنگ؟"چھوٹے لڑکے نے آنکھیں پٹپٹا کے کہا۔معاذ کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"مائے گاڈ خشم کو ابھی بھی یاد ہے؟ ہاں یہی ہے ناں ڈارلنگ! کیوں اچھی ہے؟"

وہ قریب سے گزرتا خشم سے پوچھ رہا تھا۔ماہ نور سرخ ہوگئی۔

"یاہ کوائٹ بٹ شی از ٹو تھن (ہاں بہت مگر یہ پتلی ہے)۔"معاذ نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا۔

"پھر میں اب کیا کروں؟"وہ نجانے کیوں ٹھنڈی سی ہوگئی۔بچوں کے تبصرے سے خائف وہ ڈرائنگ روم میں جانا ہی نہ چاہتی تھی۔بلقیس اسے بلانے چلی آئی تو وہ ہاتھ مسلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔عمائمہ نے بغور دیکھا۔وہ ان کو سلام کرکے دروازے کے پاس والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"اف کتنی کیوٹ ہے یہ تائی اماں! کہاں سے ملی؟"وہ ہنستے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ سائرہ آہستہ آہستہ کبیر احمد کی فیملی کا بتانے لگی۔اب عمائمہ سب سے شکوہ کررہی تھی کہ وہ تین ماہ کے لیے ماریشس کیا گئی آپ نے پیچھے سے شادی بھی نبٹالی۔معاذ اور سائرہ آنٹی وضاحتیں دے رہے تھے۔انکل بار بار اسے خود سے لگاتے، ماہ نور خاموش بیٹھی رہی۔ معصب اور خشم اسے دیکھ کر مسکراتے پھر معاذ کے کان میں کچھ کہتے۔وہ ہنسی ضبط کرنے کے چکر میں گلابی ہوجاتا۔سائرہ آنٹی اٹھ کر کچن میں چلی گئیں، انکل کا ضروری فون آگیا۔معاذ قدرے کھسک کر عمائمہ کے اور قریب ہوگیا۔دونوں پکی سہیلیوں کی طرح باتیں کرنے لگے۔

"کیسا رہا تمہارا ٹور؟"

"کیسا رہنا تھا، تمہیں پتا تو ہے یاسر کا۔ کہیں پکنک یا آؤٹنگ کا کہنے پر ہزار بار سوچتے ہیں اور بات پر ٹوکتے ہیں۔بس میں تو تھک گئی۔"

"کیوں ہر وقت یاسر کو کنجوس کہتی ہیں۔ وہ کفایت شعار ہے اور بس۔ایک سیلف میڈ آدمی ہے۔میرے سامنے ہی تو زیرو سے شروع کیا تھا اس نے۔لنچ کے نام پر صرف دو گلاس پانی پیتے ہی دیکھا ہے اسے اور آج وہ بزنس امپائر بنائے بیٹھا ہے مگر آپ بالکل تعاون نہیں کرتیں اس سے۔"

"میری تو چلتی ہی رہے گی تم اپنی سناؤ۔ بیوی تو بالکل نہیں بولتی تمہاری۔"معاذ نے ٹھنڈی آہ بھری۔

اس کے سب جھوٹ سچ سہی محسن
شرط اتنی ہے وہ بولے تو سہی

وہ گھبرا کے اٹھی اور آنٹی کے پاس کچن میں چلی آئی۔سلاد بنانے لگی۔آنٹی کا موضوع سخن عمائمہ کی ذات ہی رہی۔

"بہت محبت کرتا ہے یاسر اس سے۔ ہتھیلی کا چھالا بنا کے رکھا ہوا ہے۔یہ بھی بہت چاہتی ہے اسے، اس کے بغیر کہیں جا کر رات رہنا محال ہے اور اگر وہ کہیں چلا جائے تو دوسرے دن ہی رونا شروع۔

وہ دوسرے دن ہی واپس آجاتا ہے۔ ہمیشہ ناشکری رہتی ہے یہ۔ میں سمجھا سمجھا کے تھک گئی ہوں کہ مرد ہر قسم کی عورت کو دل میں بسا سکتا ہے مگر بدزبان اور ناشکری عورت کے لیے یہ آفر محدود مدت کے لیے ہوتی ہے۔ پھر ایسی عورت کو مرد گھر میں تو جگہ دے دیتا ہے مگر دل میں ہرگز نہیں۔"

ماہ نور کے ہاتھوں سمیت دل بھی تھم گیا۔ گھر میں تو وہ بھی کسی کے رہ رہی تھی اور دل...... جو عورت کے گھر میں رہے بنا اس کے دل میں رہے۔ وہ عورت کیا ہوتی ہے، میں کیا کرتی رہی؟ مجھے کیا کرنا تھا؟ سب گڈمڈ ہوگیا ہے۔ میری سوچ، میرے میرا دل تک بدل گیا ہے۔ مجھے تو کیا سے کیا تھا اور میں خود کیا سے کیا ہوگئی۔ میں کچھ بھی نہیں واقعی کچھ نہیں کرسکتی۔ خودترسی ایک بار پھر عود کر آئی۔ دنیا میں سب سے ناکام شخص وہ ہے جو خودترسی کا شکار ہے۔ وہ بھی خود کو ہمیشہ مظلوم ہی دیکھنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

ماہ نور کے بی ایس میتھ میٹکس کا آخری سمسٹر شروع ہوا تو انکل ابھی سے کچھ معتبر ادارے دیکھنا شروع ہوگئے اور شام کو وہ انکل کے ساتھ ٹاک شو دیکھتے ہوئے خود کو زیر بحث لانے پر شرمندہ ہوتی کہ اپنی سوچوں کو وہ خود جانتی تھی۔

"آج وہ سائرہ آنٹی سے پیزا کی "ڈو" بنانا سیکھ رہی تھی۔"دوپٹہ ٹشو پیپر اسٹینڈ پر پڑا تھا۔ آمیزہ سانچے میں ڈال کے وہ اوون میں رکھنے لگی۔ معاذ آفس سے لوٹا تو عادتاً کچن میں جھانکا۔ ہاتھ میں تھامے فولڈرز، کچھ تعمیراتی اسکیچز اور لیپ ٹاپ لاؤنج میں صوفے پر رکھے اور شرٹ کی آستین فولڈ کرتا کچن میں آیا۔

"السلام علیکم! بڑی اچھی خوشبو آرہی ہے اماں! کیا بنارہی ہیں؟"ایک ہاتھ سے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا، جواب کا انتظار کیے بنا وہ دوسرے ہاتھ سے ڈھکن اٹھا کے خود دیکھنے لگا۔ ماہ نور نے بغور اسے دیکھا۔ اب وہ کاؤنٹر سے گلاس اٹھا کے سنک میں دھونے لگا تھا ——— ہر روز آفس سے آنے کے بعد وہ معمولی سے معمولی تبدیلی کی بھی وجہ پوچھتا، فوراً متوجہ ہوتا۔ فریج سے پانی کی بوتل لیے اس کے سامنے کچن ٹیبل کے گرد بیٹھا۔

"اور تم پارٹنر...... تم کیوں اتنی گلابی ہورہی ہو؟"ماہ نور اپنا دوپٹہ اٹھانے لگی۔ سائرہ آنٹی سلاد کی پلیٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولیں۔

"یہ آج پیزا کی ڈو بنانا سیکھ رہی ہے۔"وہ ستائشی انداز میں ابرو اٹھا کے سلاد کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اوون کی اطلاعی گھنٹی بجی تو وہ اٹھ کے دیکھنے لگی۔ سائرہ آنٹی اور معاذ بیک وقت متوجہ تھے لیکن وہ یوں ہی جمی کھڑی رہی۔ سائرہ آنٹی آگے آئیں۔

"ماہ نور! بیٹا ایسے کیوں کھڑی ہو؟"انہوں نے

کندھوں سے تھام کر رخ موڑا۔ وہ بے جان سی پلٹی۔ ہاتھ میں پیزا والی ٹرے تھی اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ سیال گر رہا تھا، سائرہ آنٹی پریشان ہوئیں۔
"ایسے کیوں رو رہی ہو، کیا ہوا؟" معاذ بھی اپنی جگہ سے اٹھا۔ وہ آج تک کبھی اس کے سامنے نہ روئی تھی مگر یہ آنسو کئی دنوں کی کشمکش کا نتیجہ تھے۔
"یہ خراب ہوگئی۔" آہستہ سے بتایا۔ "ڈو لکڑی کا تختہ بنی ہوئی تھی۔ معاذ نے بے ساختہ اپنی مسکراہٹ چھپائی۔ آج وہ پھٹ پڑی۔
"میں زندگی میں کچھ نہیں کرسکتی۔ کچھ بھی نہیں۔ جو کرنا چاہتی ہوں ہمیشہ الٹ ہوجاتا ہے۔ میں نے — اتنا نقصان کیا آپ کا۔ میری قسمت ہی ایسی ہے۔" الفاظ بے ربط تھے، جملے بے ترتیب۔ مزید الفاظ بولنا اس کے لیے قیامت ہوگیا۔ وہ کرسی پر دھم سے بیٹھی اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ سائرہ آنٹی اسے پیار سے چپ کروا رہی تھیں۔
"ابھی تم نے کہا کہ تمہاری قسمت ہی خراب ہے۔ محترمہ آنکھیں کھول کر دیکھو اور ذرا سوچو ان لوگوں کے بارے میں جن کو ڈو کے لفظی معنی اور تعریف تک معلوم نہیں۔ لیکن اللہ نے تمہیں اتنا نوازا ہے کہ کل رات تک بھی یہاں کھڑی مشق کرتی رہو تو تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں۔ یہ تمہارا گھر ہے، اسے سرائے سمجھنا چھوڑ دو اور اپنی اس خود ترسی کی عادت کو بھی۔"
وہ ڈانٹنے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ماہ نور کے آنسو خشک ہوگئے، بس ہچکیاں لیتی رہی۔ وہ ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ آنٹی اسے پیار سے سمجھانے لگیں مگر وہ معاذ کے رویے پر اٹک گئی تھی۔

☆☆☆

دن خاموشی سے گزرتے رہے۔ نومبر بھی آدھا گیا تو رات کی دیکھا دیکھی دن نے بھی اپنے اطوار و لہجے میں سرد پن بھر لیا۔ ماہ نور مگن تھی بلکہ خوش تھی۔ یہ گھر اس کے لیے ایسی بھول بھلیاں ثابت ہوا تھا جس میں گم ہوجانے کا خود جی چاہے۔ پانچ ماہ پہلے کی سوچیں اسے شرمندہ کرتیں، بالآخر میں نے جان لیا کہ زندگی میں کچھ چیزیں حادثات کے نتیجے میں ہی مل جاتی ہیں۔ جیسے ہیروں کی کانیں اکثر کوئلے کی کانوں میں چھپی ہوتی ہیں، ویسے ہی اللہ ہمیں کبھی کبھی کسی ہولناک حادثے کی پیکنگ میں بہت خوش گوار تحفہ عنایت کرتا ہے۔ شرط صرف اتنی ہے کہ اس بظاہر زحمت نظر آنے والی چیز کو رضا سمجھ کے قبول کرلیا جائے تو ماہ نور نے آخرکار یہ سمجھ ہی لیا۔
کبھی کبھی جب وہ اپنے اور معاذ کے بارے میں سوچتی تو اسے گھٹن سی ہوتی۔ وہ بے چین ہوجاتی پھر "جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" بھرا تھپکا خود کو دے کر حقیقتوں کو فراموش کردینی چاہے۔ یہ فراموشی کچھ دن کے لیے ہی ہوتی، صالحہ اور کبیر احمد کبھی کبھی چکر لگالیتے۔ ماہ نور بھی سائرہ آنٹی اور عبید انکل کے ساتھ دو چار بار گھر گئی مگر وہاں وہی بے ترتیبی اور بناوٹ دیکھنے کو ملی۔ اسجد سے یونیورسٹی میں ایک دو بار سامنے پہ وہ اعتماد سے نظر انداز کرتی گزر گئی۔ علوینہ نے اسجد کی طرف سے معافی مانگنا چاہی تو وہ سب بھول چکی ہے کہہ کر آگے بڑھ گئی۔
ان پانچ ماہ میں وہ اپنی آدھی زندگی کا نچوڑ سیکھ چکی تھی۔ سوچ میں ٹھہراؤ آگیا تھا۔ وہ نارمل دماغی حالت میں آچکی تھی۔ اس سب کی وجہ اس گھر کے لوگوں کا دانش مندانہ سلوک تھا جو وہ اس کے ساتھ برتتے رہے۔ ہر شخص کے پاس زندگی میں ایک بار یہ موقع ضرور آتا ہے کہ جب کسی کو راکھ یا خاک کرنا اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اس لمحے کو ہمیشہ مسیحائی کے پیش نظر استعمال کریں کیونکہ اللہ مسیحائی ہر ایک کو نصیب نہیں کرتا۔

☆☆☆

سائرہ آنٹی کے بہن بھائی پورے یورپ میں پھیلے ہوئے تھے مگر آبائی گھر مانسہرہ میں تھا۔ آنٹی کے بڑے بھائی مستقیم کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی۔ اب صحت یابی کے بعد سب مانسہرہ اکٹھے ہو رہے تھے جہاں وراثت کی تقسیم ہونا تھی۔ سائرہ آنٹی بہت خوش تھیں۔ انکل نے بھی یونیورسٹی سے چھٹیاں لے

لیں اور اب وہ پیکنگ کر رہی تھیں، ماہ نور افسردہ سی مدد کروا رہی تھی۔
"ماہ نور بیٹا! ایسے کیوں کر رہی ہیں؟ میں وہاں بھی پریشان ہی رہوں گی۔ اگر مڈٹرمز نہ چل رہے ہوتے تو تجھے یوں اکیلا نہ جانا پڑتا، میں جلد آجاؤں گی۔"
وہ سچ میں پریشان تھیں۔ ماہ نور اور معاذ کے تعلق سے بخوبی واقف تھیں مگر عبید خاقانی انہیں کچھ وقت دینا چاہتے تھے، اس لیے وہ خاموش رہیں۔
"اماں، بابا! اب پلیز، فلائٹ کا ٹائم ہونے والا ہے ورنہ ہمیشہ کی طرح الزام مجھے ہی دیا جائے گا۔"
معاذ کلائی پر بندھی گھڑی سے وقت دیکھتا بولا۔ بلقیس سامان گاڑی میں رکھنے لگی۔ سائرہ ماہ نور کو خاص ہدایت دینے لگیں کہ وہ روز صبح معاذ کو ادرک کی چائے ضرور دے کیونکہ دسمبر میں اس کا استھما بگڑ جاتا ہے، وہ سر ہلانے لگی۔ گاڑی میں انتظار کرتا معاذ ہارن بجانے لگا۔ انکل آنٹی اسے پیار کرتے گاڑی میں جابیٹھے۔ ماہ نور داخلی دروازے کے پاس ایسے کھڑی تھی جیسے ایک ننھا بچہ جس کے والدین اسے ہاسٹل میں چھوڑ کے واپس جارہے ہیں۔ گاڑی پورچ اور پھر گیٹ سے بھی نکل جانے کے بعد تک وہ ہاتھ ہلاتی رہی۔ بلقیس کا شوہر (چوکیدار) گیٹ بند کرکے اس سے بات کرنے لگا۔ وہ واپس مڑ گئی، سارا گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔

☆☆☆

دو دن خاموشی سے گزر گئے۔ سردی کی شدت میں مزید اضافہ ہوا۔ سورج جیسے طویل رخصت پر تھا۔ اندھیرا دن کو بھی نگاہیں زمین پر گاڑے ستاتا رہا۔ ماہ نور بخوبی سب کام کر رہی تھی۔ معاملہ تب بگڑا ب بلقیس واش روم میں گر کے ٹخنے کا فریکچر کروا ٹھی۔ ماہ نور صحیح معنوں میں گھبرا گئی رشید پلاسٹر ھنے کے بعد بلقیس کو گاؤں لے گیا۔ معاذ اس کی واں دھواں شکل سے اس کی مشکل کا اندازہ کر رہا ا جب ہی تقریباً اپنا ہر کام خود کرنے لگا۔ وہ اعدگی سے کمرے کے دروازے سے ہاتھ بڑھا کر بیڈ ٹی اسے تھما دیتی اور کھانا وقت پر لگا دیتی۔
بادلوں نے یک لخت تیور بدلے اور فلک پر چڑھائی کردی۔ ایسے میں سورج اپنے اتحادیوں سمیت کہیں روپوش ہو بیٹھا۔ بادل اسے للکارنے کے انداز میں گرجتا، رات کے آٹھ بج گئے تھے اور معاذ آج کچھ زیادہ ہی لیٹ ہوگیا تھا۔ ماہ نور نے کھانا میز پر لگا دیا اور اپنی کتابیں لیے لاؤنج میں آبیٹھی۔ وہ بار بار شیشے کی دیوار سے باہر دیکھتی، وہ آیا، ماہ نور کا سرخ پڑتا چہرہ دیکھ کے پشیمان ہوا۔ کوٹ اتار کے صوفے کی پشت پر رکھا۔ سویٹر درست کرتا بولا۔
"معذرت چاہتا ہوں تھوڑی دیر ہوگئی۔ دراصل آفس کی شفٹنگ ہو رہی ہے کہیں اور، کام جلد مکمل کروانا ہے بس اسی لیے دیر ہوگئی۔" جوتے اتارتے ہوئے اس کے تاثرات بغور دیکھے، وہ چیخی۔
"اگر آپ ساری رات بھی گھر نہ آتے تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں اکیلی رہ سکتی ہوں۔" لہجہ "میں اکیلی رہنا چاہتی ہوں" والا تھا۔ معاذ نے بے ساختہ جبڑے بھینچے اور اٹھ کر کچن کی طرف گیا۔
ماہ نور نے کوفت سے کوٹ اور شوز کو دیکھا۔ وہ پلٹا۔ کوٹ اور جوتے اٹھائے اور کمرے سے چلا گیا۔ کھانا یوں ہی پڑا تھا، ماہ نور ہونٹ کاٹتی وہیں بیٹھی رہی۔

☆☆☆

اگلی صبح سورج کسی بھی زحمت سے بالاتر رہا۔ بارش شروع ہوگئی۔ ماہ نور کے مڈٹرمز ختم ہوئے۔ دماغ پرسکون ہوگیا۔ انکل آنٹی کو فون کیا، آنے کی تاکید بھی۔ پھر ماہم سے بات کی، باقیوں سے بھی۔ لاؤنج میں لیٹے لیٹے آنکھ لگ گئی۔ جب کپکپاہٹ سے اٹھی تو شام کے ساڑھے چھ ہوچکے تھے۔ کھانا بنایا، کباب فرائی کیے، سلاد بنایا تو آٹھ بج گئے۔ وہ لاؤنج میں آگئی، ٹیلی وژن چلا لیا۔ بارش شیشے کی دیوار پر دستک دینے لگی، وقت بڑھتا جا رہا تھا اور گھبراہٹ بھی۔ اچانک بجلی چلی گئی۔ سناٹا عود کر حملہ آور ہوا، وہ جنریٹر دیکھنے کے لیے اٹھی تو بے ساختہ

کسی چیز سے جا ٹکرائی اور درد سے دوہری ہوگئی۔ خوف، دکھ، اکیلے پن کا پچھتاوا...... دیواروں کا سہارا لیتی صوفے پر آئی اور دبک کے بیٹھ گئی۔

پاؤں کے انگوٹھے سے خون رِستا محسوس ہوا، وہ گھٹنوں میں سر دیے سسکنے لگی۔ پورے گھر میں خاموشی اور باہر ہوا کی سائیں سائیں بارش کی تڑتڑ، وہ باقاعدہ کانپنے لگی۔ ماحول کی پراسراریت بڑھ گئی۔ ماہ نور نے موبائل ڈھونڈنے کی کوشش کی پھر ناکام ہو کر گھٹ گھٹ کے رونے لگی۔

پھر رونے میں اور خوف میں شدت آگئی تب کسی نے دروازہ دھڑ دھڑایا......

☆☆☆

نو بج رہے تھے اور شیخوپورہ روڈ کا ٹریفک جام جوں کا توں تھا۔ اس طوفانی بارش میں سارے ملک کی ٹریفک نے جیسے اسی شاہراہ سے لاہور میں داخل ہونا تھا۔ سینکڑوں گاڑیاں چیونٹی کی رفتار سے رینگتی متاثرین کا ضبط آزما رہی تھیں۔ ان گاڑیوں میں ایک سلور گرے کرولا بھی تھی۔ گاڑی میں بجتا دھیما سا انگریزی گانا دونوں مسافروں کے لیے متضاد اثر لیے ہوئے تھا۔

”یار نیہا اتنی جلدی ناراض مت ہوا کرو۔ مزدور بندہ ہوں، محنت بھی تو تمہارے لیے کرتا ہوں ناں، اچھا سنو......“

عفان فون پر مصروف تھا۔ منگیتر سے ہونے والی لڑائی آج اس موسم میں انجام پذیر ہونے پر وہ تو گاڑی سے اتر کے بھنگڑا بھی ڈال سکتا تھا جبکہ معاذ ضبط کے آخری مرحلوں میں تھا۔ وہ کبھی اتنا بے بس نہ ہوا تھا جتنا آج تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کے بھاگنا چاہتا تھا۔ بار بار گھڑی دیکھتا، وہ ماہ نور کو کال کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کم از کم اسے وجہ تو بتا دے۔ پھر ٹیکسٹ کرنے لگا۔ کوئی رسپانس نہ دیکھ کر اس کا دل عفان کو گاڑی سے دھکا دینے کو چاہا۔

”اوہ خدا...... کیا کروں؟“

اس کی فکروں سے بے فکر گاڑیاں ابھی بھی رینگ رہی تھیں۔

☆☆☆

کسی نے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ ماہ نور کا دل جیسے رک سا گیا۔ وہ اور زور سے رونے لگی، نجانے کیوں یہ خوف اس کی رگیں کاٹ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد کوئی دروازہ کھول کے اندر آیا، ماہ نور نے دم سادھ لیا۔

”ماہ نور......“ معاذ کی آواز میں الجھن تھی جس میں پریشانی نمایاں تھی۔ موبائل ٹارچ آن کی۔ اسے پکارتا لاؤنج میں آیا۔ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی ماہ نور کو دیکھ کر ایک پرسکون سانس خارج کی۔ اپنی چیزیں صوفے پر رکھ کے بیسمنٹ میں گیا۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد سارا گھر روشن ہوگیا۔ وہ ویسی ہی بیٹھی رہی۔ معاذ اوپر آیا۔ صوفے کی پشت پر کھڑا اسے دیکھتا رہا، پھر بولا۔

”اب کیا مسئلہ ہے؟“ ہلکی سی اکتاہٹ۔

”آپ جو چاہتے تھے وہ ہوگیا، اب آپ کو میرے مسائل سے کیا سروکار؟“ لہجے میں غراہٹ۔

”اوہ...... اور کیا چاہتا تھا میں ذرا تفصیلاً روشنی ڈالیں گی۔“ اکتاہٹ کی جگہ جھنجلاہٹ۔ وہ غم و غصے میں پھٹ ہی پڑی۔

”میں اپنی ہر بات کے لیے آپ کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔ مجھے تو بس ہلکا سا شبہ ہوا تھا کہ آپ کو احساس ہے میرا...... چاہے ہمارے تعلقات جیسے بھی ہوں لیکن...... آپ نے صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے مجھے......“ وہ رکی۔ سرخ ناک، سوجے پپوٹے، معاذ کچھ دھیما پڑا مگر اگلی بات نے دماغ بھک سے اڑا دیا۔

”آپ نے صرف مجھے کمزور ہوتا دیکھنے کے لیے یہ نیا بہانہ تراشا۔ یہ سب پلاننگ کی صرف میری کل کی بات کے پیش نظر، ایسا کون سا سینئر آرکیٹیکچر ہے جو نائن ٹو فائیو جاب رات ساڑھے دس بجے تک کرتا ہے۔“

”اسٹاپ دس نان سینس۔“ وہ دہاڑا۔ ”میں نے سب پلان کیا تمہیں نیچا دکھانے کے لیے؟ تمہیں کیا لگتا ہے میں دنیا کا فارغ ترین بندہ ہوں جو اس طرح کی پلاننگز کرتا پھروں گا۔ میرے پاس تو اتنا وقت نہیں کہ اپنے ماں باپ کو کال کرکے ان کی بہت ہی معلوم کرسکوں اور تم کہتی ہو میں ساڑھے دس بجے تک وہاں بیٹھا جھک مار رہا ہوتا ہوں۔“ ماہ نور لبالب بھری آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ یہ خواہش رکھتی تھی کہ وہ معذرت کرے، آئندہ احتیاط کرنے کے الفاظ بولے مگر......

”سارا دن میں آفس اور سائٹ کے دھکے کھاتا ہوں پھر بقول تمہارے ال لیگل کمپنی بھی چلاتا ہوں اور اب یہ کہ تمہاری نظر میں خود کو اہم ثابت کرنے کے لیے پلاننگز بھی کرتا ہوں واؤ...... اگر تم میرے بارے میں اچھا نہیں سوچ سکتیں تو برے اندازے بھی مت لگایا کرو۔ اگر ہمارا تعلق جو ہے جیسا ہے کی بنیاد پر چل رہا ہے تو اسے چلنے دو...... مفلوج مت کرواسے۔“ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ماہ نور کا اصل رونا تو اب شروع ہوا۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ کمرے میں بند رہی۔ بستر پر لیٹی آنسو بہاتی رہی، کلستی رہی۔

”میں ناشتا نہیں بناؤں گی، جس بندے کے لیے میں کوئی معنی نہیں رکھتی، میرا رونا، خوف زدہ ہونا بھی جس کا دل نہ پسیج سکا میں کیوں اس کی بیڈ ٹی، ناشتے اور کھانے میں خود کو ہلکان کرتی پھروں۔“ کروٹ پر کروٹ بدلتی۔

”سارا قصور میرا ہے، میں جو اس شخص کے ساتھ لمحہ بھی نہ گزارنے آئی تھی، نجانے کیوں اپنا مستقبل اسی گھر کے حوالے سے دیکھنے لگی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری زندگی ہمیشہ موقع کی تلاش میں رہتی ہے تاکہ مجھے چیت کرسکے۔“ تکیے میں منہ چھپالیا۔

ساڑھے گیارہ وہ باہر نکلی، ہر شے اپنی جگہ پر موجود تھی۔ کچن میں آئی، حیرت کا جھٹکا لگا۔ اس کے لیے ناشتے کی ٹرے تیار تھی، وہ کاؤنٹر تک آئی، ٹرے کے نیچے اک چٹ دبی تھی۔

”دوسروں کی خدمت کرکے ثواب کمانے کا میرا ذاتی کوئی ارادہ نہیں، سو یہ ناشتا یہ ثابت کرنے کے لیے چھوڑا کہ ”ہم بھی رکھتے ہاتھ ہیں“۔

ماہ نور چٹ تھامے کھڑی تھی۔ نجانے کیوں خوش گماں ہوئی تھی کہ معذرت کی ہوگی۔ ”بھاڑ میں جاؤ۔“ وہ دھپ دھپ کرتی لاؤنج میں آئی اور صوفے پر لیٹ گئی۔

”مجھے صبر سے کام لینا چاہیے۔ میں کچھ زیادہ ہی توقعات رکھنے لگی ہوں، جیسے ہم روٹھے والا یہ کھیل کھیلتے رہے ہوں۔“ سارا دن اسی قسم کے عہد باندھتی رہی۔

شام کو وہ جلد آگیا۔ ماہ نور پہلے ہی کھانا میز پر لگا چکی تھی۔ وہ کچن میں گیا، کافی دیر بعد نکل کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ برتن سمیٹنے آئی، کھانا ویسے ہی پڑا تھا۔ ایک چٹ پھر منتظر تھی۔

”مجھ جیسے ماسٹر مائنڈ پر احسان عظیم آخر ہونا چاہیے۔“ اس نے چٹ کی دوسری جانب جواب لکھا، وہیں دوبارہ لگائی اور اپنے کمرے میں آگئی۔ چٹ پر لکھا تھا۔

”اب لوگ خود کو اہم سمجھ رہے ہیں حالانکہ کھانا تو رشید کے لیے بھی بنتا ہے۔“

☆☆☆

اتوار کا دن تھا۔ دونوں ابھی تک اپنی اپنی شکایات کے ٹوکرے اٹھائے پھرتے، ضد کے پکے۔ سورج نے آج بڑے دنوں بعد اپنے دامن سے چند سنہری سکے دھرتی پر اچھالے۔ ماہ نور رشید کے ساتھ لان میں مصروف تھی۔ معاذ اپنا لیپ ٹاپ لیے وہیں چلا آیا۔

کچھ دیر ماہ نور کو دیکھتے رہنے کے بعد اس نے خود کو شرمندہ پایا۔ وہ اتنا کچھ کرتی ہے اور میں ایک شکوہ برداشت نہ کر پایا۔ وہ اندرونی حصے میں گئی تو وہ بھی پیچھے چلا آیا۔ زندگی بھری گھریلو مصروفیات دیکھنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو ٹشو پیپر سے تھپتھپاتے ہوئے فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔

”مزے میں ہوں، دراصل پریشان ہم تب ہوتے ہیں جب ہماری امیدیں پوری نہ ہو رہی ہوں۔ اب اگر کسی کو اپنی امید توڑنے کا موقع ہی نہ دیا جائے تو پھر سکون ہی ہوگا ناں؟“

وہ قریب سے گزرتی کچن میں چلی گئی۔ اب اس کی شخصیت میں اعتماد جھلکتا تھا۔ اس نے پاستا بنایا، دو باؤلز سیٹ کیے۔ باہر جھانکا، معاذ ٹی وی دیکھ رہا تھا، چٹ لکھی۔

"سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔"

لاؤنج میں آکر کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔ لاشعوری طور پر وہ اسے لالچ سا دے رہی تھی کیونکہ جانتی تھی کہ اسے پاستا پسند ہے۔ وہ سنجیدہ دکھ رہا تھا، اٹھ کر چلا گیا۔

وہ اپنا باؤل رکھنے آئی، چٹ کی تحریر بدل چکی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ راستے یکجا نہ ہو سکے
وہ بھی انا پرست تھا، میں بھی انا پرست

ماہ نور کا دل دھک سے رہ گیا۔ باہر سے شور سنائی دیا پھر کوئی کچن کے دروازے میں آن رکا۔

"سائرہ آنٹی!" ماہ نور کے لب پھڑپھڑائے۔

☆☆☆

گھر کی رونقیں بحال ہو چکی تھیں۔ رشید گاؤں سے اپنی بہن کو لے آیا۔ بلقیس ابھی چل نہ سکتی تھی۔ معاذ دو ماہ کے لیے مری چلا گیا، کسی سرکاری رہائش گاہ کی رینوویشن کا کام تھا۔ ماہ نور نے شکر منایا، مگر گھر یک لخت ویران سا ہو گیا۔ اس کی کرسٹل ڈور، وارڈ روب خالی ہو گئی۔ کپڑے، جوتے، پرفیومز تک کے ریکس خالی ہو گئے۔ وہ خالی جگہوں کو بھرنے کی کوشش میں روہانسی ہو جاتی۔ کاؤچ، ایزی چیئر، کچن کاؤنٹر، ڈور سائڈ ٹیبل کہیں بھی آرکیٹکچر کی کتابیں نظر نہ آتیں۔ وہ آہٹوں کی منتظر رہنے لگی اور آہٹیں بہت کم ہو گئیں۔

☆☆☆

معاذ کو گئے مہینہ ہو گیا، مگر وہ ایک مرتبہ بھی نہ آیا۔

"مری کون سا قطب جنوبی کو ہجرت کر گیا ہے جو آنا محال ہے۔" وہ جھنجلاتی۔

جنوری کے آخری دن چل رہے تھے۔ وہ یونیورسٹی سے لوٹی، ثریا کو لے کر پورچ میں آئی۔ جہاں بیل کے جھڑتے پتوں کا ڈھیر تھا۔ ثریا کو کام پر لگایا اور خود لان کا طائرانہ جائزہ لیا۔ ٹنڈ منڈ درخت ان پر سجے اکا دکا بے رنگ پتے۔ ماہ نور نے تاسف سے درختوں کی بے پروائی ملاحظہ کی جو کتنے چاؤ سے سبز پتوں کا لباس زیب تن کرتے ہیں پھر ان پتوں کا سبزہ چاٹ کر انہیں "درد" رنگ میں نہلا کر خود سے جھاڑ...... اگلے لباس کے منتظر ہو جاتے ہیں۔ آہ کچھ لوگ بھی تو ایسے ہوتے ہی ہیں، کسی کے سارے رنگ چوس کر اسے بے رنگ کرتے ہوئے کسی اور رنگ کی طرف مڑ جاتے ہیں لیکن اس دوران وہ لوگ بھی تو ایسے ہی دکھتے ہیں۔ ٹنڈ منڈ تنہا۔

"یا اللہ تیری رحمتوں میں سے ایک رحمت کسی کے ساتھ جڑے رہنا اور تیری آزمائشوں میں سے ایک آزمائش کسی کا چھوڑ جانا۔ میرے اللہ مجھے اس رحمت سے بہرہ ور رکھنا اور مجھے اس آزمائش سے بچائے رکھنا۔" ماہ نور نے گہرا سانس لیا اور گیٹ کی طرف متوجہ ہوئی۔

معاذ گاڑی اندر لا رہا تھا۔ وہ کسی سنگی مجسمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ اب وہ گاڑی سے نکلتا ہوا رشید سے مسکرا کر مصافحہ کر رہا تھا۔ بلیک سویٹر لیمن شرٹ، حسب معمول آستین موڑے ہوئے وہ قریب آیا۔ بغور اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"السلام علیکم! بیوی کیا ہوا؟" ثریا کے سلام کا جواب دیتے وہ آگے بڑھ گیا۔ ماہ نور کا دل بے ترتیب سا دھڑکا۔ ہاتھ ٹھنڈے پڑ گئے، وہ خود کو سنبھالتے ہوئے آگے بڑھی۔ آنٹی انکل کی خوش کن آوازیں آرہی تھیں، ماہ نور کو لگا گھر کا ہر کونا مکمل ہو گیا ہے۔

☆☆☆

رات کو وہ سب ڈنر کر رہے تھے۔ نجانے کیوں ماہ نور کو وہ ضرورت سے زیادہ خاموش لگا۔ جب سے آیا تھا، سو رہا تھا۔ پھر اٹھ کے سائرہ آنٹی سے راز و نیاز کرنے لگا۔ ماہ نور نے اس کی پسند کے چیز کوفتے بنائے۔ کوفتوں کو گریوی میں دم دے کر وہ باہر نکل آئی، لاؤنج کے دروازے پہ آ کے وہ رکی۔ معاذ اسے دیکھ کر بے ساختہ چپ ہوا، ماہ نور شرمندہ سی ہو گئی۔ وہ شاید کوئی ذاتی معاملہ دیکھ رہے تھے۔ ماہ نور اس کی بے زاری بھانپتے ہوئی معذرت کرتی واپس آ گئی۔

دل ایک دم سے یاسیت میں گھر گیا۔ ابھی بھی وہ تھکے تھکے انداز میں کھانا کھا رہا تھا۔ آنٹی اسے اور انکل کو بتانے لگیں کہ معاذ کو بہت بڑی کنسٹرکشن کمپنی کے ساتھ پارٹنرشپ بیسڈ کانٹریکٹ ملا ہے۔ انکل مسکراتے ہوئے بولے۔

"ارے آپ بھی ذرا ذرا سی بات پر خوش ہو جاتی ہیں۔ کانٹریکٹ لینا ایسا کون سا کارنامہ ہے یہ تو اس کی یونیورسٹی کا نام سن کے آسانی سے دیا جا سکتا ہے۔ اس میں قابلیت کا کوئی نکتہ میری نظر میں تو نہیں۔" لہجے میں شرارت تھی۔

"اگر آپ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اپنی قابلیت ثابت کرنے کے لیے میں آپ کے ساتھ چیس کھیلوں گا تو براہ کرم اسے دور فرما لیجیے۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔" نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے جواب دیا، انکل کا جی برا ہوا۔

"بیوی ہمیں آپ سے صرف یہی ایک شکوہ ہے، ایک بیٹا دیا ہمیں، وہ بھی نالائق، ست الوجود۔ ابھی تو آتش جوان ہے، بڑھاپے میں یہ ہمارے ساتھ کیا کچھ نہ کرے گا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اس بلیک میلنگ کا کچھ اثر نہیں ہونے والا مجھ پر۔"

اب انکل ماہ نور کو دعوت دے رہے تھے، وہ کندھے اچکا کر واپس مڑ گیا۔

☆☆☆

وہ رات خوب صورت راتوں میں سے ایک تھی۔ لان کے سب ہی پھولوں نے اپنی خوشبو جیسے رات کو دان کر دی تھی، سب ہی کمروں میں جا چکے تھے۔ وہ کچن کا عقبی دروازہ کھولے سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ گملوں میں لگے ٹماٹر سبز سے نارنجی مائل ہو رہے تھے، وہ انہیں چھونے لگی۔

"رنجش ہی سہی، دل ہی دکھانے کے لیے آ...... آ پھر سے مجھے چھوڑ جانے کے لیے آ...... رنجش ہی سہی......" وہ بار بار یہی گنگنا رہی تھی۔

آگے کچھ یاد نہ تھا، سر کو جھٹک کے یاد کرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ یہ غزل بہت اچھی گنگناتی تھی مگر پھر بھولتی گئی۔ یاد رکھنے کو الجھنیں بڑھتی جائیں تو جمالیاتی چیزیں خود بخود دھولنے لگتی ہیں۔

دفعتاً اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ پرسکون بیٹھی رہی یہاں تک کہ وہ اس کے برابر آن بیٹھا۔ ماہ نور کی نگاہیں اس کے ننگے پیروں پر جم گئیں، کیا چیز اسے بے سکون کر رہی تھی؟

"تم چپ کیوں ہو گئیں، بھول گئیں؟"

فروری کے آغاز نے ہوا میں اس کی سانسوں کو جمایا۔ دھواں سے بنا، ماہ نور اسے دیکھنے لگی، وہ تلخی سے مسکرایا۔

"تم ہر کام ادھورا کیوں کرتی ہو؟ شاید تمہیں اچھا لگتا ہے دوسروں کو انتظار کی سولی پر دیکھ کے۔"

ماہ نور چونکی۔ بالآخر وہ بول رہا تھا، ماحول پر اتری چاندی اس کی آواز کے فسوں میں تھی، ہواؤں نے رک کے اسے سنا۔

"تمہارا یونیورسٹی ٹور تھا، کیوں نہیں گئیں تم؟ کیا اب ہم سب کو بچوں کی طرح تمہیں یہ سمجھانا پڑے گا کہ تمہارے لیے کیا بہتر ہے اور کیا نہیں۔ تمہیں اپنے مستقبل کے بارے میں بھی سوچنا ہوگا، کسی سے ملنے ملانے پر ہی انڈرسٹینڈنگ ہوگی۔" وہ ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔

"تمہیں میری فکر نہیں ہونی چاہیے۔ میں پریکٹیکل شخص ہوں، میرے لیے کوئی بھی اجازت دینا مشکل نہ ہوگا۔"

اسے تھم کے سنتی ہوائیں دور دیسوں کو جا نکلیں اور پیچھے گھٹن وراثت کر گئیں۔ ماہ نور کا دم گھٹنے لگا، وہ تیزی سے اٹھی۔

"اسجد کی کال آئی تھی مجھے۔" ماہ نور کے قدموں سے جان نکلی۔

"اس نے جو کہا میں دہرانا نہیں چاہتا۔ میں صرف تمہارا فیصلہ سننا چاہتا ہوں۔ فیصلہ سننے سے پہلے میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ایک عام انسان ہوں۔ میں نے ہمیشہ چاہا کہ پہل تم ہی کرو کیونکہ تغافل میں بھی پہل تمہاری ہی تھی۔" وہ تیزی سے

پلٹی، معاذ نے کلائی سے تھام کر روکا۔
"میرا ہاتھ چھوڑیں۔" آنکھوں میں سیلاب تیزی سے چڑھنے لگا۔ معاذ نے کہنی سے تھام کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔
"پلیز۔" وہ بے بس ہو گئی۔
"جواب دو پہلے، کیا چاہتی ہو؟"
"کچھ نہیں چاہتی میں۔" وہ قدرے بلند آواز میں بولی۔ "میں کچھ نہیں چاہتی لیکن اگر آپ کی کوئی چاہت ہے تو میری اجازت کی بھی ضرورت نہیں۔ مجھے کسی کا نام لے کر ٹارچر مت کریں۔" معاذ پیچھے ہٹا۔ وہ مڑنے لگی۔
"میں صبح آپ کو گھر چھوڑ آؤں گا۔ پھر فیصلہ آپ کے ہاتھ......" پھر سے تم سے آپ ہو گئی۔ فیصلہ کرتے ہوئے مڑی۔
"آپ مجھے ابھی چھوڑ آئیں۔" وضاحتیں تو اس نے اپنے ماں باپ کو نہ دی تھیں، معاذ عبید خاقانی تو ابھی دل کی دہلیز تک پہنچا تھا۔ وہ بے یقین کھڑا تھا جبکہ وہ مڑ گئی۔

☆☆☆

"بابا دیکھیں! وہیں کچھ دہرایا گیا میرے ساتھ جو آپ کہہ چکے تھے۔ ماں باپ کے الفاظ تو بیٹیوں کے نصیب لکھ رہے ہوتے ہیں پھر آپ کیوں لاپروائی کر گئے میرے نصیب کے ساتھ۔ میں تب بھی قصوروار نہ تھی۔ میں اب بھی قصوروار نہیں ہوں مگر پھر بھی سزاوار ہوں، کیوں؟ آج اس شخص نے مجھے اپنی زندگی سے بے دخل کر دیا جس کے گرد میں زندگی سمجھ کے چکر کاٹنے لگی تھی۔"
وہ کبیر احمد کے بازوؤں کے حلقے میں زار زار رو رہی تھی۔ سوچیں آنکھوں کے راستے بہہ رہی تھیں مگر لب خاموش تھے۔ صالحہ نائٹ گاؤن میں الجھے بالوں کے ساتھ اپنی بکھری ہوئی بیٹی کے خاموش بین سن رہی تھیں۔ پھر غصے سے عبید خاقانی کو کال کرنے لگیں۔ یہ بات اتنی غیر متوقع اور بے وقت تھی کہ سب کو حیرانی سے نکلنے میں بھی وقت لگ رہا تھا۔

قیامت دونوں طرف مچی تھی۔

☆☆☆

پارسائی کے ثبوت مہیا کرنا دنیا کا مشکل ترین کام ہوتا ہے۔ ماہ نور کے لیے اس لیے بھی تھا کہ عزت نفس کو یہ ہرگز گوارہ نہ تھا کہ خود کو سچا ثابت کر کے اس گھر میں دوبارہ داخل ہوا جائے۔ عبید انکل اور سائرہ آنٹی دو بار آ چکے تھے مگر وہ جانے سے انکاری تھی۔ وہ خود کو معاذ عبید خاقانی کے لیے بوجھ بنانا پسند نہیں کرتی تھی۔ اسی کشمکش میں ایک مہینہ گزر گیا۔
آج وہ سائٹ وزٹ پر تھا۔ مزدوروں نے اس کا یہ روپ جیسے پہلی بار دیکھا ہو۔ اس کے چیخنے پر وہ پہلے رک کے اسے دیکھتے پھر جلدی سے غلطی سدھارتے۔ عفان اس کی چلبلاہٹ دیکھ رہا تھا، جب اس کا فون مدھر سر لگانے لگا۔

میں اسے بھول چکا ہوں، بھول چکا
بات اے دل نہ بڑھا بے وجہ......

وہ فون پر مصروف ہو گیا۔
"طارق صاحب کام اتنا ہی جلدی ہو گا جتنے اس کو کرنے والے ہاتھ میسر ہوں گے۔ اب میں ادھر مشینوں سے تو آدمی پیدا کرنے سے رہا۔ آپ سے لیبر (مزدور) مانگے تھے، وہ ابھی تک پہنچے نہیں۔ پلیز آپ ہمارے کام کو جج کرنے کے بجائے پہلے مزدور بھیجیں۔ یہ کینٹ کا ایریا ہے کوئی مزدور آئی ڈی کارڈ کے بغیر انٹر نہیں ہو سکتا۔ وہ جو چار مزدور پہلے بھیجے تھے وہ بھی ابھی گیٹ سے باہر کھڑے ہیں۔" کھٹاک سے فون بند کر دیا اور سر تھام لیا۔
"تم بھابھی سے سوری کیوں نہیں کر لیتے؟ کم از کم ان اداس غزلوں والے میٹر سے تو نکلو۔" عفان نے مفت میں مشورہ دیا۔
"کین یو اسٹاپ دس پلیز؟ جب تمہیں نظر آ رہا ہے کہ آج میں لحاظ کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں تو کیوں خود کو بے عزت کروانے کا شوق چڑھا ہے تمہیں...... اور ہاں اس میٹر کی فکر مت کرو، یہ جلد گزر جائے گا۔"

وہ بات کرتا باہر نکل آیا۔ کالمز کے لیے فاؤنڈیشن تیار ہو رہی تھی۔ وہ بغور دیکھنے لگا۔ کچھ [illegible]ا۔ عفان نے روکا مگر وہ مزدور سے پوچھنے لگا۔
"فاؤنڈیشن کے لیے کتنی گہرائی ہے؟"
"ساڑھے چھ فٹ جناب۔" کالمز (ستون) [illegible] لیے کم از کم دس فٹ زمین کھودی جاتی ہے پھر [illegible] میں کنکریٹ ڈالا جاتا ہے اور پچیس سے تیس فٹ [illegible]لم جمایا جاتا ہے۔ ساڑھے چھ فٹ کا سن کے معاذ [illegible]ماغ بھک سے اڑ گیا۔
"یہ کیا ہو رہا ہے عفان؟" وہ عفان کی طرف پلٹا وہ [illegible]برایا۔ "یہ میری غفلت تھی۔" "تم تیس فٹ کے کالم کے [illegible] چھ فٹ فاؤنڈیشن کھدوا رہے ہو۔ یہ سراسر تباہی [illegible]ک ذرا سا جھٹکا سب ختم کر سکتا ہے۔ تم سے بعد [illegible]ں بات کرتا ہوں، پھر تم ذرا اس کالم کو چیک کرو، ذرا [illegible]نداز لگاؤ۔" وہ کرین ماسٹر سے کہنے لگا۔ اس نے آن [illegible] آن کالم کو کرین کا اگلا حصہ لگایا اور آدھی مکمل ہوئی، [illegible]ت دھماکے کی آواز سے زمین بوس ہوئی۔ عفان کی [illegible] "معاذ" دھماکے کی آواز میں دب گئی۔

☆☆☆

پندرہ دن ہسپتال میں رکھنے کے بعد اسے گھر [illegible] دیا گیا تھا۔ آج اس حادثے کا تیئسواں دن [illegible] اس کی ٹانگ پر پلاسٹر چڑھا تھا۔ کندھا پٹیوں [illegible] جکڑا تھا، بائیں ابرو کے پاس بڑا سا کراس [illegible]ج لگا تھا مگر اب وہ بہتر تھا۔ ان تیئس دنوں میں [illegible] نے اپنی آنکھوں کو بے طرح دکھایا تھا۔ وہ کسی [illegible] پوچھتا نہیں تھا مگر اسے انتظار تھا۔ کبیر احمد اور [illegible] تقریباً روز ہی اسے دیکھنے آتے۔ ماہم اور ماہ [illegible]بھی آئیں مگر...... اسے کھانے کی لذت اس [illegible] نے کا پتا دیتی۔ کبھی اڑتے آنچل کا کونا دکھ [illegible] وہ اسے مکمل دیکھنا چاہتا تھا۔
آرکیٹیکچر کی کتاب اس کے سینے پر دھری تھی [illegible]ت کو گھور رہا تھا، جب قریب ہی کھٹکا ہوا۔ وہ [illegible] ماہ نور سوپ رکھ کے پلٹنے لگی۔ معاذ نے ہاتھ [illegible] مڑ کے اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگی۔

"او کے سوری، اب بس کرو۔" وہ طنزاً مسکرائی۔
"تو پھر معلوم ہوا کہ بیوی کا دل دکھانے پر کیسے سزا مل جایا کرتی ہے؟" آنکھ سے ٹانگ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ہولے سے ہنسا پھر کندھے کے درد سے کراہا تو وہ فوراً قریب بیٹھ کے زخم دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
"سوری مجھے کہنا ہے معاذ...... میں فضول ضد لگا بیٹھی۔ خیر میں نے یہ سیکھ لیا کبھی کبھی خاموشی سیاہ غلاف سا کام کرتی ہے۔ یہ اجلا سچ بھی چھپا دیتی ہے، جہاں اپنوں کو وضاحت دینے کی بات آئے وہاں زبان کو آگے آنا ہی چاہیے مگر...... چاہے دیر سے سہی، میں سیکھ ضرور لیتی ہوں۔"
"دراصل میں خود غرض ہو گیا تھا، میں اس شخص کو دکھانا چاہتا تھا کہ اگر فیصلہ کبیر احمد کی بجائے ماہ نور کبیر کرے تب بھی۔ نتیجہ معاذ عبید خاقانی ہی نکلے گا۔ پھر میں نے یہ جانا کہ دوسروں پر کچھ ثابت کرنے کے لیے رشتوں کو مت تولیں۔ آپ اپنے زعم میں رشتے کو ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔" وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا، پھر اس کا ہاتھ اٹھا کر اپنے سینے پر رکھا۔
"اب میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں، ہمیشہ۔ اب سے لے کر ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی آٹو بائیوگرافی لکھنے کے بھی بعد تک۔ میں ہر روز تمہارے ہاتھ کی بیڈ ٹی چاہتا ہوں اور اپنی کتابیں سمیٹنے میں تمہیں ہلکان ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں ایستھس اور آرکیٹیک کا بہت خوب صورت اور فائدہ مند امتزاج لوگوں کو دکھانا چاہتا ہوں۔ میں بتانا چاہتا ہوں کہ مثلث نما بنے گھروں میں لوگ زیادہ پرسکون رہتے ہیں۔ مستطیل کھڑکیاں ہوا کا راستہ روکتی ہیں اور چوکور پیلیس بھوک بڑھاتی ہیں اور......"
ماہ نور کے ہنسنے کی آوازیں کمرے سے باہر آنے لگی تھیں۔ بالآخر ان دونوں نے مسائل کو سلجھانے کا فارمولا ڈھونڈ ہی لیا تھا۔ وہ تھا کسی معاملے کی سوچ بچار...... اللہ کی طرف سے دی گئی الہامی امداد......

☆

نورین زہرہ

کامیاب وکیل

کورٹ میں تھکا دینے والا دن گزار کر جب وہ گھر پہنچی تو حسبِ معمول لان سے لے کر گھر کے ہر کونے تک پھیلی ہوئی عجب وحشت ناک خاموشی نے اس کا استقبال کیا۔ دھندلاتی ہوئی ملگجی شام میں اسے لان میں کھلے رنگ برنگے پھول مرجھائے ہوئے سے محسوس ہوئے۔

برآمدے میں کھڑے ہو کر داخلی دروازے پر ہاتھ رکھے رکھے یونہی بے مقصد مڑ کر صوفیہ نے دسمبر کی آخری تاریخوں کے ڈوبتے سورج کو دیکھا۔ دم توڑتا سرخی مائل نارنجی سورج اور اس کے اطراف میں پھیلے ہوئے بکھرے بکھرے سے سرخی مائل بادل، اپنے آشیانوں کو لوٹتی ہوئی بچوں کا رزق منہ میں دبائے پرندوں کی قطاریں اندھیرے کا حصہ بنتی جا رہی تھیں، ڈوبتا ہوا آفتاب اسے ایک کمزور ،بوڑھے ہی کی طرح لگا جس کی منجمد آنکھوں میں زندہ رہنے کی ناکام خواہش چراغ کی آخری لو کی طرح ٹمٹما رہی ہوتی ہے۔ سورج اور اپنی دم توڑتی امید میں یہی ایک قدر مشترک صوفیہ کو لگ سکی۔

وہ ٹھنڈا سانس بھر کر دروازہ دھکیل کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ عجیب سا جمود گھر میں چھایا ہوا تھا حالانکہ بڑا شاندار ڈیکوریٹڈ گھر قیمتی امپورٹڈ چیزوں سے سجا ہوا، مگر صوفیہ کے حساب میں نامکمل، صوفیہ لاؤنج میں آکر صوفے پر گرنے کے انداز بیٹھ گئی۔ ملازمہ نے چائے لا کر پکڑائی جبکہ ساتھ بیٹھے اس کے شوہر ایڈووکیٹ امجد حسین بخاری نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے اسے رسمی مسکراہٹ سے دیکھا تو وہ بھی مسکرا دی۔

وہ اکثر اس سے پہلے گھر پہنچ جاتا تھا۔ اگلے ہفتے ان دونوں کی شادی کی تیرہویں سالگرہ آرہی تھی۔ شادی کے پانچ سال تک تو یہ سالگرہ بڑی شان سے منائی جاتی، پھر اس کے بعد ایک دوسرے کو صرف وش کرنے کی نوبت اور پچھلے دو تین سالوں سے اس ''خاص'' دن کا کوئی تذکرہ بھی نہ کیا جاتا۔ صوفیہ کے خیال میں اگر ان کی کوئی اولاد ہوتی تو ان دونوں کی مرضی کے خلاف بھی اس دن کو خاص بنانے کے لیے زور دیتی' پروگرام بناتی۔ اس دن کی رونق بڑھاتی لیکن اب تو ہر آنے والا دن ان کی اذیت اور محرومی میں اضافہ کرنے آتا۔

''آج بہت خاموش ہو۔ کیا بات ہے؟'' امجد کی بات پر اسے خیالات کے سمندر سے باہر آنا پڑا۔

''کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔'' مسکرا کر اس نے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرے جیسے اپنی سوچ مٹانے کی کوشش کی ہو۔

اب تو ان دونوں میاں بیوی کے درمیان کی گرم جوشی، خوشی، ولولہ سب کچھ اس محرومی نے نگل لیا تھا ہر آنے والا دن صوفیہ کو سمجھا رہا تھا اس کا اندیشہ سچ ہو جائے گا اب امجد مزید انتظار نہ کرے گا۔ چار بہن بھائیوں میں سب سے بڑا امجد حقیقت میں تو صوفیہ کا عاشق تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بچوں کا بھی عاشق تھا۔ اس سے چھوٹی دو بہنیں اور بھائی سب صاحب اولاد تھے اور ان سے امجد کا التفات دیکھنے والا ہوتا تھا، وہ تو نوکروں تک کے بچوں کو بڑی شفقت کی نظر سے دیکھتا تھا۔

یہ سب کچھ صوفیہ جانتی تھی اور یہ بھی کہ آج سے آٹھ سال پہلے اس ذاتی بنگلے میں وہ صوفیہ کے ساتھ صرف اس وجہ سے شفٹ ہوا تھا کہ اس کی والدہ عفت بتول بخاری صوفیہ سے نہ لڑیں جھگڑیں کیونکہ عام عورتوں کی طرح انہیں بھی امجد کی زندگی کی ویرانی کی قصور وار صوفیہ ہی لگتی تھی۔ اس کے باوجود وہ امجد کو گھر بلا کر اس کی وقتاً فوقتاً برین واشنگ کرتی رہتیں۔

اب تو صوفیہ کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ ایک دن امجد بھی اس سے دوسری شادی کی بات کرے گا۔ کیونکہ وہ ایک حقیقت پسند چالیس سالہ عورت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی کامیاب وکیل بھی تھی۔ وہ ذہنی طور پر تیار تھی کہ نہ جانے کب امجد ایسی بات کر دے لیکن اس کا دل عام عورت کی طرح لرز بھی جاتا تھا کہ جب...... یہ طے تھا کہ وہ گھر نہ



چھوڑے گی کیونکہ اس نے بھی امجد سے سچی محبت کی تھی اور اس سب قصے میں امجد کا کیا قصور؟ وہ کیوں بے نام ونشان اس دنیا سے چلا جاتا لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے خیالات کا اظہار کبھی امجد کے سامنے نہ کیا تھا۔

اس وقت بھی وہ اپنے خیالات کی رو میں بہتی جارہی تھی کہ امجد نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے متوجہ کیا۔

''صوفیہ تمہیں پتا ہے کل امی نے مجھے گھر بلایا تھا۔'' اس نے جھجکتے ہوئے بات شروع کی۔

''وہ ......وہ چاہتی ہیں کہ اب میں دوسری شادی کرہی لوں۔'' امجد نے بے مقصد اپنے سر پر ہاتھ رکھا۔

''تو کرلو امجد! میں نے تمہیں کب روکا ہے اچھا ہے۔ گھر میں کوئی آجائے گا۔ چھوٹا سا پیارا سا دیکھو ناں اس گھر میں کتنا قیمتی سامان، کتنے خوبصورت کرسٹل کے شوپیس ہیں نازک سے کسی نے انہیں نہیں توڑا۔ کوئی تو ہو جو انہیں چھیڑے یہاں سے وہاں تک بھاگتا پھرے۔ اس کی ہنسی سے سارا گھر گونجے امجد، سارا گھر۔''

اس نے بھری آنکھوں سے جذباتی ہوکر امجد کے ہاتھ پکڑ لیے۔ منظر کشی ہی کچھ اس طرح کی تھی امجد کی آنکھوں میں خواب سے سج گئے۔ تیرہ سال کوئی کم مدت تو نہیں ہوتی انتظار کے لیے جب دونوں نے سب دروازے کھڑکا کر دیکھ لیے ہر رپورٹ میں یہی بات کہ دونوں نارمل ہیں۔ اسی آس کی دوڑ تھامے تینتالیس سالہ امجد اور چالیس سالہ صوفیہ کے بالوں میں برف اترنے لگی۔

''چپ کیوں ہوگئے امجد! بولو ناں کب کروگے شادی۔ کب یہ سونا آنگن آباد ہوگا؟ امجد میرا وعدہ ہے تم جس سے شادی کرو صوفیہ کوئی گلہ نہ کرے گی بس کوئی ہو جو اپنی پیاری میٹھی آواز میں صوفیہ کی ''مما'' کہہ سکے۔ امجد کوئی ہو جو مرنے کے بعد ہماری قبروں پر فاتحہ پڑھنے آئے۔ ہماری برسی پر قرآن خوانی کروائے۔''

آنسو ایک قطار کی صورت میں دونوں آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ ایک دوسرے کے ہا پکڑے وہ دونوں اندھیرے کے جگنو دیکھ رہے کہ اچانک جگنوؤں کی جوت بجھ گئی۔ گھپ اند چھا گیا۔ امید کے جگنو کہیں اڑ کر چلے گئے۔ کم از صوفیہ کو تو ایسا ہی لگا۔

''وہ بات یہ ہے کہ صوفیہ!'' امجد نے صوفیہ آنسو پونچھتے ہوئے تمہید باندھی۔

''کیا ہوا رک کیوں گئے امجد مجھے ہر با قبول ہے تم کیوں ہچکچا رہے ہو۔'' صوفیہ نے حوصل بڑھایا تھا۔

''صوفیہ! امی نے دو تین جگہ رشتوں کی با چلائی ہے لیکن''

''صرف اسی صورت میں رشتہ دینے پر راض ہیں کہ میں'' وہ اٹکا۔''

''میں تمہیں چھوڑ دوں''۔ جبکہ صوفیہ کی رو نکلنے لگی۔

لیکن میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں صوفیہ۔'' بے حس بیٹھی صوفیہ کو کندھوں سے تھامتے ہوئے وہ بولا۔

''بس تم یوں کرو کہ کچھ دنوں کے لیے لندن ا بڑے بھائی کی طرف چلی جاؤ پھر پھر! میرا وعدہ ہے خود تمہیں لینے آؤں گا پلیز صوفیہ کچھ دن کی تو بات ہے۔ امی جان نے تو مجھے یہی مشورہ دیا ہے آ تمہاری مرضی۔'' اس نے گویا اپنا بوجھ صوفیہ کے کندھو پر رکھ دیا۔ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے صوفیہ تلخ دنیا میں لوٹ آئی۔

''تمہیں جو کرنا ہے امجد کرو، میری قسمت ٹھہر تم جو کہو گے میں کروں گی تم اپنی زندگی میں خوش ر میں لندن سے واپس نہیں آؤں گی۔''

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکلتی چلی گئی ا ہارے ہوئے وکیل کی طرح جو عدالت میں مقدمہ ہار چکا ہوتا ہے۔

سائرہ رضا

جمالِ زہرا

شہر کو جوڑنے والی سڑک پر بس رکی تھی۔ چائے والے نے تیزی سے چھلانگ بھرنا چاہی۔ یہاں اترنے والے مسافر اس کے چائے خانے سے چائے کیک کھا پی کے تازہ دم ہوتے تھے اور پھر اپنے گاؤں محلوں میں جانے کے لیے رکشہ، ویگن پکڑتے تھے۔ جن کا پیدل کا راستہ ہوتا ــــ وہ بھی ایک کپ چائے تو پی لیتے تھے۔

مگر آج صرف ایک مسافر اترا تھا۔ چائے والے کا چہرہ اتر گیا۔ چوبیس گھنٹے کی ایک بس اور وہ بھی صرف ایک مسافر لائی...... اس نے بے دلی جھاڑن اپنے شانے پر رکھا اور چیزیں جگہ پر ر لگا۔ اسے اپنے پیچھے مسافر کی موجودگی محسوس ہوئی وہ بے دلی سے مڑا اور پھر جہاں کا تہاں رہ گیا۔ اس منہ بے آواز کھلا اور بند ہوا۔ اس ویران سڑک پ اس کا بھوت تو نہیں تھا۔

"السلام علیکم بھائی حفیظ! کیا ہوا پہچانا نہیں میں......" وہ اپنا نام بتا رہا تھا۔ بھائی حفیظ کچھ نہیں رہا تھا۔

مکمل ناول



اس نے اپنا اوپری دھڑ کھوکھے سے باہر کی سمت جھکالیا۔ وہ اس کی ٹانگوں کو دیکھ رہا تھا۔ اگلے پل وہ حیرت وخوشی سے اچھل کر باہر آ گیا۔

آنے والا اپنی ٹانگوں پر کھڑا تھا۔ قسم خدا کی ...... اپنی ذاتی ٹانگوں پر......

حفیظ نے اسے کمر میں بازو ڈال کر اٹھا کر گھمایا۔ پھر زمین پر کھڑا کر دیا۔ بے یقینی تھی کہ جاتی نہیں تھی۔ وہ اس کے پیروں میں بیٹھ گیا اور نیچے سے اوپر تک دونوں ہاتھ، دونوں ٹانگوں پر لگا کر وہ ان کی موجودگی محسوس کر رہا تھا۔

''اوئے یار......!'' اس نے مسافر کا منہ چوم لیا۔

موت آخری دروازہ ہوتی ہے، زندگی میں ایک در بند ہو تو دوسرا کھل جاتا ہے۔ حلم ہونا چاہیے، تنکے میں جان پڑ جاتی ہے۔

دانہ پانی اٹھ جائے تو آخری ہچکی سارا کھایا پیا الٹ دیتی ہے۔

تو دراصل ہونا وہی ہے...... جو طے کیا جا چکا ہے۔

دعوے نہیں کرنے چاہئیں...... یہ اللہ کے سوا کسی پر جچتے نہیں جناب اور خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔

☆☆☆

عروسی کمرے کی سجاوٹ میں جان مار دی گئی تھی۔ کوئی خانہ خالی نہ تھا' چمک پٹیاں، کاغذی پھول اور کاغذی فانوس...... اس کے پیچھے والی دیوار پر دولہا دلہن کے ناموں کے پہلے حروف کندہ کیے گئے تھے۔ پلنگ اور فرش پر گلاب کی پتیوں کی تہیں بچھی تھیں۔

میز پر پھل رکھے تھے اور مٹھائی کا ڈبا...... اور پانی......

پانی نہیں تھا، اس کے حلق میں کانٹے اُگے تھے۔ جگ گلاس کی تلاش میں چکراتی نگاہیں سنگھار میز کے آئینے پر جا ٹھہریں۔

کس کا عکس تھا یہ...... وہ اس اجنبی چہرے کو نہیں جانتی تھی۔

مگر دیکھا دیکھا لگتا تھا، کہاں دیکھا تھا بھلا...... اوہ...... یہ تو وہ خود تھی۔ سرخ عروسی لباس، سونے کے زیورات پہنے، کاجل سرخی غازہ...... سجانے والیوں نے اسے پور پور سجا دیا تھا۔ کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ مگر کسی کے پاس بھی وہ ہنر نہیں تھا، جو اس کے چہرے کی مردنی کو چھپا دیتا۔

وہ میکانکی انداز سے اٹھ کر آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس نے سر پر اوڑھے ذرا سا گھونگھٹ کی طرح گرتے دوپٹے کو سینے کے پاس سے مہندی لگے ہاتھ سے دبوچ لیا اور پھر...... دوسرے ہاتھ سے سہارے کے لیے دیوار تھام لی۔

اس نے سنا تھا اور پھر دیکھ بھی لیا۔ جوان کنواری لڑکی مر جاتی تو کفن کے اوپر سرخ کرن لگا گوٹے والا دوپٹا اوڑھا دیا جاتا تھا۔ محلے کی ایک لڑکی کی شادی سے کچھ دن پہلے کرنٹ لگنے سے مر گئی۔

اس کی ماں نے کسی گناہ ثواب پر کان نہ دھرتے ہوئے، ہیجانی کیفیت میں اس کے ہاتھوں میں مہندی بھی لگا دی تھی۔ عورتوں کے کھینچتے کھینچتے تک وہ اس کے ہونٹوں پر لالی بھی رگڑ چکی تھی اور پھر غش کھا کر گئی۔

اسے اپنا آپ آج اس لاش کی طرح لگا۔ ہاں وہ مر چکی تھی۔ ختم ہو گئی تھی لیکن اس کی سانسیں چل رہی تھیں۔ سانس چلنا اگر زندگی تھی تو وہ زندہ تھی مگر...... وہ مر چکی تھی۔ قسم سے۔ قبر میں حساب کتاب کے لیے فرشتے آتے ہیں، اس کے کمرے کے دروازے پر کھٹکا ہوا۔

عذاب شروع ہوا چاہتا تھا۔

☆☆☆

''اتنی کم روٹی، لے میرے ہاتھ سے کھا۔'' اس کی ساس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ جو

لے کر پیچھے ہو گئی تھی۔

''پیٹ بھر گیا۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''لو، ایسے کیسے بھر گیا۔ میرے جیسی بڑھی دو نوالے کھا لیتی ہے۔ لے چل میرے ہاتھ سے کھا۔'' اس نے تیزی سے نوالہ بھی بنا لیا۔

''ناں نہیں...... نہیں......'' وہ سر پیچھے کرنے لگی۔

''او کھا لے، پیار کا جواب پیار سے دیتے ہیں۔ اتنی بار سمجھایا ہے، سمجھ نہیں آئی۔'' وہ ...نی بات کر رہا تھا۔ اس کی نظریں جھک گئیں۔ نوالہ نگلنا ایسے لگا جیسے کانچ نگلنے ہوں۔ ساس نے اس کی مشکل بھانپ لی۔

''یہ پسند نہیں — تو دہی لے لے۔ اچھا انڈا ابال دوں یا پھر......'' وہ بڑبڑاتی اٹھی۔ ''رات کا ...ی کا شوربا بھی ہے۔ مجھے یاد نہیں رہا، وہ گرم ...کے لے آتی ہوں۔ روٹی بھگو کر کھا لے، بڑی ...ادی لگتی ہے۔'' وہ اس کے اندر اشتہا جگانا چاہتی تھی۔

''نہیں۔'' اس نے پانی کے ذریعے نوالے کو حلق سے دھکیلا۔

''بس ٹھیک ہے، آپ تکلیف نہ کریں۔ ...ں...... میں یہ دہی لے لیتی ہوں۔'' اس نے ...ت سے پیالہ پکڑ لیا۔

''او ہاں، آپ رہنے دو ماں! کوئی سس (ساس) بھی اپنی نوں کو اٹھ اٹھ کر چیزیں دیتی ...۔ اسے کچھ چاہیے ہوگا تو خود لے لے گی۔ اس کا ...گھر ہے یہ...... ہے کہ نہیں ہے۔'' ماں سے بات ...تے کرتے اس نے اسے مخاطب کیا اور ساتھ ہی ...کے زانو پر چٹکی کاٹ لی۔ تکلیف کی شدت سے ...کی آنکھیں بھر آئیں۔ جس پر وہ ہنس پڑا۔ لطف ...یا تھا۔ ساس نے بیٹے کو ملنے والے اس نئے ... سے آنکھیں چرائیں (ساتھ ہی بہو کے ...وں سے بھی)۔ اس نے بات کا رخ بدل دیا۔

''ہاں ہاں اسی کا گھر ہے، یہی کرے گی مگر ابھی تو اس کے ناز اٹھانے کے دن ہیں۔ ابھی تو میرے ارمان ہیں۔ پورا مہینہ اپنے ہاتھوں سے بنا کر کھلاؤں گی اسے اور جس دن یہ مٹھا (میٹھا) پکائے گی ہم سب کی دعوت کریں گے۔ ٹھیک ہے ناں۔'' وہ خوشی وسادگی سے بلا تکان بول رہی تھی۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' بیٹے کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔

''تو بھی تو کچھ بول۔''

''ہاں۔'' وہ بدقت کہہ سکی۔

''بنائے گی ناں پھر مٹھا؟''

''میٹھا......'' اس نے زیر لب دہرایا۔ سنا سنا لفظ تھا۔ کیا مطلب تھا اس کا، اس کی زندگی میں زہر گھل گیا تھا۔ ذہن پر بہت زور دینے پر بھی یاد نہ آیا کہ میٹھا کسے کہتے ہیں۔

☆☆☆

اس کی ساس نے اپنا کہا پوری ایمان داری اور خوش دلی سے نبھایا۔ پورا مہینہ اسے بستر پر بٹھا کر اپنے ہاتھ سے نوالے بنا کر کھلائے۔ اس نے منت

بھرے انداز سے بھی منع کر کے دیکھ لیا۔

"مجھے خوشی ہوتی ہے جندڑی۔" اس نے اس کا ماتھا چوم لیا۔

"ہائے......" اسے لفظ خوشی بھی اجنبی لگا۔ اسے خیال آیا، کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جو اپنے منہ سے کہیں، انہیں خوشی ملتی ہے، مل گئی۔ ہاہ......اس کی زندگی سے خوشیاں کھو گئی تھیں۔ جیسے میلے میں مٹھی کا سکہ کھو جاتا ہے۔

"خوش رہا کر......" وہ اسے ہر روز لباس نکال کر دیتی اور سجا کر اپنے سامنے بٹھا لیتی اور مسکراتے ہوئے کام نبٹائے جاتی۔

وہ اسے نصیحت کر رہی تھی یا دعا دے رہی تھی، وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

ساس بھونچکی رہ گئی۔ پھر ایک احساس جرم سے گال پر ہاتھ ٹکا کر پڑی پر ایسے بیٹھی کہ دیوار پر چڑھی دھوپ زمین پر گر کے سیاہی میں ڈھل گئی۔

وہ اس کے سامنے کبھی نہیں روئی تھی۔ کتنے ہی دن وہ اس کی گیلی آنکھوں کو عارضہ سمجھی اور عرق گلاب ڈالنے کا مشورہ دیتی رہی۔

تو وہ عارضہ نہیں تھا، غم تھا جو ٹھہرا ہوا تھا، آج چھلک گیا۔

وہ زیادہ بات بھی تو نہیں کرتی ناں، بڑی سے بڑی بات پر بھی ہوں ہاں سے آگے نہ بڑھتی۔ ساکت و جامد پڑی رہتی، پکارنے پر بھی متوجہ نہ ہوتی۔

کئی بار تو ساس کو اٹھ کر جا کر اسے چھو کر دیکھنا پڑا۔ آیا زندہ بھی ہے یا گزر گئی۔ ہاں فارغ بیٹھی نجانے کیا سوچتی رہتی ہے۔ اس نے اسے اپنے ساتھ کام میں لگانا شروع کر دیا مگر کام تھا ہی کتنا...... اب کیا دال چاول ملا کر دے دیتی کہ الگ کرتی رہے۔ ہائے اللہ توبہ...... ساتھ ہی کلیجے پر ہاتھ پڑ گیا۔ ایسا تو پرانے زمانے کے ہندو اپنی بیوہ بیٹیوں کو کر کے دیتے تھے۔ خدا اس کے بیٹے کو سلامت رکھے۔ مگر بہو کو مصروف رکھنے کے لیے اب کیا کیا جائے۔

وہ سفید کاٹن اور بہت سے رنگوں کے دھا[گے]
لے کر آ گئی اور شہد آ گیں لہجے میں بہو کے چ[ہرے]
چہرے کو دیکھا۔ "تیرا گھر ہے یہ......" وہ
اطراف دیکھ کر بولی۔ سجایا بنایا کر اسے۔

"گھر......" وہ بدکی۔ اس کا سر نفی میں ہ[لا]
آنکھوں میں وحشت در آئی۔

"گھر نہیں ہے، میری قبر ہے۔" اسے یک
ہی کچھ ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے دھا[گوں]
کو اٹھا لیا۔

"اور قبروں کو سجایا جائے تو وہ مقبرہ بن
ہیں اور سجا دو تو مزار......میرا مزار ہے یہ۔" اس
چہار اطراف نگاہ دوڑائی۔

"قبروں پر جتنے بھی پھول چڑھا لیے جا[ئیں]
وہ گھر نہیں بنتیں اماں!" اس کے پورے وجو[د]
دیوانگی چھلکنے لگی۔

اس نے دھاگوں اور کپڑے کو یوں جھٹکا
لوگ اپنے دامن کی آگ کو جھٹکتے ہوں گے۔ سا[س کو]
بڑا لگا تھا، بہو بولتی نہیں، بڑی خواہش تھی وہ بولے

☆☆☆

بے کلی اتنے آرام سے چند کروٹوں میں
والی نہیں تھی۔ وہ بیٹھے سے لیٹ گیا، لیٹنے سے ا[ٹھا]
اور بالآخر کھڑا ہو گیا۔ کمرے کی نیم تاریکی اس کی
کیفیت کی ترجمان تھی۔ جیسے نیم تاریکی اندھی[رے]
اجالے کا امتزاج ہوتی ہے۔ اس کا دل بھی ام[ید]
امیدی کے درمیان ڈول رہا تھا، وہ ہر خیال
لاحول پڑھ کر جھٹک دینا چاہتا تھا۔ مگر ناکامی
خود پر اختیار اس حد تک حاصل ہو جائے تو
خدائی کے دعوے کرنے لگتے ہیں۔ تھوڑی
انگلیوں سے رگڑتا وہ کسی لایعنی نقطے کو تک رہا تھا
اس نے ٹھنڈی سانس بھر کے جیسے اپنے ا[ندر کی]
کثافت کو ہوا برد کرنا چاہا۔

اس کی سانس کی آواز پورے کمرے میں
تھی کہ وہ خود بھی چونک گیا۔ چار اطراف

...اس کے اندر کی وحشت اس کے کمرے میں
...ی تھی۔

...یالے رنگ کی دیواروں پر کوئی سینری کوئی
...نہیں تھا۔ دیوار پر لگی پڑچھتی پر کوئی نفیس برتن
...تھا۔

...اسٹیل کے بڑے چھوٹے برتن، جنہیں سجایا
...گیا تھا۔ بس رکھ دیا گیا تھا۔ کھڑکی پر پردہ نہیں
...پانچ سیدھی سلاخیں اوپر سے نیچے گری تھیں۔
...وازہ نیم وا اور عریاں تھا۔ چارپائی سفید سوت سے
...تھی، وہ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر کہنیاں
...بائیں نکالے چھت کو تک رہا تھا۔ چھت جس
...یاں اور اینٹیں گننا اس کا مشغلہ تھا۔ کمرے میں
...یاں بھی تھیں، جیسی سرکاری اسکول میں ہوتی
...ان پر بھی کسی قسم کے کور یا کشن کا تکلف نہیں

...پہلے تو نہیں، بلکہ کبھی بھی نہیں۔ اسے ماحول
...لوئی شکایت نہیں تھی۔ مگر آج دل گھبرا سا گیا۔ وہ
...ی فیصلے کے تحت تیزی سے کمرے سے نکلا تھا۔

اس کے جوتے کی آواز نے خاموشی کی چادر
...ملوٹ ڈال دی تھی اور اندر ہی نہیں باہر اس سے
...بڑھ کر سناٹا تھا۔ اس نے آسمان کو دیکھا، جو
...ے سرمئی رنگ میں رنگا جا چکا تھا اور جس میں
...ے دھیرے سیاہی گھولی جا رہی تھی۔ مغربی
...نے سے ایک مرغولہ سا اٹھ کر جیسے عین اس کے
...لی سمت گامزن تھا، دور کہیں کوئل کوکی تھی۔

اس کی آنکھوں میں درشتی عود کر آئی، خوش الحان
...ل کی یہ چہکاریں بھی اس کے دل کو سکون نہ
...تی تھیں۔ ہوا نمی سے بوجھل تھی اور صاف بتاتی
...آج آسمان کو ایسے برسنا ہے۔ جیسے کسی عاشق کی
...محبوب کی واپسی میں جھڑی حارج ہو جائے۔
...بارش تھمے گی نہ وہ جا سکے گا۔

اس اکتاہٹ کے عالم میں اس سیلی ہوا سے
...نار پر ملتے تو لیے کو دیکھے بنا اندر کی جانب مڑ
...اب اس کی نگاہیں صحن کا جائزہ لے رہی تھیں۔

جیسا بے رنگ اور اجاڑ اس کا کمرہ تھا۔ صحن اس سے بھی بڑھ کر تھا۔ ایک طرف آرا مشین نصب تھی اور دوسری طرف لکڑ کے ڈھیر...... اور اس سے متعلقہ ڈھیروں سامان......

اس نے دھیان مبذول کرانے کو لکڑی کے ایک بڑے پھٹے کو اٹھا لیا، حالانکہ یہ کام کرنے کا دن نہیں تھا مگر......

فضا میں آرے کی گھڑر گھڑر پھیل گئی۔ مٹیالی شلوار پر آدھی آستین والی بنیان پہنے وہ جیسے ہر چیز بھلائے لکڑی کاٹ رہا تھا۔ اس کا دبلا پتلا لانبا جسم پسینے سے تربتر ہونے لگا۔ گلی میں سناٹا تھا، ورنہ گزرنے والا ہر شخص سوچتا......

آج بجلی کی مشین چل رہی ہے لکڑی کاٹنے کے لیے......

☆☆☆

گھر سے نکلتے وقت حمیدہ بوبو کو بارش کا خدشہ تھا۔ جسے اس نے بہانے کی صورت استعمال کرنا چاہا۔ مگر ناکامی ہوئی۔

آج نہیں تو کبھی نہیں یا جیسے آج کے دن کو اس کام کے لیے مبارک ہونے کا یقین دلوایا گیا ہو...... یا......اتنے بہت سارے یا نے اسے الجھا دیا۔ ایسے کہ قدم ڈگمگانے لگے۔ وہ کھیتوں کے درمیان چلنے کے لیے چھوڑے گئے، پتلے راستے پر چل رہی تھی۔ یہاں عام دنوں میں بھی مٹی چکنی ہوتی تھی۔ تو اب کیسے نہ ہوتی۔

جب پتھروں سے نمی پھوٹ جانے کا گمان ہو رہا ہو، اوہ......اس نے ہاتھ کا چھجا بنا کر آسمان کو دیکھا۔ اب وہ برستا یا نہ برستا۔ وہ کچھوے کی چال چلتے ہوئے بھی گھر سے اتنا دور نکل آئی تھی کہ واپسی مشکل تھی۔ منزل سامنے سفید اینٹوں والا بڑا گھر۔

"اللہ کرے، سیف اللہ گھر میں ہی نہ ہو۔" اس نے دعا کی۔

یا پھر وہ یہ کہہ دے گی کہ سیف اللہ گھر میں تھا ہی نہیں، اس کا دل مضبوط ہو گیا۔

لیکن نہیں...... یہ چھپنے والی بات نہیں اور آج وہ یہ کہہ دے گی تو کل کیا کہے گی۔ اس کے قدم سست پڑ گئے حالانکہ منزل دیکھ کر مردہ تنوں میں جان پڑ جانے کا سنا ہے۔

ایک کشمکش، مایوسی، خوف زدگی کے ساتھ...... اس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ یہ ممکن ہی نہیں، یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟ وہ انکار کر کے تھک گئی جبکہ اس کا اصرار جاتا نہیں تھا۔

سچ کہتے ہیں مانگنا بہت مشکل چیز ہے، ہاتھ پھیلانا۔ جبکہ پتا ہو کہ ہماری اوقات نہیں ہے، یا یہ کہ یہ تو مل ہی نہیں سکتا۔ اسے تو یقین تھا مگر......

اپنی کم مائیگی کے احساس اور مایوس سوچوں کی بنتا اسے پتا بھی نہ چلا اور وہ سفید حویلی کا دروازہ بجا رہی تھی۔ اچھا ہوا غائب دماغی کی کیفیت میں تھی ورنہ منزل پر پہنچ کر دستک کے لیے ہاتھ اٹھانا، ایسے لگتا جیسے اعمال نامہ اٹھانے کو کہہ دیا ہو۔

ٹھک ٹھک کی آواز اطراف میں گونجی تو وہ چونکی۔

''اوہ...... تو دروازہ بجا بھی دیا اس نے اب کی بار دستک کے بجائے دروازے پر ہاتھ یوں جمایا جیسے سہارا لینا چاہتی ہو تب ہی جھٹکا سا لگا۔ دروازہ کھل گیا تھا، وہ بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹی۔ آنکھوں میں خوف و گھبراہٹ کا عنصر غالب آگیا۔ سہارے کے لیے ستون تھام لیا، سامنے سیف اللہ بقلم خود موجود تھا۔

''حمیدہ بہن آپ......'' حیران مگر خیر مقدمی مسکراہٹ سے چمکتا چہرا۔

''ہاں......'' حمیدہ نے حلق تر کیا۔ ایک پھیکی مسکراہٹ بھی بھرپور کوشش کا ثمر تھی۔

''آئیں آئیں بسم اللہ......'' سیف اللہ نے دروازے کا ایک پورا حصہ کھول دیا اور خود ذرا سا خمیدہ ہو کر ایک جانب ہو گیا۔ ایسی عزت افزائی پر اس کا دل بڑھنا چاہیے تھا مگر وہ ایسے سکڑا، جیسے بھگونے کے بعد کھدر......

اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے اور ''د بھئی کون آیا ہے'' کی گرم جوش سی پکار سنی۔ سیف کی آواز سارے گھر میں پہنچی تھی۔ جب ایک طر سے سیف کی بیوی شمیم اور دوسری طرف سے ناہید نکل آئیں۔ رنگلے پایوں والے پلنگ پر پھیرتی آپا جی نے بھی مڑ کر دیکھا۔ حمیدہ کی ہتھیلی سے پسینہ پھوٹا۔ یہ شمیم کی باہر ملک رہنے والی بہن تھیں، جو آدھا سال ادھر رہتی تھیں، آ ادھر...... اسے پتا ہوتا تو وہ کم از کم ان کی موجو میں تو نہ آتی۔ وہ بہت صاف گو اور زیرک عور تھیں، چہرہ پڑھ لیتی تھیں، آئینہ دکھا دیتی تھیں۔

موسم سے لطف اندوز ہونے کے نام پر اس مہمان داری کے لوازمات بڑے سے صحن کے میں سجا دیئے گئے۔ دو رنگین پایوں والے پلنگ موڑھے اور درمیان میں بھری ہوئی لکڑی کی میز پر سفید کروشیہ کا کور ڈالا گیا تھا۔ حمیدہ نے ایک سے دوسری نظر نہ ڈالی۔

چائے، پکوڑے، حلوہ، آم کی چٹنی اور سو کا زردہ۔ ایک پلیٹ نمکو سے بھری تھی، اسے اہتمام بھی اپنی اوقات سے بہت، بہت زیادہ ایسا نہیں تھا کہ وہ ان سے کم ذات تھی، یا کوئی اور رشتے داری تھی، بھلے سے بہت دور...... دور کی جو وہ بات کرنے آئی تھی وہ...... اصل فساد اسی میں جو اس کی جھکی نگاہوں کا بار تھا

''آپ تو کچھ لے ہی نہیں رہیں حمیدہ باجی'' شمیم نے ٹوکا۔ سب نے تائید کی اور اٹھ اٹھ کر کتنی چیزیں اس کی پلیٹ میں بھر دیں، اس نے سر چادر کو بلا وجہ درست کیا۔

''آپ تو گھر سے نکلتی ہی نہیں۔'' سے شر ہونے والی بات موسم حالات فصل، بیماری، خوش سے ہوتے ہوتے یہاں تک آگئی کہ کہنے کو بچا۔

سب نے حمیدہ کی کھوئی کھوئی سی کیفیت م

ن چار بار اس سے ''آپ ٹھیک ہیں'' بھی یا۔ وہ بدقت سر ہلا سکی۔ اسے یقین ہو گیا، وہ دیر میں کچھ بھی کہے بغیر رخصت طلب کر رہی مگر تب ہی جیسے کسی نے صحن میں پھلجھڑی چھوڑ

یہ زہرہ کی آمد تھی۔ وہ اپنی آٹھ ماہ کے گل ننھے بھتیجے حمزہ کے واکر کے پیچھے بھاگتی ہوئی آئی بیک وقت بولتے ہنستے اور اچھلتے ہوئے سب کو بہت اہم بات بتا رہی تھی۔ حمیدہ کا کپ والا دوں سے لگا رہ گیا۔

سفید شلوار جس پر رنگین دھاگوں سے شیشے تھے۔ سفید دوپٹا اور رنگ برنگی قمیص پہنے وہ اس نہیں بڑھ کر حسین لگ رہی تھی جیسی کہ بیان کی حالی تھی۔

ہ کیا حیرت اگر...... ہاں کیوں حیرت اگر......

اس کے دل کے اندر سے آواز ابھری۔ اسے ''اصرار'' جائز لگنے لگا۔ جیسے نکاح کے بعد مرد و عورت کا رشتہ جائز ہو جاتا ہے۔ سیاہ دوپٹے میں جیسے گوش مقید تھے، اس کی لانبی گردن میں زنجیر تھی، جو ے گاؤں میں کسی کے پاس نہ تھی اور جو سیف اللہ وہ سے واپسی پر مکہ مدینہ سے لائے تھے۔ دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں شیشے کا سیاہ چھلا۔ وہ بے طرح ٹی کا اظہار کرتے ہوئے تالی بجا رہی تھی۔ ہنستے ئے اس کی گردن پیچھے کو ڈھلک گئی تھی۔ کچی نہیں اور کھلے دہانے سے دکھائی دیتی موتیوں کی لڑیں، حمیدہ کی ہتھیلیوں سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ وہ ''ہاں'' پر قائم ہو گئی تھی۔

زہرہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ناہید سے کہا۔ ناہید چونکی پھر اس کا سر انکار میں ہلا۔ زہرہ بھی کو گھورا پھر یک دم اس نے سیف اللہ کے کے سے منہ جوڑ کر سرگوشی کی۔ باپ نے بغور سنا اثبات میں سر ہلا دیا۔ ساتھ ہی اس کے ہاتھ کا کپ لیا۔ حمیدہ کے اندر پلتی مایوسی کا بوٹا چھتنار شمیم کی آپا جی، حمیدہ کے چہرے کی ادھیڑ بن کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''اچھا چلتی ہوں۔'' وہ کھڑی ہو گئی۔ یہ وہ کچھ کہنے آئی تھی اور کہے بغیر جانے کو پر تول رہی تھی۔

''بیٹا دیا ہو حمیدہ! گھر میں دل لگ جائے گا۔ سال بعد ویڑے میں ایسے ہی گڈے گڈیاں کھیلیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ ——'' ان کا اشارہ حمزہ کی طرف تھا جو واکر پر زور زور سے ہاتھ مار رہا تھا۔

''بلکہ بیاہنے کی عمر تو کب کی ہوئی ہے۔'' آپا جی نے حمیدہ کے اڑتے رنگ کو دیکھتے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

''آپا جی ٹھیک کہہ رہی ہیں حمیدہ باجی!'' شمیم نے سرعت سے کہا۔ سیف اللہ بھی متوجہ ہو گئے۔

''ہاں، میں بھی اسی لیے حاضر ہوئی تھی۔''

اس کا جملہ سادہ مگر انداز مودبانہ ہو گیا تھا، جیسے قرضے کی درخواست دینی ہو۔

''اسی لیے...... مطلب؟'' ناہید چونکی۔ اس نے بھنویں ملا کر پہلے حمیدہ کو پھر ساس سسر کو دیکھا۔

''بیٹے کے رشتے کے لیے ہمارے گھر......''

شمیم اور سیف اللہ کے چہروں پر سادگی آمیز الجھن تھی جبکہ آپا جی کی نظریں تیغ ہو گئی تھیں۔

بے ساختگی میں نکلے جملے پر حمیدہ گڑبڑا گئی تھی۔ ناہید کا لہجہ اور آپا جی کی آنکھیں نہ بدلتیں تو شاید وہ کہہ بھی دیتی مگر...... اسے آگے کے جملے بھول گئے۔ جیسے استاد کی تختی پر بچے ساری رات کا رٹا بھول جاتے ہیں (رٹا تو اسے بھی لگوایا گیا تھا، بیٹے نے وہ بھی ایک رات نہیں...... پتا نہیں کتنی راتوں اور دن سے......)

''نہیں وہ......'' نجانے کتنی دیر لگی نیا جملہ موزوں کرنے کے لیے۔ اس نے ارادتاً ناہید اور آپا جی کی طرف سے رخ پھیر لیا۔

''کوئی رشتہ اگر ہو نظر میں تو...... میرے بیٹے کے لیے تمہارے سامنے کا پلا بڑھا بچہ ہے۔ سارے عیب ثواب سے واقف ہو تم...... میں تو کبھی اس گاؤں سے نکلی ہی نہیں۔ تم دس گاؤں کو جانتے ہو،

نام ہے اگر بات چلاؤ گے تو......"

حمیدہ اب سبق نہیں پڑھ رہی تھی، وہی کہہ رہی تھی جو وہ سوچتی تھی، چاہتی تھی۔

سیف اللہ خوش دلی سے سن رہے تھے، جبکہ آپا جی کے ماتھے کی سلوٹیں بڑھ چکی تھیں۔

☆☆☆

ایسے سریلے موسم میں جب خنکی پھولوں کی چادر بن کر ہر تن سے لپٹ گئی تھی۔ اس کے موئے بدن سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ دفعتاً اس کے آرا چلاتے ہاتھ جھٹکے سے رک گئے۔ وہ جہاں کا تہاں ٹھہر گیا تھا پھر اس کی نظروں نے جنبش کی۔ وہ لکڑی کے دو پاٹوں والے کھلے دروازے کی سمت دیکھ رہا تھا۔ کچی سڑک۔ اور آم کے باغ کی کچی چارفٹی دیوار اور ہوا...... ہوا ہی پیامبر بنی ہوگی، اس کی آمد کا اعلان کرنے والی...... لیکن وہ نہ تو عطر لگاتی تھی، نہ چھاجھر چھنکاتی تھی، مگر پھر بھی وہ آرہی تھی۔

وہ یک دم سیدھا کھڑا ہوگیا، تب ہی وہ جھونکے کی طرح اس کے سامنے سے گزر گئی، ہمیشہ کی طرح اس کی موجودگی سے بے خبر...... بے نیاز۔

اور بے خبر ہونے پر معافی مل سکتی ہے، ہم جانتے ہی نہیں۔ ہمیں پتا ہی نہیں کسی نے بتایا جو نہیں مگر بے نیاز ہونے پر...... جانتے بوجھتے انجان بن جانے والے لوگ، ایسوں کو تو کڑی سزا دینی چاہیے۔ دماغ نے کہا مگر دل، نہیں نہیں کی گردان کرتا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ نظروں سے اوجھل ہوجاتی۔ وہ دروازے کی سمت بھاگا اور دونوں بازو دائیں بائیں پھیلا کر چوکھٹ پر جمادیے۔ ہاں وہ موڑ مڑنے کو تھی، اس کے نصیب میں اس کی پشت تھی۔ پتلی کمر پر۔ ناگن کی طرح ڈولتی چوٹی دائیں بائیں۔ پھر وہ دائیں جانب مڑ گئی، اس نے طویل سانس بھر کے تاحدِ نگاہ دیکھا، اس جانب عام دنوں میں کوئی نہیں آتا تھا۔ تو آج تو ویسے بھی بھیگا چکنا رستہ مانع ہوگیا تھا۔

اس نے اپنے سراپے پر نگاہ کی، اس کی بنیان پر لکڑی کا برادہ چپکا ہوا تھا۔ بالوں اور داڑھی میں بھی برادہ اٹکا ہوا تھا۔ بنیان سے جھلکتے سینے کے بال اور بازوؤں کے بالوں پر، کسی کے بھی سامنے جانے کے لیے حلیے کی درستگی ضروری تھی۔

لیکن اس نے کون سا سامنے پیش ہونا تھا۔

اس نے تو ہمیشہ کی طرح چھپ کر دیکھنا تھا۔

اور چھپ کر دیکھنے والوں کے لیے تن کا اجلا ہونا ضروری نہیں اور نہ من کا، سو وہ اپنی میلی آنکھیں اتنی میلی کہ پاکیزگی کی حد سے گزر جائیں جنہیں دھونے کے لیے سات دریاؤں کا پانی بھی کم ہو۔ وہ اپنی ایسی میلی آنکھیں اس پر جمائے کھڑا تھا ایسی جگہ، جہاں سے وہ سب دیکھ سکے مگر اسے کوئی نہ دیکھ پائے۔

☆☆☆

"لو جب میں نے ایک بار رشتہ کرنے کی بات کی تھی، تو حمیدہ بولی 'بیٹا نہیں مانتا۔'" شمیم نے ناہید کی سمت دیکھا، ناہید نے سر ہلایا۔ "حالانکہ اچھا رشتہ تھا۔ لڑکی خوش شکل بھی تھی، عمر بھی مناسب تھی، سب سے بڑھ کر لڑکی راضی تھی۔"

"مگر اسے تو مطلقہ سے نہیں کرنی تھی ناں۔" شمیم نے وثوق سے کہا۔

"کیا اس نے اپنے منہ سے کہا تھا یہ۔" سیف اللہ نے چونک کر پوچھا۔ ان کی عادت تھی جب انہیں کسی کام کے لیے کہا جاتا یا وہ ہامی بھر لیتے اسے پایہ تکمیل تک لازمی پہنچاتے تھے اب جو یہ حمیدہ اتنے فدویانہ ڈرے جھجکے انداز میں رشتہ کروانے کہنے آئی تو انہوں نے بات مکمل ہونے سے پہلے دل ہی دل میں ارادہ باندھ لیا۔

غریب بیوہ، بیمار رشتے کی بہن جو بیوگی کے بعد ان کے باپ کے پاس گود کے بیٹے کو لیے آ بسی تھی اور ان کے باپ نے ترس کھا کر پہلے اپنے گھر میں اور بعد میں گھر سے دور اپنی ہی زمینوں پر کمرے ڈال دیئے تھے۔

خوشی، غمی پر سیف اللہ نے اپنے بڑوں کو حمیدہ سے محبت شفقت کا برتاؤ کرتے دیکھا تھا۔ باپ کا یہ وصف ان کے اندر بھی آیا لیکن حمیدہ کو اپنی اوقات کا اندازہ تھا۔ وہ فاصلہ رکھ کر ملتی تھی، اخلاقی مدد کے علاوہ انہوں نے کبھی کھوٹے سکے کی چاہ بھی نہیں دکھائی تھی۔

الٹا وہ سفید حویلی والوں کے کتنے ہی کام نبٹا دیا کرتی تھی۔ اپنی حیثیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے بھرم قائم رکھنا کسی کو سیکھنا ہوتا تو حمیدہ سے سیکھ لیتا۔

اسی لیے سیف اللہ نے پوچھا تاکہ انہیں علم ہو حمیدہ کا بیٹا کس قسم کی بیوی چاہتا ہے۔ اس طرح انہیں رشتہ ڈھونڈنے میں آسانی رہتی۔

"ہاں اڑتے پڑتے سنا تھا، ورنہ اور کیا وجہ ہوتی تھی انکار کی اور رہا حمیدہ کا بیٹا۔ خود کو ایک بار آئینے میں دیکھ لیتا مگر ناں جی، آج کل کے لونڈے۔"

"تیس سال کا تو ہوگا۔" سیف اللہ پر سوچ انداز میں بولے۔

"مجھے تو سچی بات ہے حمیدہ بوبو پر ترس آرہا تھا۔ بیٹے کا رشتہ کروانے کی بات کرنی اتنی مشکل ہو رہی تھی، چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ بار بار تھوک نگل رہی تھیں۔ جیسے کام نہ کہہ رہی ہوں، ہمارے گھر میں سے حصہ مانگ رہی ہوں۔" ناہید کو حمیدہ بوبو کی ہچکچاہٹ یاد کر کے ہنسی آنے لگی، ایسی بھی کیا گھبراہٹ۔

"ایسی ہی سیدھی ہے حمیدہ!" شمیم نے مسکرا کر سب کو دیکھا۔ "ورنہ بیٹوں کی مائیں رشتے کی بات کرنے جائیں تو آنکھیں ماتھے پر رکھ لیتی ہیں، اتنا غرور توبہ توبہ۔ اوپر سے بہو کے لیے جو شرائط بتاتی ہیں اف......" شمیم نے جھرجھری لی۔ ناہید ایک بار پھر ہنس دی۔ سیف اللہ نرمی سے مسکرانے لگے۔

"عاجزی وانکساری اللہ کو پسند ہے اور یہ بیٹے کے رشتے میں بھلا کس چیز کا غرور۔ بیٹا سونے کا بھی ہو، جاتے تو مانگنے ہی کے لیے ہیں ناں۔ کسی سے کی بیٹی، تم عورتیں بھی۔" سیف اللہ نے بڑی گہری بات بہت سادگی سے کہہ ڈالی۔ ناہید اش اش کر اٹھی، کچھ شرم سار بھی ہوگئی۔ شیم نے لاپروائی سے ہاتھ جھٹکا۔

"تمہارے اباجی تو ساری دنیا سے الگ باتیں کرتے ہیں، اگر لوگ اتنی گہری بات کو سمجھ لیں کہ بیٹی کے لیے جھولی پھیلانی پڑتی ہے تو سارا فساد ہی ختم ہو جائے۔"

"بہرحال" ناہید نے سوئے ہوئے حمزہ کو بعد احتیاط سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جب کہیں رشتہ ڈالنے جائیں تو بوبو کو تھوڑا سمجھا دینا کہ پتر کی مائیں کیسے گردن اٹھا کر بیٹھتی ہیں۔" وہ بچے کو کمرے میں لے کر جا رہی تھی، شریر انداز سے سیف اللہ کو دیکھا۔ جو سمجھ کر مسکرائے تب ہی نگاہ آپا جی پر پڑ گئی۔ انہیں احساس ہوا وہ بالکل خاموش تھیں۔ اس سارے تبصرے میں مجال ہے جو ایک لفظ بھی بولی ہوں، بلکہ ان کے چہرے پر ایک کرختگی آمیز خاموشی تھی جس میں استہزاء کا عنصر غالب تھا۔ سیف کی نگاہوں کے تعاقب میں شمیم اور ناہید نے بھی دیکھا۔

"آپ کچھ نہیں بولیں آپاں جی!" ناہید نے بچے کا شانہ بدلا۔

"حمیدہ بوبو کیسے بات کہہ رہی تھیں، ایک بار بھی نظر نہیں اٹھائی۔" آپا جی کی خشمگیں نگاہوں نے باری باری سب کو دیکھا۔ سب ایک دوسرے کو استفہامیہ انداز سے دیکھنے لگے۔ آپاں جی کی تسبیح کے تین چار دانے ایک ساتھ گرے۔ پھر انہوں نے تسبیح مٹھی میں بند کرلی۔

"بے وقوف ہو تم سارے، وہ رشتہ کروانے کی بات کرنے نہیں آئی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کا رشتہ تمہاری بیٹی کے لیے لائی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ آ تو گئی مگر یہاں بیٹھ کر اس کا منہ نہیں پڑا۔"

"ہماری بیٹی کے لیے۔" تینوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا، وہ آپاں جی کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے ان کی جگہ ان کا بھوت بیٹھا ہو۔

☆☆☆

کبھی کسی نے پنجرے میں قید ان نر، مادہ پرندوں یا جانوروں کو دیکھا ہے، جو اول روز سے ایک ساتھ ہوں لیکن پھر ایک دن اچانک نر کو پنجرے سے نکال دیا جائے اور مادہ کو اندر ہی چھوڑ دیا جائے۔ تب نر جس بے چینی و دیوانگی سے پنجرے کے گرد چک پھیریاں لیتا ہے، جس سمت مادہ کا منہ ہو، وہ اس سمت کی طرف بھاگ بھاگ کر ہانپ جاتا ہے مگر رکتا نہیں۔

وہ اس وقت اسی نر کی طرح بے قرار و بے بس تھا۔ آم کے باغ کی چھوٹی سی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا وہ دسیوں بار جگہ بدل چکا تھا۔ وہ جس طرف چہرہ کرلیتی وہ لپک کر اس سمت آجاتا۔ بے آواز قدم، ترسی نگاہیں، سوکھے ہونٹ جنہیں وہ بار بار تر کرتا تھا مگر اس بے قراری کے عالم میں بھی اسے خود کو مخفی رکھنا یاد رہتا تھا۔ وہ کسی صورت عیاں نہیں ہونا چاہتا تھا۔ عیاں ہوجاتا تو اس طرح دل بھر کے دیکھنے بلکہ ہر طرح سے دیکھنے کا موقع گنوا دیتا اور یہ بڑا خسارے کا سودا تھا۔

اسے دیکھنے بلکہ دیکھتے رہنے کی چاہ...... نہیں چاہ نہیں، ہوس...... ایسی تھی کہ وہ اپنے محبوب کے ساتھ کھڑی تھی اور اسے تنہا دکھائی دیتی تھی۔

عجب حال تھا، عقل سے، سمجھ سے بالاتر......

اتنے گہرے سناٹے میں بھی وہ ان دونوں کی باتیں نہیں سن پا رہا تھا۔

پر سننے کی خواہش تھی بھی کسے، دیکھتے رہنے کی ہوس، سننے جاننے کے خیال کو رد کردیتی تھی۔

وہ درخت کے چوڑے تنے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ گھٹنا موڑ کر پیر تنے سے جوڑ رکھا تھا، دونوں ہاتھوں سے اپنے دوپٹے کے دھاگے نوچتے ہوئے وہ کبھی نظریں جھکالیتی۔ کبھی اٹھا کر مقابل کے چہرے کو محبت پاش نگاہوں سے دیکھ لیتی۔ پھر جیسے تاب نہ لاکر نظر جھکاتی تھی، وہ اس کے عین سامنے کھڑا تھا۔ لمبا ہاتھ اس کے شانے کے عین اوپر تنے پر ٹکا تھا۔

"اللہ جانے موضوع گفتگو کیا تھا۔" وہ سو لگا۔

"کیا ہوگا" چند لمحوں بعد اس نے خود کو ڈپ

"کیا ہوسکتا ہے بھلا اس کے سوا...... ایسی حسی مورت سامنے کھڑی ہو، تو وہ اسے تفسیر تو سنانے رہا۔"

وہ اسے وہی سب کہہ رہا ہوگا جو ایک جوان م ایک جوان اور بلا کی حسین عورت سے کہہ سکتا ہے اس کے حسن و جوانی کو کھل کر سراہنے کا موقع کو بے وقوف جانے دیتا ہے، اس کے ہونٹوں پر زہر مسکراہٹ چمکی۔

"اور اس کو دیکھو، کیسے چسکے لے کر سن ر ہے۔" اس نے کھول کر دل ہی دل میں تبصرہ کیا۔

"ورنہ اور کیا باتیں ہوسکتی ہیں، تنہا کھڑے م و عورت کیا باتیں کرسکتے ہیں بھلا۔" اس کی سوئی ا عریاں سوچوں سے آگے بڑھتی ہی نہ تھی۔

وہ صرف اس کی جھکی نگاہیں دیکھ رہا تھا، ا اس کے مقابل سے کوئی دلچسپی بظاہر نہیں تھی ورنہ ا نگاہ غلط بھی دیکھتا تو جان لیتا۔ اس کی آنکھوں پاکیزگی تھی اور بہت زیادہ محبت اور احترام و خیال مان...... اور وہ سب جو ایک عورت اپنے لیے م آنکھوں سے چاہتی ہے۔

اور ایک آنکھ اس کا خود کا دیکھنا تھا اور دیکھنے کی قسمیں ہوتی ہیں۔ دیکھنے کا بھی طریقہ ہوتا دیکھنا ہی تو سب کچھ ہوتا ہے۔

نظر پتھر پھاڑ ہوتی ہے، نظر کھا جاتی ہے برہنہ ہوتی ہے۔ وہ خوب صورت لباس میں تھی سے پیر تک ڈھکی، مگر وہ اسے لباس پرے کرکے رہا تھا، یا سوچ رہا تھا۔

باتیں کرتے کرتے وہ دونوں چلنے لگے کا پلو سرک گیا۔ اس کا ہم قدم ٹھہر گیا، گرے پلو کر اس کے سر پر ٹھہرا دیا۔ وہ چونک گئی، پھ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پلو سنبھال لیا۔

اور ایک وہ تھا جو اس کے پیچ و خم جانچنے کے لیے بھوکے شیر کی طرح جگہ بدل رہا تھا۔

☆☆☆

اتنے خوب صورت موسم میں اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے اسے اپنا آپ ہواؤں میں اڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ یا پھر وہ کچی پھسلتی چکنی زمین پر نہیں کہکشاؤں پر چل رہی ہو۔ وہ لمبے قدم اٹھاتا تھا، وہ دفعتاً رک گئی۔

"اسے ساتھ چلنا نہیں کہتے۔" اس نے پیچھے سے ہانک لگائی۔ وہ چونک کر مڑا، وہ کافی پیچھے کھڑی تھی۔

"میں تو ساتھ لے کر نکلا تھا، تم ہی پیچھے رہ گئیں۔" اس نے تاحد نظر علاقے کو دیکھا۔ وہاں ان کے علاوہ کوئی ذی روح نہیں تھا (وہی غلط فہمی...... پھر سے) سو اس کا انداز شوخ و متبسم ہوگیا۔

"اور تمہیں پتا بھی نہ چلا۔" اس نے گلہ کیا۔

"چل گیا تھا پتا۔" وہ ہنسا۔

"مجھے پتا تھا تم نے بھاگ کر آجانا ہے۔" وہ خفگی سے اسے گھورنے لگی۔

"جتا نہیں رہا، تمہاری عادتوں سے واقفیت کا بتا رہا ہوں۔"

"اتنا جانتے ہو مجھے۔" اس کا دل نئی لے پر دھڑکنے لگا۔

"اس سے بھی زیادہ۔"

"اچھا تو بتاؤ، میں اب کیا چاہتی ہوں۔" اس نے سینے پر بازو لپیٹے اور شاہانہ انداز سے گردن اٹھائی۔

"امتحان لے رہی ہو؟" وہ زیر لب مسکرایا۔

"ہوم ہوم......" اس نے ہونٹ سکوڑ کر آواز نکالی۔ دونوں کا درمیانی فاصلہ ہنوز برقرار تھا۔ اس نے قدم اٹھایا، پہلا، دوسرا اور تیسرا......

"تم چاہتی ہو کہ میں واپس آؤں۔" وہ مسلسل آگے بڑھ رہا تھا ایسے کہ غیر ارادی طور پر وہ دو قدم پیچھے ہوئی۔ "اور تمہارا ہاتھ پکڑ کر تمہیں ساتھ لے کر آگے بڑھوں۔ ہے ناں......" اس نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔

"اوہ......" اس نے بوکھلا کر ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔" تو دراصل ساری طراری زبان سے بولنے کی حد تک تھی۔" "کہ میں کسی سے نہیں ڈرتی، تم ڈرتے ہو۔

تم کبھی کچھ نہیں کہتے، میں کہتی ہوں۔ تم یہ...... میں وہ......"

اور اب جب اس نے دو جملے کہے اور چار قدم بڑھا کر فقط ہاتھ پکڑا تب وہ مائع ہوگئی۔

"ہاتھ چھوڑو۔"

"بالکل نہیں، اب ہاتھ پکڑ کر ہی لے کر جاؤں گا۔" اس نے جیسے دعویٰ کیا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"سارے رستے تک؟"

"ہاں۔" اس نے گردن اکڑائی۔

"گھر کے اندر بھی۔" اس کی بے یقینی انتہا پر تھی۔

"ہاں، اس میں کون سی بڑی بات......" اس نے شانے اچکائے۔

"اچھا۔" اسے ذرا یقین نہ آیا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرایا۔

"بھائی عبداللہ......" اس کے پیچھے نگاہ ڈال کر وہ یک دم گھبرائی تھی۔ اس کا ہاتھ جھٹکے سے چھوڑ دیا گیا۔ ساتھ ہی وہ لٹو کی طرح گھوما۔

مگر یہ کیا، پیچھے تو کوئی نہ تھا دور، دور تک بھی، ہاں فضا میں اس کے نقرئی قہقہے کی گونج تھی۔

"سارے راستے۔" وہ پیٹ پکڑے جھک گئی۔

"گھر کے اندر بھی۔" اس نے مہارت سے اس کے لہجے کی نقل اتاری۔ وہ بری طرح جھینپ گیا تھا، اسے گھورا تو وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا جھکی۔

"جی......" جیسے اس سے بڑھ کر تابعدار دوسرا کوئی نہیں۔

"تم......" وہ بے بسی آمیز غصے سے اسے دیکھنے لگا۔

"میں......" وہ فدوی بن گئی اور وہ اسے گھورنے لگا جو پھر سے ہنس دی تھی۔ بے ساختگی، بے خودی اور بے پروائی...... اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پھر فضا میں اس کی ہنسی میں اس کا بھرپور مردانہ قہقہہ بھی گونجنے لگا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو ہنستا دیکھا تو مزید ہنسی آ گئی۔ ہنسی کا اگر رنگ ہوتا تو دونوں قوس قزح کے بیچ کھڑے تھے۔

ہنسی راگ ہوتی......تو یہاں ملہار چھڑ تا۔

ہنسی خواب ہوتی تو...... دونوں تعبیر معلوم ہوتے

ہنسی دعا تھی......تو جیسے پوری ہوگئی تھی۔

تب ہی دور فضا میں موٹر سائیکل کی آواز گونجی۔ یہ سائلنسر نکلی بائیک تھی۔ دونوں بری طرح چونکے، آواز قریب آ رہی تھی۔

"کرم...... یہ تو کرم کی بائیک لگتی ہے۔" وہ بری طرح خوف زدہ دکھائی دینے لگی۔

"ادھر آؤ۔" اس نے اس کا ہاتھ دبوچا اور اسے لیے آڑ میں ہوگیا۔

دونوں کو سانپ سونگھ گیا تھا، اگر وہ دیکھ لیتا۔

اس نے اپنے ہاتھ کے دباؤ سے اسے بے فکر رہنے اور اپنے ساتھ ہونے کا یقین دلایا۔ وہ پھیکی مسکراہٹ سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

آنے والا کرم ہی تھا۔

"یہ کہاں سے آ گیا؟" وہ ہونٹ کچلنے لگی۔

"یا اللہ......" وہ تو کچھ آگے جا کر رک گیا تھا۔

کیا اس نے انہیں دیکھ لیا تھا۔

اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر ابھری۔ وہ رک کر فون سن رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی۔ وہ گھر جائے گا اور جب اسے نہیں پائے گا تو......اور اگر وہ یہیں ٹھہرا رہا تو وہ گھر۔ ہی نہ جا پائے گی اور اگر......

تب ہی کرم نے فون جیب میں رکھا اور بائیک کو واپس موڑا۔ وہ گاؤں میں داخل ہوتے ہوتے واپس پلٹ گیا تھا۔ اس کی...... نہیں ان دونوں کی اٹکی سانسیں بحال ہوئیں۔ ساری شوخی ہوا ہوگئی تھی، وہ اس کا ہاتھ تھامے، تھامے آڑ سے باہر نکل آئی۔

"اس طرح سے سب سے چھپ کر ملنے آنے والی لڑکیاں اچھی نہیں ہوتیں نا۔"

"میں یہ نہیں کرنا چاہتی فخر! لیکن پھر اور کیا کروں۔" اس نے ہونٹ کچلے۔

"اوں ہوں......" وہ اسے رو پڑنے سے روکنا چاہتا تھا مگر جملہ منہ میں رہ گیا۔ اس بار کرم نہیں تھا، گاؤں کے شوخ منڈے تھے جو موسم کی ترنگ میں موٹر سائیکلیں لے کر نکلے تھے۔

"اندر ہو جاؤ۔" اس نے برق سی تیزی سے اسے دوبارہ آڑ میں دھکیل دیا اور خود ایسے کھڑا ہوگیا جیسے جوتے سے کیچڑ ہٹا رہا ہو۔

"او کیا ہوگیا فخر صاب!" ایک، ایک کر کے ساری بائیکس اس کے سامنے آ رکیں۔

"آں...... نہیں......" اس نے چونکنے کی اداکاری کی۔ "بس وہ یہ......" اس نے جوتے کو پتھر پر رگڑ دیا۔ "موسم خراب ہے آ جاؤ، ہم گھر کی طرف جا رہے ہیں۔" ایک نے اپنے پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں، میں چلا جاؤں گا۔" اس نے آرام سے منع کیا۔

"اوئے تکلف نہیں کر یار، آ جا۔"

"میں چلا جاؤں گا۔ موسم...... اچھا لگ رہا ہے اس طرح چلنا......"

"چل بھئی تو کہتا ہے تو مان لیتے ہیں۔ آ ؤ بھئی......" سب نے کِکس لگائیں، فخر نے ہاتھ ہلا کر انہیں رخصت کیا اور دزدیدہ نگاہوں سے اس طرف دیکھا جہاں اسے چھپایا تھا۔ وہ دبکی ہوئی تھی۔

"میں نہیں چاہتا تھا ان میں سے کسی کی بھی نظر پڑتی۔" وہ تو جیسے چیٹ کر رہا تھا۔

"میں بھی......" وہ پژمردہ نظر آئی تھی۔

"آؤ تمہیں گھر تک چھوڑ دوں۔" وہ یک

[ج]نونی کا مظاہرہ کرنے لگا۔

"نہیں۔" اس نے اپنے گرد دوپٹا لپیٹا۔ ایک [چ]ھُپ کر ملاقات کا انجام اچھا نہیں رہا تھا۔ دل ملال [س]ے بھر گیا تھا، جب ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ ایک [دس]ترخوان پر کھاتے تھے تو محبت کا احساس نہ تھا [ح]الانکہ وہ تھی۔ پھر دوری آ گئی۔ تب پتا چلا کہ ایک [د]وسرے کو دیکھتے رہنا کتنا ضروری تھا جیسے سانس لینا، ہر ملاقات کے بعد دونوں عہد کرتے وہ آئندہ اس طرح سے نہیں ملیں گے (پہلے ہی کیا کم مصیبت تھی) مگر پھر دونوں کی "بس" ہو جاتی تھی۔

"میں خود چلی جاؤں گی، خوامخواہ کسی نے دیکھ لیا تو......" اس کا خدشہ غلط نہیں تھا۔ دونوں کا نام [ج]ھنڈے پر چڑھا کر لہرا دیا جاتا۔ وہ دونوں ایسا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ وہ سر ہلانے لگا۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔ میں دیکھ رہا ہوں تمہیں۔" اس نے اجازت دی۔

"سنبھل کے، آگے کیچڑ ہے۔" وہ تیزی سے بولا۔ "اور دوپٹا اچھی طرح لپیٹو۔" وہ بہت حساس تھا اس کے لیے۔ وہ مسکرا دی۔ اس کی ہدایت پر عمل کیا اور قدم بڑھا دیے۔

وہ تب تک اسے دیکھتا رہا۔ جب تک وہ موڑ مڑ نہیں گئی، آگے کی سیدھی سڑک اس کے گھر سے جا ملتی تھی۔ وہ مطمئن ہو کر اپنی راہ پر چلا۔ اس کے قدم دھیمے تھے، وہ محتاط تھا۔ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ دونوں آگے پیچھے گلی میں داخل ہوں اور کسی کو شک بھی گزرے۔

اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ کر اس نے اس کے دروازے پر نظر ڈالی۔ وہ پہنچ گئی ہوگی۔ اس سے پہلے نکلی تھی اور چھوٹا راستہ استعمال کیا تھا۔

وہ اپنے گھر میں داخل ہوگیا، یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ وہ گھر نہیں پہنچی تھی اب تک...... کیونکہ اسے راستے ہی میں کسی نے روک لیا تھا۔

☆☆☆

"زہرہ کا رشتہ......" شمیم نے دل ہی دل میں دہرایا۔ ایسی حیرت تھی یا صدمہ کہ زیر لب مسلسل دہرایا جانے والا جملہ کسی کی سماعتوں سے نہ ٹکرایا یا پھر اسے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ منہ سے نکلی کوٹھوں نہ چڑھ جائے یا پھر اس نے یہ بھی سن رکھا تھا۔ منہ سے نکلی باتیں پوری بھی ہو جاتی ہیں۔ اس لیے سوچ سمجھ کر بولنا چاہیے۔

"زہرہ کا رشتہ...... حمیدہ کے لڑکے سے، نہیں۔ حمیدہ نے اپنے بیٹے کے لیے زہرہ کا نام لیا۔"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے آپاں جی۔" سیف اللہ بھی بہت دیر بعد کچھ بولنے کے قابل ہوا۔

"غلط فہمی......" آپاں جی کی تسبیح ساکت ہوگئی۔ "اس عمر میں غلط فہمی نہیں ہوتی سیف اللہ۔" ناہید کی تو بولتی ہی بند ہوگئی تھی، وہ بچے کو گود میں ڈالے چارپائی سے چپک گئی تھی۔

وہ خود بھی تو نو عمر تھی، ابھی دو سال پہلے تو شادی ہوئی تھی۔ گھاگ نہیں تھی، ہاں حمیدہ بوبو جوان سب کے حساب سے اپنے بیٹے کا رشتہ کروا دینے کی درخواست لائی تھی اس کا انداز عجیب سا تھا۔ افسردہ سا، مایوس...... مجرمانہ انداز تھا۔ ناہید نے حمیدہ بوبو کی آمد سے لے کر رخصت تک کے ایک، ایک پل کو یاد کرنا چاہا۔

اس پر یک بیک انکشاف ہوا، آپاں جی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ حمیدہ بوبو کہنے کچھ اور آئی تھی اور کہہ کر کچھ اور گئی۔ اسے دھیان آیا، جب زہرہ، حمزہ کا واکر پر چلاتی لائی تھی۔ حمیدہ بوبو چونکی تھی، گھبرائی تھی اور پھر اس کی نگاہیں جھک گئی تھیں۔

"آپاں جی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" اس نے اب کی بار ساس سسر کو مخاطب کیا۔

"مجھے خود بڑا عجیب سا انداز محسوس ہوا تھا، میں سمجھی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اب پتا چلا ان کی ہمت نہیں ہو رہی تھی منہ کھولنے کی۔" ناہید نے بلا تکان بولنا شروع کر دیا بلکہ اس نے آپاں جی کا شانہ چھوا۔ "مجھے کئی بار یہ محسوس ہوا جیسے وہ زبردستی بیٹھی ہوئی ہیں۔ جیسے کسی نے انہیں بھیجا ہے۔" ناہید کے

جتانے پر سیف اور شمیم کی نظریں آپاں جی کے چہرے پر اٹھ گئیں۔ ناہید کے چہرے پر جوشیلی سی کیفیت تھی تب ہی آپاں جی کے لبوں سے ہنکارے کی صورت اثبات نکلا۔ "وہ خود نہیں آئی تھی اسے بھیجا گیا تھا۔"

"اسے کون بھیجے گا۔" شمیم نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

"کون بھیجے گا۔" جواب ناہید نے دیا۔ "اس کے بیٹے کے سوا......" وہ ایک بار پھر آپاں جی کو دیکھ رہی تھی۔ آپاں جی کی نظریں تائیدی انداز میں اٹھیں اور پھر جھک گئیں۔ ناہید نے فاتحانہ نظروں سے حلق سے عجیب سی آواز نکالی۔

وہ عمر میں آپاں جی جتنی نہیں تھی مگر ان جیسی دوررس سوچ ضرور رکھتی تھی۔

سیف اللہ کا چہرہ متفکر ہو گیا، شمیم کے سخت حیران چہرے پر طیش ابھرنے لگا۔

"اس کی اتنی جرأت۔" اس کی آواز دبی جبکہ لہجہ غضب ناک تھا۔

"شکل دیکھی ہے کبھی اس نے اپنی اور اس حمیدہ کو دیکھو آ کیسے گئی، ایک بار خیال نہ آیا کہ......"

"جہاں بیری ہو وہاں پتھر تو آتے ہیں۔" آپاں جی جو اتنی دیر سے خلفشار میں مبتلا تھیں۔ اب پرسکون دکھائی دینے لگیں، کچھ دیر پہلے کی پھیلائی گئی سنسنی ان تینوں کو بیدار کرنے کے لیے تھی اور وہ جو طیش کے جوار بھاٹے اندر اٹھ رہے تھے۔ کہہ دینے سے وہاں کا تلاطم بھی جھاگ ہو گیا تھا۔ اس لیے روایتی جملہ کہہ کر بات ختم کرنی چاہی مگر شمیم کو اپنے پیٹ کے اندر گولے گھومتے محسوس ہو رہے تھے۔

"بیری پر پتھر آتے ہیں آپاں جی۔ یہ تو پورا گولہ مار دیا گولہ......" سیف اللہ نے چونک کر بیوی کو دیکھا۔

"صحیح کہا آپ نے امی جی۔" ناہید کے لہجے میں ملال تھا۔

"تو پھر اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔" سیف اللہ نے بات کو لپیٹنے کی خاطر غم و غصہ و حیرت کو پرے رکھ کر عقل مندانہ سوال کیا۔

"منہ توڑ دیں جا کر اس کا۔" شمیم نے بھڑک کر کہا۔

"اوں ہوں...... حمیدہ بہن ایسی کوئی بات کرتیں تو ہم جواب دیتے۔ جب انہوں نے بات ہی نہیں کی تو معاملہ خود بخود ختم ہو گیا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ابا جی...... مگر دل میرا بھی یہی کرتا ہے کہ اس کا منہ توڑ دوں، کہاں چاندی زہرہ...... اور کہاں......"

"اوں...... بری بات۔" سیف اللہ داڑھی پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ ناہید نے برا منہ بنایا۔ وہ کسمسانے والے بچے کو جارحانہ انداز سے تھپکنے لگی تھی۔ آپاں جی کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں ان کی تسبیح کے دانے ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ ناہید نے شمیم و سیف اللہ کے متفکر چہروں کو دیکھا۔

"میں تو یہ سوچ رہی ہوں، اگر یہ مان لیا جائے کہ اسے بیٹے نے بھیجا تھا۔ تو وہ اب گھر جا کر اسے کیا کہے گی۔"

☆☆☆

حمیدہ سارا رستہ بجھے دل کے ساتھ مردہ قدم لیے یہی سوچتی آئی کہ وہ کیا بہانے کرے گی۔ کتنا سکھا پڑھا کر بھیجا اسے بیٹے نے اور شاید وہ کہہ بھی دیتی۔ کوئی اشارہ کنایہ ہی دے دیتی اگر جو زہرہ پر نظر نہ پڑ جاتی۔ کہاں زہرہ جیسی اور کہاں اس کا بیٹا...... بیٹے کا سامنا کرنا مشکل تھا، اسے کوئی بہانہ نہیں سوجھ رہا تھا۔

کہنے کو وہ سچ بھی کہہ سکتی تھی مگر پھر اس کا ردعمل۔ وہ اسے تو کچھ نہیں کہتا مگر خود کے ساتھ جو کرتا، دیواروں پر مکے برساتا۔ مٹکا اٹھا کر توڑ دیتا، اپنا سر مارتا۔ ایک بار تو اس نے کسی خواہش کے پورا نہ ہونے پر چولہے سے جلتی لکڑی اٹھا کر اپنے سر پر ماری تھی۔ صحن میں دندناتا پھرتا اور آخر میں گھر سے غائب ہو جاتا اور وہ پیچھے اس کی خیر مانگتی ہلکان ہوتی

تی۔

مگر...... دروازہ کھلا اور وہ نہیں تھا، حمیدہ کے اعصاب پر اس کی غیر موجودگی نے اچھا اثر ڈالا۔ مگر یہ لمحہ بھر کا سکون تھا۔ وہ دروازے سے داخل ہو رہا تھا، اس کے چہرے پر خوشی پھیلی تھی، عجیب رنگ عجیب خمار سا......

"تو کب آئی ماں؟" وہ بولا تو آواز میں بھی خوش گواریت تھی۔

"بس ابھی۔" وہ حیران حیران سی اس کی صورت دیکھنے لگی۔

"کوئی روٹی شوٹی ملے گی کہ نہیں۔"

"میں بس ابھی پکا دیتی ہوں، دو منٹاں میں۔" وہ تیزی سے باورچی خانے کی طرف بڑھی۔ وہ نلکے سے ہاتھ منہ دھونے لگا، اپنے پیر بھی ایک دوسرے سے رگڑ کر خوب دھوئے پھر چارپائیاں بچھا دیں اور ننگی چارپائی پر لیٹ گیا۔

شام میں ابھی وقت تھا مگر موسم کی سیاہی اور سناٹے نے ابھی سے شام کا سماں باندھ دیا تھا۔ روٹی ڈالتے کٹوری میں سالن ڈالتے ــــــ اس کی نگاہیں بیٹے کی سمت تھیں۔

اس کا تو خیال تھا وہ کہیں راستے میں ہی کھڑا ہو گا جبکہ وہ گھر میں ہی نہ تھا اور اب پوچھتا نہیں تھا۔ تو کیا وہ خود سے بولنا شروع کر دے مگر کیا؟

اس سے اچھا نہ ہوتا وہ بات کر لیتی اور انکار سنا کر قصہ مکا دیتی مگر یہ بھی سوچنا آسان تھا مگر کرنا، حلق میں چھچھوندر اٹکی والی بات ہو گئی یہ تو......

اس نے ڈرتے ڈرتے اس کے آگے کھانا لا رکھا، جس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

"کیا وہ جاگتے میں خواب دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔" ملال اس کے گلے میں پھندے کی طرح اٹک گیا۔

ابھی وہ اس سے پوچھے گا ماں جس کام سے بھیجا تھا، وہ کر کے آئی ہے ناں۔

اور جب وہ انکار کرتی یا جھوٹ سچ بول دیتی تب وہ طوفان اٹھا دیتا۔ اس سے جھگڑنے میں وہ بھول جاتا تھا، سامنے ماں کھڑی ہے۔

مگر حمیدہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی، اسے جیسے کچھ یاد ہی نہ تھا۔

وہ گرد و پیش کو بھلائے سر ہلا، ہلا کر رغبت سے کھانا کھا رہا تھا حالانکہ سالن اس کا پسندیدہ نہیں تھا۔ اسے گوشت مرغوب تھا۔ جبکہ کٹوری میں کریلے پیاز تھے۔ کون سا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی تھی، کھانے کے بعد چائے بھی نہ مانگی جبکہ عادت یہ تھی کہ آخری لقمے کے ساتھ چائے کا کپ حاضر ہونا چاہیے تھا۔

ذرا سی دیر میں وہ ماں کو بھی نہیں بخشتا تھا اور آج چائے اتنی ٹھنڈی ہو گئی کہ اس پر سیاہ تہ جم گئی پھر اس تہ کو بارش کے قطروں نے توڑ دیا۔ چائے کی پیالی لبریز ہو کر کب چھلک پڑی، اسے ہوش ہی نہ تھا۔

کھلے آسمان تلے دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنائے کہنیاں ٹکائے، وہ کس خوش کن خواب کے زیر اثر تھا جس نے اسے حاضر سے غیر حاضر کر دیا تھا۔

وہ اب آئے گا اور پوچھے گا، اب آئے گا، بس ابھی......

لیکن وہ کسی اور جہان میں تھا، خوش بہت خوش...... مگن...... کس چیز نے اسے سب بھلا کر مسکرانے پر مجبور کر دیا؟

☆☆☆

کہاں تو وہ فخر سے ملاقات کے بعد بہت محتاط روی سے گھر میں داخل ہوتی تھی اور اب یہ ہوا کہ مین گیٹ کو دھاڑ سے کھولتی، صحن سے بھاگتی، برآمدے سے گزرتی وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ چادر اتار کر بیڈ پر ماری اور ہانپنے لگی، پھر خود بھی بیڈ پر بیٹھ گئی۔ پیر دھونے کا تو چھوڑو اس نے کیچڑ میں لت پت جوتا اتارنا بھی فراموش کر دیا تھا۔ چہرہ لال بھبھوکا تھا اور سانسیں اتھل پتھل۔

"کیا ہوا...... ایسے بھاگی کیوں آ رہی ہو؟ کتا پیچھے لگ گیا۔" بھابھی کی آواز پر وہ بدک کر مڑی،

بھابھی متبسم لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

''اوہ......'' اس نے سر پکڑ لیا۔ وہ حواس باختگی میں اپنے کمرے کے بجائے بھابھی کے کمرے میں آگھسی تھی۔

''کیا ہوا زہرہ؟'' بھابھی نے اب اس کی اڑی رنگت دیکھی تھی، اس کے قریب بیٹھتے ہوئے سراسیمگی سے پوچھا۔

''عبداللہ نے دیکھ لیا کیا؟'' اس سے بڑی اور کوئی وجہ نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کا سر نفی میں ہلا۔

''پھر کیا کرم نے...... لیکن وہ تو شہر گیا ہوا ہے ناں۔'' بھابھی کے لہجے میں خوف و گھبراہٹ کے ساتھ ساتھ بے یقینی اور صدمہ ابھر آیا۔

''تو پھر کون......؟'' اس کا سر نفی میں ہلا تو ناہید زچ ہوگئی۔ وہ یک دم کھڑی ہوگئی۔ اسے اپنے بھیگے لباس سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا اور کیچڑ کے نشان، اگر بھائی آجاتا تو لا محالہ پوچھتا۔ اس وقت نہ اس کے سامنا کرنے کی ہمت تھی اور جواب دینا تو ناممکن تھا۔

''میں صاف کر لیتی ہوں یہ، تم جلدی سے کپڑے بدل لو۔ ٹھنڈ نہ لگ جائے۔''

''ٹھنڈ......'' سر پر ڈھیروں پانی ڈالنے کے باوجود اندر کی کھولن کم نہیں ہو رہی تھی۔ گندی گندی گالیاں بھی لفظ 'یار' کے آگے ہیچ لگ رہی تھیں۔

بھابھی نے نا صرف باہر آنے اور جانے کے تمام نشانات مٹا دیے بلکہ وہ اس کے لیے چائے کا کپ بھی بنا لائی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تشکر کا رنگ ابھرا اور پھر اس پر تفکر غالب آگیا۔

''فخر سے جھگڑا ہوگیا کیا......'' اب اس کے علاوہ اور کیا پوچھا جاسکتا تھا۔ حالانکہ اس کی امید نہ ہونے کے برابر تھی، وہ کبھی نہیں جھگڑتے تھے۔ اس کا سر نفی میں ہلا، پر ساتھ ہی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''پھر کیا ہوگیا؟'' بھابھی کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ اتنی آسانی سے رونے والی بہرحال نہیں تھی۔

''راستے میں......'' اسے بتانا ہی تھا، وہ اکیلے نہیں کڑھ سکتی تھی۔

''بھاء عاشق مل گیا۔''

''بھاء عاشق...... بھاء...... بھی تو عاشق بھی......'' بھابھی کی زبان سے بے ساختہ نکلا مگر پھر اس نے اگلے ہی پل زبان دانتوں تلے داب لی۔

''کون عاشق؟ بوبو حمیدہ کا بیٹا۔ عاشق حسین۔'' اس کا سر اثبات میں یوں ہلا جیسے سینے میں بھرا سارا غبار نکال دیا ہو۔

''تو...... کیا کہتا تھا وہ؟'' اس نے کسی قدر الجھ کر بھابھی کی شکل دیکھی۔ وہ یک دم بے چین ہوگئی تھی، اس کا لہجہ سرسراتا ہوا تھا۔

''بولو ناں کیا کہا اس نے؟'' اس کا ہاتھ زور سے ہلایا۔

''اس نے......'' ان الفاظ کو دہرانا تو مشکل کام تھا، اس پر انکشاف ہوا۔ کیسے دہرا سکتی تھی وہ...... وہ سب......

''بولتی کیوں نہیں، کیا کہا اس نے؟''

''اس نے بڑی گندی بات کی بھابھی! لیکن...... بات وہ نظر جھکا کر ہی کہہ رہا تھا۔ بہت ادب سے...... ایسا لگتا ہے اسے بولنے کی تمیز نہیں یا اسے یہ نہیں پتا کس جگہ، کس طرح کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کا جملہ خراب تھا مگر اس کا انداز سادہ تھا۔ مجھے اب تک سمجھ نہیں آرہا، میں اس سب کو کس خانے میں رکھوں، میں......'' وہ بری طرح الجھی ہوئی تھی۔ بھابھی کے چہرے نے رنگ بدلا۔

''پہیلیاں کیوں بجھوائی ہے، صاف صاف بتا...... کیا کہا اس نے؟'' ناہید نے سب کچھ سوچ لیا تھا۔

☆☆☆

وہ ایک دم سے سامنے آگیا تھا کہ وہ بوکھلا کر لڑکھڑاتے ہوئے ایک قدم پیچھے ہوگئی۔ سہارے کے لیے دیوار کو تھامنا پڑا۔ گھبراہٹ پر شدید طیش، غالب ہوگیا۔

''سنبھل کر۔'' اس کے ہاتھ یوں آگے بڑھے جیسے شانوں سے تھام کر سہارا دینا چاہتا ہو۔ اس نے ایک ہاتھ اسٹاپ کرنے کے لیے اٹھا دیا' اسے سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سنبھل چکی تھی۔

''آپ نے تو میری جان ہی نکال دی۔ میں سمجھی کہ......'' اس نے باقی کا جملہ دانتوں تلے داب لیا۔ وہ سنتا تو برا مان جاتا۔ وہ اسے کتا سمجھی تھی۔ ستو...... جو اس باغ کے راکھے نے پال رکھا تھا (ویسے وہ کسی حد تک ٹھیک سمجھی تھی)۔

''بارش ہونے والی ہے۔'' وہ اس کے چاند چہرے کو اتنے قریب سے دیکھنے پر بے حال ہوا جا رہا تھا۔

''ہاں۔'' وہ دوپٹے کو اچھی طرح کسنے لگی۔ اب وہ سامنے سے ہٹ جاتا تو وہ آگے بڑھتی مگر وہ...... جھکی فدویانہ نگاہوں میں ایسا ادب تھا۔ جیسے پرانے وقتوں میں غلام، شہزادیوں سے روا رکھتے تھے۔ جو ان کی پہنچ سے دور ہوتی تھیں، مگر ان کے دلوں میں بستی تھیں۔ کچھ جو پاکیزہ نظر سے دیکھتے تھے اور کچھ جو گندی نیت رکھتے تھے مگر بے بس ہوتے۔

''ایسے موسم میں گھر سے نہیں نکلنا چاہیے تھا۔'' اس نے جملہ مکمل کرنے پر ایک بار نگاہ اٹھائی اور پھر جھکا لی۔

''ایسے موسم میں آپ بھی تو نکلے ہیں۔''

''میری اور بات ہے لیکن......'' اس بار اس کا سر جھکا ہوا تھا مگر نگاہیں اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ ہنس دی تو اس کے پورے جسم میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اس کے لیے تھوک نگلنا مشکل ہوگیا، جسے دور سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا تھا، وہ نزدیک آئی تو اس کے لیے سیدھا کھڑا رہنا مشکل ہوگیا۔

''موسم مرد عورت نہیں دیکھتا۔'' اس نے آسمان کی سمت دیکھا اور اس نے اس کی گردن کی سمت، آسمان کا جائزہ لے کر وہ اس کی سمت متوجہ ہوئی تب اس نے دوبارہ سے نظریں جھکا لیں۔ وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اس بار وہ کچھ نہیں بولی' قدم اٹھا کر آگے بڑھنے لگی۔ راستہ دیں والا جملہ نہیں کہا، سیدھی سی بات تھی۔ اسے خود ہی راہ چھوڑ دینی چاہیے تھی مگر وہ بات بڑھانا چاہتا تھا۔ وہ اس کا مقصد سمجھ کر سامنے سے ہٹ کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ حیران ہوئی پھر اسے ناگوار گزرنے لگا، وہ جھٹکے سے رکی تھی۔ وہ بھی رک گیا۔

''میں اکیلی چلی جاؤں گی، آپ تکلیف نہ کریں۔'' وہ ایسی قطعیت سے کھڑی ہوگئی کہ وہ جائے گا تو تب ہی قدم اٹھائے گی۔ اس کے چہرے پر مایوسی پھیلی، جس کا رنگ سیاہ تھا۔ آنکھیں مردہ ہوگئیں مگر جب بولا تو لہجہ خوشامدانہ تھا۔ ہمدردانہ مگر اس میں کچھ جتانے کی کیفیت بھی موجود تھی۔

''میں سمجھ سکتا ہوں، جب کوئی لڑکی اپنے یار سے ملنے آتی ہے تو کسی کو ساتھ لگا کر نہیں لاتی۔ عاشقی معشوقی کے یہی اصول ہوتے ہیں لیکن جس کے لیے تم آئی تھیں، وہ تو موٹر سائیکل پر......'' اس نے جملہ روک کر چٹکی بجائی کہ وہ تو گیا اور تم اس کیچڑ میں چل رہی ہو۔

''میں گھر تک چھوڑ آؤں گا اور میں کسی کو بتاؤں گا بھی نہیں کہ تم کدھر سے آرہی ہو قسم سے۔''

اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑی تھیں۔ اس کے سر پر کسی نے ہتھوڑا مار دیا تھا، ادب سے نگاہیں جھکا کر ہمدردی سے وہ ایسے کیا کہہ گیا تھا۔ بھونچکی سی اس کی صورت دیکھ رہی تھی، جو ہونٹوں پر بار بار زبان پھیر رہا تھا۔ نگاہ ملی تو انداز میں وہی کھسیانی کیفیت تھی، وہ بے ضرر اور مظلوم دکھائی دیتا تھا۔

اس نے اس کا بھید پا لیا تھا، اسے اس بات کا صدمہ ہوا تھا یا اس نے جو لفظ استعمال کیے، جسے اس نے عاشقی معشوقی کہا تھا۔ وہ اس کے لیے اس سے بھی بڑھ کر چیز تھی، عبادت، ریاضت، جنون

خوشی...... خواہش اور خواب......

اور جس سے ملنے آئی تھی، وہ محبوب تھا، دلدار تھا مگر یار جیسا لفظ...... بدصورتی لفظ میں نہیں تھی۔ بدصورت اور نیچ پن لہجے میں تھا۔ کیا وہ دماغی طور پر کھسکا ہوا تھا۔ جو ایسے جملے کہنے کے بعد بھی سکون سے کھڑا تھا، مودب، بے ضرر، فکر مند......

اس کا دماغ بالکل خالی ہوگیا۔ اس بار اس نے اس کا راستہ چھوڑنے کا انتظار نہیں کیا تھا۔ برق سی تیزی سے اس کے پاس سے نکلتی چلی گئی۔ اس کا تنفس بے قابو تھا اور پورے جسم پر تشنجی کیفیت طاری تھی۔ اتنا تیز تو وہ تب بھی نہ چلتی کہ اگر اس کے پیچھے ستو لگ جاتا۔

☆☆☆

خوشی چشمہ بن کر اس کے اندر پھوٹ نکلی تھی۔ سرشاری رگوں میں لہو بن کر دوڑ رہی تھی۔ اسے گدگدا رہی تھی۔ آج اسے کتنا قریب سے دیکھا تھا، اتنا کہ ہاتھ بڑھا کر مزید قریب کرسکتا تھا اتنا کہ پھر قربت معنی بدل دیتی لیکن یہ وہ اب سوچ رہا تھا۔ اس وقت تو اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نے جواب دے دیا تھا۔ وہ نا صرف پھول جیسی دکھائی دیتی تھی بلکہ پھولوں کی طرح مہکتی بھی تھی، اس کی روح تک معطر ہوگئی۔

آہ...... اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور گول تکیے سے لپٹ کر کروٹ بدلی۔ اسے ذہن پر بہت زور دینے پر بھی یاد نہیں آرہا تھا کہ دونوں کے بیچ کیا باتیں ہوئیں مگر وہ حیران اور پھر ناراض دکھائی دینے لگی۔ پتا نہیں کیوں......

جتنے لوگ بھی عاشق حسین سے واقف تھے، وہ جانتے تھے وہ کبھی نگاہ اٹھا کر...... یا نگاہ ملا کر بات نہیں کرتا تھا۔ وہ اونچا بھی نہیں بولتا تھا اور بلا مقصد تو بالکل نہیں بولتا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ وہی آرا چلانے کا کام۔

وہ میل جول کا بھی اتنا قائل نہیں تھا، اس لیے کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ کیسے کردار و اخلاق کا مالک ہے، کیسے خیالات رکھتا ہے، کس مکتبہ فکر کو مانتا ہے۔ اس کا انداز گفتگو کیا ہے۔ اس کا موضوع گفتگو بالعموم کیا ہوتا ہے۔ اس نے خود بھی اپنی شخصیت کو کبھی کھوجنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کے لیے اپنی ذات اتنی اہم شاید تھی بھی نہیں کہ وہ اس پر غور کرتا۔ خود احتسابی کے عمل سے گزرتا اور خوبیوں خامیوں کو چھانٹ کر الگ کرتا اور پھر نازاں ہوتا یا اصلاح کرتا۔

وہ زیادہ بولتا نہیں تھا، ہاں زیادہ سوچتا ضرور تھا اور بولنے والے کے لیے ہر قدم پر سوچنے تولنے اور پھر بولنے کی تعلیم اور حکم ہوتا ہے مگر سوچنے والے ہر حدود و قیود سے آزاد ہوتے ہیں۔ اس کے حوالے سے جو جو سوچا تھا، وہ من وعن کہہ ڈالا۔ بلکہ نہیں...... جو، جو وہ سوچتا تھا اگر وہ سب کہہ دیتا تو یا تو وہ غش کھا کر گر جاتی یا پھر اس کے نرخرے پر اپنے دانت رکھ دیتی یا زبان کھینچ کر کتوں کے آگے ڈال دیتی لیکن وہ ان سب سے بے نیاز سرشار سا پڑا رات کاٹ رہا تھا۔

☆☆☆

کمہاروں کے محلے میں آج خوب رونق تھی۔ نذیر کمہار کی اکلوتی بیٹی کی تیل مہندی تھی، اس نے صرف اپنے گھر پر بتیاں نہیں لگوائی تھیں۔ ساری گلی جگمگ کررہی تھی، چھت پر رکھے ڈیک شادی بیاہ کے گیت پیش کررہے تھے۔

یہ پرانے زمانے کے کمہاروں کا محلہ نہیں تھا کہ دور سے ہی مٹی کے برتن دکھائی دیں۔ مٹی کے ڈھیر، چاک اور گدھا...... کمہاروں کے حالات بدل گئے تھے۔ گدھوں کی جگہ اب موٹر سائیکلیں اور گاڑیاں آگئی تھیں۔ کچھ برس پیچھے جائیں تو ان کے کچھ منڈے دبئی چلے گئے تھے، پتا نہیں پیشہ بدلنا تھا کہ حالات؟ مگر دونوں کام ہی ہوگئے، بیٹوں نے پیسہ بھیجا تو پیشہ خود بخود بدل گیا۔ ایک کی دیکھا دیکھی پیچھے لائن لگ گئی، جسے دیکھو ویزہ لگوا کر جہاز میں شوں...... پہلے مادی تبدیلی آئی پھر غیر مادی۔ گھروں کے نقشے بدل گئے پھر حلیے بدل گئے۔

سب کچھ بدل گیا، لڑکے لڑکیاں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ نہیں بدل سکے تو باقی پنڈ والوں کا ذہن نہیں بدل سکے۔ جو ذرا اونچی ذات کے تھے وہ آج بھی انہیں کمتر سمجھتے مگر کمہاروں کے بڑوں کو اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ فخر سے کہتے، پہلے وہ خالی ہنر مند تھے، جس مٹی کو لوگ اپنے پیروں کی ٹھوکر سے دھول بنا کر اڑائے پھرتے ہیں۔ دامن پر لگے تو جھاڑ دیتے ہیں، وہ اس مٹی سے برتن بنا کر لوگوں کے منہ کو لگا دیتے ہیں۔

''اور اب ان کے پاس پیسہ ہے اور تلیم (تعلیم) بھی۔''

نذیر کمہار کے بڑے بھائی کو تو اپنے پیسے پر ایسا گھمنڈ تھا کہ اس نے سیاہ رنگ کے بڑے لوہے کے دروازے کے دونوں ستونوں پر اپنے ہاتھ سے بنائی صراحیاں رکھ چھوڑی تھیں اور سیاہ رنگ سے صراحی کے اوپر اپنا نام خود لکھا تھا۔ شریف کمہار! اسی شریف کمہار کی بیٹیاں...... اس وقت تایا زاد روبینہ کی مہندی میں جانے کے لیے بناؤ سنگھار کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں۔

جب ان کی پھوپھی زاد سلمٰی کمرے میں داخل ہوئی، اس نے پیلی گھیر دار شلوار کے ساتھ چھوٹی سبز قمیص اور سرخ دوپٹا اوڑھ رکھا تھا۔ سرخ اور پیلے رنگ کے دھاگے سے ساری قمیص پر کڑھائی کی گئی تھی۔ اس نے کھلے منہ کا کھسہ پہن رکھا تھا، شریف کمہار کی بیٹیوں نے حیرت سے پھوپھی زاد کو دیکھا۔ جو اپنے روپ اور سنگھار پر پھولی نہ سما رہی تھی۔ دونوں نے آنکھیں چندھی کرکے اس کے جوڑے کو دیکھا۔ جو دیکھا دیکھا لگ رہا تھا، پر کہاں دیکھا تھا۔ فوری طور پر یاد نہ آیا۔

''ہاں...... یہ تو بالکل زورا جیسا جوڑا ہے، جو اس نے اپنی سہیلی کی مہندی میں پہنا تھا۔ ہے ناں۔'' بڑی نے چھوٹی سے تصدیق چاہی۔

''ہاں...... اسے بھی یاد آگیا۔ پھوپھی زاد نے بے نیازی سے پراندہ پیچھے پھینکا۔ یہ اس کی طرف سے اثبات کا اشارہ تھا۔ دونوں بہنوں کا دل چھوٹا ہوگیا، وہ بھی سبز اور زرد لباس میں تھیں، اپنے لباس یک دم کمتر لگنے لگے۔

''تم نے اس سے ڈیزائن مانگا کیا؟'' بڑی اب قمیص کا دامن ہاتھ میں لے کر جانچ رہی تھی۔

''ناخ......'' پھوپھی زاد نے زبان سے آواز نکالی اور آئینے میں خود کو دیکھنے لگی۔ ''مانگتی میں کسی سے نہیں، بس دیکھ لیتی ہوں ایک بار، تو ذہن میں رہ جاتی ہے ہر چیز۔''

''کون سا خود بنایا ہے، کسی سے بنوایا ہی ہوگا۔''

''تو بنوانا کون سا آسان ہے۔ اگلے کو جا کر سمجھانا پھر ایک جیسی چیزیں ڈھونڈنا بڑی محنت کی، پورے سوا مہینے میں دوپٹا قمیص تیار ہوا ہے۔''

''ہاں......'' چھوٹی نے اپنے اندر بھرتے غبار کو نکالا۔ ''مگر جو بھی کیا ماری تو نقل ہی ناں، جو دیکھے گا، پہچان لے گا کہ یہ ڈیزائن تو زورا کا ہے۔''

''تو کیا ہوا؟'' اس نے لاپروائی سے گردن جھٹکی۔

''اور اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ اتنے پیارے کپڑے پہن کر تم سب کو ہرا دو گی، تو بھول ہے مہندی میں زورا نے بھی آنا ہے اور جہاں وہ آجاتی ہے پھر سب کی بتی بجھ جاتی ہے۔''

کمرے میں داخل ہوتے شریف کمہار کے بیٹے فیض کے قدم رکے۔ اس کی بہن بہت جلے کٹے لہجے میں کسی کی تعریف کررہی تھی۔ کون آجاتی ہے، جو سب کی بتی بجھا دیتی ہے۔ نہیں سن سکا تھا۔

''اور سب سے اہم بات باجی!'' چھوٹی کی زہر خند آواز ابھری۔

''جوڑا پہن لینے سے کیا ہوتا ہے، بندہ کوئی زورا تو نہیں بن جاتا۔ بن ہی نہیں سکتا، کہاں زورا، کہاں......'' وہ صاف پھوپھی زاد کی رنگت وصورت پر تبصرہ کررہی تھیں۔ کچھ سال پہلے کہتیں تو اگلی بلی کی طرح جھپٹ پڑتی پر اس وقت مسکرا دی۔

"تم لوگ جل گئی ہو۔"

"ہوں...... جلے ہماری جوتی، وہ بھی بڑی قیمتی...... جو جل رہے ہیں وہ کالے پیلے نظر آرہے ہیں۔" دونوں بہنیں تلملائیں مگر پھر ہنس دیں۔ اس کی رنگت اور لباس کے امتزاج کا مذاق اڑایا۔ پتا نہیں اس بے چاری نے آگے کیا کہا، فیض کی سماعتیں بند ہوگئی تھیں۔ اس کی کانوں میں زورا...... زورا کی بازگشت ہورہی تھی، وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اسے اپنی تیاری بھی کرنی تھی، مہندی دوسرے پنڈ سے آرہی تھی۔ چاچے نے شان دار استقبال کا حکم دیا تھا، فیض پر سب سے زیادہ بھروسا تھا۔ وہی ہر شے کا ذمہ دار تھا، مگر نہاتے ہوئے، لباس بدل کر کف لنکس لگاتے ہوئے بہت دیر تک بال سنوارتے ہوئے اور خود پر خوب سارا پرفیوم اسپرے کرتے ہوئے اس کے دماغ کی سوئی زورا کے نام پر اٹک گئی تھی۔

کل روبینہ کے گھر سب فیض کی ماں سے اب فیض کا بیاہ کردینے کی باتیں کرنے لگیں۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں، اب فیض ہی کی باری ہے۔ ماں صدقے ایسی نوں لاؤں گی کہ دنیا دیکھے گی، گوری چٹی دودھ ملائی۔ دیکھ دیکھ کے جی نہ بھرے، قد بھی لمبا ہو۔ میرا فیض ماشاءاللہ دیکھا ہے ناں اور نقشہ تیز ہو جیسے کسی نے چھری سے کاٹا ہو اور میرا یہ بھی دل ہے کہ وہٹی کی آنکھیں نیلی ہوں۔ میرے فیض کے بچے گورے چٹے انگریز لگیں انگریز۔" اس کی ماں کو تو جیسے کسی نے چھیڑ دیا تھا، پوری تفصیل بتانے لگی۔

"لو جی۔" ساری عورتیں ہاتھ پر ہاتھ مار کے ہنس دیں۔

"یہ تو بھین (بہن) نبیلہ...... تو نے سیدھا سیدھا زورا کا نقشہ بتادیا تھا۔"

"او کون زورا؟" اس کی ماں چونکی۔

"سیف اللہ کی زورا...... اور کتنی زورا ہیں اس پنڈ میں۔"

"اچھا، وہ......" نبیلہ نے کھینچا۔ "سچ میرے ذہن میں تو وہ تھی بھی نہیں۔"

"لیکن ایک بات تو سچ ہے، مجھے بالکل ویسی نوں چاہی دی اے۔" اس کی ماں گہری سوچ میں چلی گئی۔

"شکر بھین (بہن) نبیلہ نے یہ نہیں کہہ دیا، وہی چاہی دی اے۔" عورتیں پھر ہنسیں۔

"میں کیسے کہہ سکتی ہوں یہ، وہ کبھی نہیں دیں گے لیکن میرے فیض کے ساتھ تو ویسی ہی جچے گی۔"

نبیلہ کے لہجے کی حسرت نے اسے حیران کردیا۔

شادی کی سو ذمہ داریوں کے باوجود اس کی سماعتوں سے ماں کے جملے ٹکراتے رہے۔ کبھی یہ کہ وہ کہاں ہمیں دیں گے اور کبھی اس نقشے کی تفصیل، جو اس کی ماں کو درکار تھا، ایسا نہیں تھا کہ زورا دیکھی نہیں تھی۔ مگر وہ بہت بچپن کی بات تھی، مگر وہ حسن جواب ماں نے بیان کیا تھا اور ابھی بہنیں بے چاری پھوپھی زاد کے سامنے دہرا رہی تھیں۔

"ہوں دیکھنا پڑے گا فیض جی۔" وہ سیاہ پشاوری چپل کا بکل لگانے کے بعد اب پنجوں کے بل ذرا سا جھک کر آئینے میں خود سے ہم کلام تھا۔

دیکھے بغیر...... اب اور کچھ نہیں...... زورا......

☆☆☆

عاشق حسین کے جملوں نے اس سے جیسے اس کی ہنسی کا غرور چھین لیا تھا۔ وہ دکھ حیرت اور پستی کی عجیب سی کیفیت سے دوچار تھی۔ کبھی طیش سے گرم تیل کی طرح کڑکڑانے لگتی، کبھی بے بسی سے جھاگ ہوجاتی۔

"بھابھی!" زہرہ کی گم صم آواز ابھری۔

"میں سوچ رہی ہوں جا کر سب کچھ فخر کو بتادوں۔ وہی اس سے پوچھے کہ تمہیں بولنے کی تمیز ہے کہ نہیں۔" اس کے سوال میں فیصلہ کن کیفیت تھی۔ ناہید کا مسالا بھونتا ہاتھ رک گیا۔

"پاگل تو نہیں ہوگئی، بے وقوف۔" اس نے ڈوئی چھوڑ کر اسے دیکھا۔

"سر کھول دے گا وہ اس کا۔ مر جائے گا یا مار دے گا۔"

"پر بھابھی......" وہ منمنائی۔ "ایسے چپ رہنے سے تو وہ شیر ہوجائے گا۔ دوبارہ بھی......"

"دوبارہ اس بے ویتے (بے ہدایت، بے طریقہ) کے سامنے آنے کی ضرورت ہی نہیں۔"

"میں کون سا گئی تھی، وہ ہی چھلاوے کی طرح حاضر ہوگیا تھا۔"

"ہاں ہاں، میرا مطلب ہے سامنے آجائے تو راستہ بدل دینا۔"

"راستہ کیوں...... میں تو پتھر اٹھالوں گی، لہو لہان کردوں گی بھابھی!"

"شاباش۔" ناہید نے اسے سراہا۔ ساتھ ہی لگتے ہوئے مسالے میں پانی کا چھینٹا مارا۔ سارے صحن میں خوشبو اور شور سا پیدا ہوگیا۔

"لیکن بھابھی!" بہت جی داری سے عزائم بتانے کے بعد اس کی لیکن برقرار تھی۔ "کوئی ایسے کیسے کرسکتا ہے، ایسے گندے انداز سے...... میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی مجھے اس طرح سے......" اس کی آواز گھٹ گئی، وہ رونے لگی تھی۔ ناہید نے سٹپٹا کر ادھر اُدھر دیکھا اگر کوئی آنکلتا تو کیا توجیہہ پیش کرتیں وہ......

"ہر کسی کے بات کرنے کا، سوچنے کا طریقہ ہوتا ہے زہرہ! جیسا انسان اندر سے ہوتا ہے ناں، ویسی ہی بات کرتا ہے۔ جو کمینہ ہوتا ہے، اس کی بات اور حرکات سے کمینگی ظاہر ہوجاتی ہے۔ اس نے کوئی اپنے گھر کے باہر نام کی تختی پر کمینہ تھوڑی لکھوایا ہوتا ہے اور نہ ہی شناختی کارڈ پر کوئی علامت کردار و اخلاق کے لیے ہوتی ہے۔ جو اندر سے گندا ہوتا ہے، ضروری نہیں کہ باہر سے بھی گندا نظر آئے۔" سیدھی سادی نظر آنے والی ناہید نے بڑی گہری مثال دی۔ اس کا دل ایمان لے آیا۔

"پر مجھے نہیں پتا تھا، بھاء عاشق......" اس کا لہجہ لڑوا ہوگیا۔ "ایسے گندے خیالات رکھتا ہے اس کی امی تو ایسی نہیں ہیں۔ نظر جھکا کر ادب سے بات کرتی ہیں، سوچ سوچ کر بولتی ہیں بیٹے کو کیوں نہیں سکھایا۔" اس نے لڑاکا انداز سے کہا۔

ناہید اس کے سوال پر چونکی۔ پھر جواب سے جان چھڑانے کے لیے پانی میں بھیگی سبزی ہانڈی میں ڈالنے لگی۔ ہاں صحیح کہہ رہی تھی اس کی ماں سمجھ دار تھی اور ناپ تول کر بولتی تھی جب ہی تو کل نوک زبان پر آئی بات کو دانتوں میں دبا گئی۔

"آپ منع کررہی ہیں بھابھی! ورنہ میرا دل یہی ہے فخر کو سب بتا کر اس کی وہ چھترول لگواؤں کہ مہینوں ٹکور کرتا پھرے۔" اس کے طیش کی چنگاری بجھنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ ناہید کے سبزی ڈالتے ہاتھ پل بھر کو رکے۔ اس نے خشمگین نگاہوں سے اسے دیکھا اور ہانڈی میں ڈوئی چلانے لگی۔

بدلہ لیے بغیر...... مزہ چکھائے بغیر اسے آرام نہیں مل رہا تھا۔ "یا پھر......" اس نے یک دم ناہید کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ آنکھیں چمکنے لگیں۔

"بھائی جان کو بتاتی ہوں وہ تو اس کا منہ توڑ کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیں گے۔ زبان گدی سے کھینچ کر ستو کے آگے ڈال دیں گے، بلکہ گلے میں رسہ ڈال کر کیکروں میں گھسیٹیں گے۔" جوش میں اسے ایک سے ایک اذیت ناک خیال سوجھنے لگے۔

"دماغ خراب ہوگیا ہے۔" ناہید نے اس کا ہاتھ دبوچ لیا۔

"کیا بھابھی؟" وہ ناسمجھی سے ہاتھ چھڑانے لگی۔

"اس کے ساتھ تو وہ جو کرے گا، بعد کی بات ہے۔ پہلے تو تمہیں لائن حاضر کردے گا کہ تم ادھر باغ میں کرنے کیا گئی تھیں، گلا گھونٹ دے گا۔"

"اپنے بھائی کو جانتی نہیں ہو کیا، وہ سب بھول بھال کر پوچھیں گے تو ستو والے باغ میں کر کیا رہی تھی۔" اس کی گرفت کی سختی میں خوف کا عنصر شامل ہوگیا۔

"بھابھی!" اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش

ترک کردی۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہ تھا۔ ناہید نے جھٹکے سے اس کا ہاتھ چھوڑا تھا اور سخت خفا انداز سے منہ پھیر لیا۔

☆☆☆

ایک من من باورچی خانے میں نند بھاوج کے بیچ چل رہی تھی تو اس سے بھی مدھم لہجے اور محتاط انداز سے سیف اللہ کے کمرے میں بھی حمیدہ کا بیٹا موضوع بحث تھا۔

شمیم کا غم وغصہ رات گزر جانے کے بعد گھٹنے کے بجائے بڑھ گیا تھا۔ آپاں جی کے لب باہم پیوست تھے، وہ حسب معمول تسبیح کے دانے گرا رہی تھیں مگر وہ شمیم کے ہر جملے پر ہنکارا بھر کے یا پھر بھویں اچکا کر بہن کو بڑھاوا بھی دے رہی تھیں۔

''میرا خیال ہے اس بات کو اب ختم کر دینا چاہیے۔'' سیف اللہ اوب گئے تھے۔

''بہر حال یہ ایک اندازہ ہی ہے ناں۔'' انہوں نے آپاں جی کی طرف دیکھا۔ ''حمیدہ نے اپنے منہ سے کہا تو نہیں، ہو سکتا ہے اس کا ایسا کوئی خیال نہ ہو۔''

''کیا مطلب...... سیف اللہ!'' آپاں جی نے شمیم کو دیکھا پھر جھٹکے سے اپنے سر پر جما دوپٹا پیچھے کو گرا دیا۔ میں نے یہ چاٹا (سر، بال) دھوپ میں سفید کیا ہے، ہیں؟'' وہ سخت برا مان چکی تھیں۔

سیف اللہ نے ذرا سی نگاہ اٹھا کر ان کی سمت دیکھا۔ ان کے سر پر ایک بھی سیاہ بال نہیں تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے بچوں کا کھانے والا چینی کا سفید لچھا سر پر رکھ دیا گیا ہو۔

''آپ بات نہیں سمجھیں، یا تو حمیدہ کہہ گئی ہوتی۔ اب جبکہ اس نے خود ہی بات بدل دی، یا کہہ نہیں سکی۔ تو ہمیں بھی اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنی چاہیے، اگر وہ دوبارہ آئی۔ ہے پھر دیکھیں گے۔''

''دوبارہ......'' شمیم کے حلق سے تیز سیٹی کی طرح آواز نکلی۔ ''دوبارہ آکر تو دکھائے میں......'' شمیم کو فوری طور پر کوئی بھیانک انجام بھی نہ سوجھ سکا۔

''مجھے لگتا ہے کسی نے میرے سر کے بیچ میں کیل ٹھونک دی ہے۔''

''کسی کیوں کہہ رہی ہے، اسی کا نام لے۔'' آپاں جی کا لہجہ ناراضی لیے ہوئے تھا۔

''وہ دوبارہ آئے گی، لکھوالو۔''

''بس...... میں کہہ رہا ہوں ناں یہ بات یہیں ختم۔ کسی سے کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناہید سے بھی کہہ دینا۔''

''ایسا کیا کہہ دیا حمیدہ بوبو نے۔ سب کا رنگ اڑا ہوا ہے۔''

بظاہر سرسری لہجے میں طنز کی آمیزش تھی اور ایک تیز چبھن۔ ان تینوں کی گردنیں ایک ساتھ گھومیں۔ ہونٹوں سے پانی کا گلاس لگائے یہ کرم اللہ تھا، نگاہ ملنے پر سرد انداز سے مسکرایا اور گھونٹ گھونٹ حلق سے اتارنے لگا۔ ان تینوں کی نگاہیں ایک دوسرے ملیں۔ اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ پلک جھپکنے سے پہلے فیصلہ ہو گیا۔

''کچھ نہیں......'' سیف اللہ نے کہا۔ ''تم کب آئے؟''

''کب......؟'' وہ پیشانی مسلنے لگا۔ ''اماں کے حساب سے تو چوبیس پچیس سال بنتے ہیں۔'' اس نے شمیم کی سمت مسکرا کر دیکھا۔ ''اور میرے خیال سے جب آپ کو نظر آ گیا۔ سمجھو آ گیا۔'' سیف اللہ کے لب بھنچ گئے۔ انہیں پتا لگ گیا۔ اب اس سے جو بھی بات کی جائے گی اس کا جواب ایسا ہی ہوگا۔ کرم نے بار بار سب کو دیکھا۔ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ اس کے جانے کے منتظر ہیں۔ آپاں جی کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں اور ہاتھ اور ہونٹ تیز تیز ہل رہے تھے۔ سیف اللہ کی نظریں میز کی سطح پر یوں جمی تھیں جیسے مراقبہ کر رہے ہیں۔

ہاں شمیم تھی جو بیٹے کی صورت دیکھ رہی تھی کچھ کہنا چاہتی بھی تھی تو...... فی الوقت ارادہ ترک

کر دیا۔

''ویسے صحیح بات ہے۔ حمیدہ بوبو کو ذرا عقل نہ آئی۔'' وہ دروازے سے ہٹ کر کمرے کے اندر آ کر کھڑا ہو گیا۔ ''سوچنا چاہیے تھا بوبو کو۔''

اوہ تو اس نے سن لیا تھا۔ نجانے کب سے آ کر کھڑا تھا۔

''مجھ سے مشورہ کر کے آ جاتی......'' وہ شمیم کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔ ''تو میں سب سمجھا دیتا کیا غلطی کرنے جا رہی ہے۔ ویسے صحیح سلامت جانے دیا۔ ابا جی نے یا لگا دیں دو تین......''

''کرم......'' آپاں جی کی تنبیہی پکار پر وہ ہنس پڑا۔ تیزی سے ان کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا دونوں بازو ان کے گرد لپیٹ لیے۔ ''اور میری بے چاری ماسی۔ ماسی جی......

''غلط تو نہیں کہہ رہا میں......'' وہ شمیم سے تصدیق چاہتا تھا۔ ''امی سے پوچھ لیں۔ بلکہ امی بھی کیوں...... یہ ابا جی خود بیٹھے ہیں سامنے...... انہیں تو یاد ہوگا اور انہیں نہ بھی یاد ہو تو مجھے یاد ہے۔ تین تھپڑ گن کے مارے تھے۔ چوتھا امی نے روک دیا تھا، ہے ناں ماں جی......'' اس کا چہرہ ہنستا مگر لہجہ زہر خند تھا۔ شمیم اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کیا فضول باتیں لے کر بیٹھ گیا ہے۔ چل جا کے منہ دھو لے۔''

''کچھ کھایا پیا بھی ہے کہ نہیں۔'' شمیم نے چور نگاہوں سے سیف اللہ کو دیکھا ان کی رنگت دہک اٹھی۔ آنکھوں میں غصہ بھرتا جا رہا تھا۔ اور ضبط کی طنابیں چھوٹنے کو تھیں۔

''کھا پی بھی لوں گا۔ پہلے باتیں پوری کر لوں۔'' وہ بے تُوقی سے سیف اللہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''ویسے آپ لوگ معاف کر دیں حمیدہ بوبو کو......'' وہ ماں باپ دونوں سے مخاطب ہوا۔ سیدھی سادی ہیں بوبو...... مجھے تو یادداشت کا بھی مسئلہ لگا ہے ورنہ...... یہ کوئی بھولنے والی بات تھوڑی ہے کہ لیے اپنی لائق فائق سلیقہ مند۔ خوب صورت بھتیجی کے لیے چچا سیف اللہ نے اپنے سگے مگر نالائق نکمے ویلے بیٹے کو صاف جواب دے دیا تھا۔

صرف یہی نہیں اوقات بھی یاد دلا دی کہ اس نکمے نے ایسا سوچا بھی تو کیسے...... صاف کہا...... شکل دیکھی ہے اپنی...... یہ بھی کہا قیامت کے دن اپنے چھوٹے بھائی کو کیا منہ دکھاؤں گا کہ اتنی بڑی دنیا میں ایک ویلا کرم ہی رہ گیا تھا اس کی بیٹی کے لیے......'' وہ ہنس ہنس کر کہہ رہا تھا یہ اور بات تھی کہ آنکھوں سے چھلکتا غم وغصہ عیاں ہو چکا تھا۔

''کرم......'' سیف اللہ کی بس ہو گئی۔ ان کی آواز چنگھاڑ سے مشابہ تھی۔ انہوں نے میز پر زور کا ہاتھ بھی مارا تھا۔ شمیم اور آپاں جی گھبرا گئیں۔ آپاں جی نے تسبیح والا ہاتھ کرم کے منہ پر رکھ دیا۔ جسے اس نے نرمی سے پرے کر دیا۔ وہ بے خوفی سے باپ کو دیکھتا جا رہا تھا۔

''میں تو آپ کی تعریف کر رہا ہوں ابا جی...... اور بوبو کو یہ سمجھا تا کہ اس نے کیسے سوچ لیا کہ جو شخص اپنی بھتیجی کے لیے اتنا حساس تھا۔ وہ بیٹی کے لیے کتنا...... زیادہ ہوگا...... آپ بھی ناں...... فوراً غصہ ہو جاتے ہیں۔''

وہ ہنس پڑا۔ اتنا کہ آنکھیں پانی پانی ہو گئیں۔

آپاں جی نے لاڈ بھری چپت شانے پر رسید کی۔ مگر ہنسی رکتی نہ تھی۔ شمیم کی ملال میں ڈوبی نگاہ...... میں شکوؤں کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اس نے ایک نظر سیف کو دیکھا۔ جو جبڑے بھینچے کرم کے سچے جھوٹے جنون کو دیکھ رہے تھے۔ سیف کے چہرے پر غم تھا بے بسی تھی غصہ تھا۔ مگر وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اسے بقول کرم کے برباد کر چکے تھے۔

''آپ کہیں تو میں سمجھا کر آؤں بوبو کو......'' وہ ہنستے ہنستے ہانپ گیا تھا۔ اکساتی نگاہ سے باپ کو دیکھا۔ سیف اللہ کھڑے ہو گئے۔ وہ یہاں ٹھہر کر بدمزگی نہیں چاہتے تھے شمیم سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ کرم جوتوں سمیت صوفے پر لیٹ گیا۔ زہرا اور ناہید

جب کمرے میں پہنچیں وہ سو رہا تھا اور ماں اور خالہ کی متفکر نگاہیں اس پر جمی تھیں۔

☆☆☆

"کیا...... آ آ آ...... آ آ آ......" اس کا سوال اس کے سازو سامان سے عاری گھر کے در و دیوار سے ٹکراتا...... لکڑیوں کے ڈھیر سے گھستا نکلتا۔ صحن میں لگے ٹنڈ منڈ درخت پر بیٹھی چڑیاؤں کو اڑنے پر مجبور کر گیا۔

آواز سے دہل کر دل پر ہاتھ رکھتی حمیدہ بوبو نے اس کی صورت پر ڈرتے ڈرتے نظر کی۔

"کیا......" کہنے کے لیے وہ اس کی سمت جھک آیا تھا اس کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ طیش ایسے بڑھا تھا جیسے چولہے میں آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ چہرے کے عضلات کھنچ گئے تھے اور گردن کی ایک ایک رگ یوں ابھری تھی۔ جیسے پھٹنے کے قریب ہو۔

"تو نے بات ہی نہیں کی۔" وہ بے یقین انداز سے تصدیق چاہ رہا تھا۔ حمیدہ بوبو کا سر جھک گیا۔

"کیوں......" اس نے دیکھے بغیر کرسی پکڑی اور ماں کے عین سامنے بیٹھ گیا۔ جیسے انتہائی مطلوب مجرم کے سامنے تفتیشی افسر براجمان ہو جاتا ہے۔

حمیدہ کے پاس جواب تو تھا۔ مگر وہ دیتی کیسے کہ میرا منہ ہی نہ پڑا۔

"بس......" اس کے منہ سے نکلا اس نے شدید ترین طیش میں گھیر کر اپنی ران پر ہاتھ مارا تھا اور بھنا کر ایسے کھڑا ہوا کہ کرسی اوندھی ہو گئی اس نے آگ بگولا ہو کر کرسی کو ٹھوکر مار دی۔

"نہ کر عاشق حسین...... میری بات تو سن......"

"کیا بات...... تو کون سی بات کر کے آئی ہے جو میں سنوں...... ہاں۔"

"کرنے لگی تھی دس بار منہ کھولنا چاہا، مگر آواز ہی گھٹ گئی۔ قسمے۔"

"اچھا...... تو مجھے یہ بتا، تو نہیں کرے گی تو اور کون کرے گا؟ خود کر لوں۔"

"ناں...... نہیں......" حمیدہ نے ہاتھ پنکھے کی طرح ہلائے۔

"پنڈ کے مولوی کو بھیج دیتا ہوں کہ میرے نام سے رشتہ ڈال دے۔" وہ ماں کو دھمکا رہا تھا۔ یا خود راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔ حمیدہ کا رنگ سپید پڑ گیا۔

"نہیں...... میں...... میں کروں گی۔" صاف پتا لگ رہا تھا وہ کبھی نہیں کرے گی۔ بس اس وقت کو ٹال رہی ہے۔

"تو کبھی نہیں کرے گی ماں...... ناں......" وہ دانت چبا کر نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

"اب میں مولوی کو ہی کہوں گا۔" اسے اپنا خیال باکمال لگنے لگا۔

"نہ عاشق...... مولوی کو نہ کہنا۔" گھبراہٹ حمیدہ کے ہر مو سے ظاہر ہونے لگی۔

"کیوں......؟" اس کے ابرو تن گئے۔

"میں کہہ رہی ہوں نا...... میری من لے۔ (میری بات مان لو)"

"نہ وجہ بھی تو کوئی......" ماں کے لہجے میں کچھ تھا...... وہ ذرا سا دھیما ہوا۔ سو سے پچانوے تک۔

حمیدہ نے بے بسی آمیز انداز میں نفی میں سر ہلایا۔

وہ ہنوز منتظر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ حمیدہ نے ہچکچاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی۔ حلق تر کیا۔

"میں ہی چلی جاؤں گی دوبارہ......" صاف لگ رہا تھا وہ فی الحال ٹالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تو نہیں جائے گی دوبارہ......" وہ غرایا۔ "اور چلی بھی گئی۔ تو تیری زبان نہیں کھلنی اب تو مولوی ہی کو بھیجوں گا۔" اس نے مصمم ارادہ کر لیا۔

"ایسا نہ کرنا...... مولوی انکار سارے پنڈ کو سناتا پھرے گا۔ قسمے...... پھر تیرے سے برداشت نہیں ہوگی عاشق......" وہ دکھی ہونے لگی۔

جبکہ اسے ماں کی بات سمجھنے میں کچھ پل لگے اس کی بھنویں آپس میں جڑ گئیں۔

تیوریاں چڑھ گئیں۔ نتھنے پھڑک اٹھے۔ اس کے جبڑے کی ہڈیاں کانوں سے جا لگیں۔ "تو ا

تک اپنی بات پر قائم ہے کہ ادھر سے انکار ہی ہوگا؟"

"کیسی ماں ہے تو...... اور دنیا کی مائیں بیٹوں کی دلی مراد پوری ہونے کے لیے دعائیں کرتی ہیں تعویذ دھاگے کرتی ہیں۔ اپنے دوپٹے اگلوں کے پیروں میں ڈال دیتی ہیں اور تو...... تیری پیش گوئیاں ختم نہیں ہوتیں۔

انکار...... انکار...... انکار...... بددعائیں دیتی ہے اپنے بیٹے کو......" اس نے صحن میں رکھی چیزوں کو اٹھا اٹھا کر مارنا شروع کر دیا۔

پانی کا مٹکا بھی توڑ دیا...... کرسی کا پایہ بھی......

حمیدہ نے دم سادھ لیا۔ وہ منہ سے مٹھی جوڑے بیٹھی رہی۔

"پھر مجھے کہا کیوں تھا...... زورا کا نام کیوں۔ جب تجھے سب پتا تھا۔" وہ ایک ہی تکرار کر رہا تھا۔

☆☆☆

شامیانے، قناتیں۔ دروازے جھریاں سب اسی کی بنائی ہوئی تھیں۔ زورا کو دیکھنا قطعاً مشکل ثابت نہ ہوا۔ اوہ...... وہ دم سادھ کر جھری سے دور ہٹا۔

"اس کی ماں بھی ناں...... اور وہ ساری ماں کی سہیلیاں اور اس کی بہنیں...... سب کی سب کم عقل...... کم نظر...... اتنی تعریفیں...... ہونہہ......"

اس کے پاس سے ایک لڑکا ٹرے بھر کے شربت کے گلاس لے جا رہا تھا۔ اس نے ایک گلاس غٹاغٹ چڑھا لیا اور جھری سے دوبارہ آنکھ لگائی۔ وہ سب تعریفیں کچھ بھی نہیں تھیں۔ اس حسن باکمال کے سامنے جسے دیکھ کر خدا کی خدائی یاد آ جائے۔ مولوی صاحب جب، جب انہیں تعلیم یا تنبیہ کرتے تھے۔ آخر میں حوروں کا ذکر لازمی کرتے۔

مولوی صاحب نے بھی تو کہیں زورا کو دیکھ نہیں رکھا تھا۔

ثواب و اجر کے خواب دکھاتے ہوئے دراصل وہ اسے یاد کرتے ہوں۔ اس نے خباثت سے سوچا ان پنڈ کا بڈھا جھک مولوی۔ فیض کے خیال میں زورا کو یاد کرتا تھا۔ تو قبر میں ٹانگیں لٹکائے بابا صرف یاد کر سکتا تھا۔ وہ یاد کو پال نہیں سکتا تھا۔ جبکہ فیض......

اس نے اپنی مونچھوں کو بل دیا پھر گریبان سے جھانکتے بالوں کو مروڑا...... وہ نا صرف یاد کو پال سکتا تھا بلکہ پرورش کر کے جوان جہاں بھی کر چکا تھا۔

اس کی بہنوں نے پھپھی زاد کو درست آئینہ دکھایا تھا کہ جو بھی کرے حتیٰ کہ اس کی نقل بھی مارے مگر وہ زورا نہیں لگ سکتی۔

پنڈال میں سارے پنڈ کی عورتیں بکریوں کی طرح بھری ہوئی تھیں۔ زرد سبز سرخ رنگ کے لباس...... جیسے کسی نے پچکاری مار دی ہو۔ ایسے میں وہ سفید لباس میں تھی۔ نفیس باریک جارجٹ پر ننھے ننھے زرد پھول تھے۔ دوپٹا زرد و سفید رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ وہ جتنی حسین تھی۔ اتنا ہی اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

آنکھوں میں سرخی تھی۔ اور جیسے مارے بندھے بیٹھی تھی۔ اسے کتنی بار گیت گانے کے لیے نیچے آ کر بیٹھنے کو کہا گیا مگر اس نے نرمی سے منع کر دیا۔

"بارش میں بھیگی تھی۔ بخار ہو گیا۔" اس کی بھابھی نے بتایا

لڑکیاں لڈی ڈالنے لگی تھیں اس کی بھابھی جوش و خروش سے تالیاں بجانے لگی اسے بھی ٹہوکا دیا۔ وہ چونکی اور پھر ہاتھ اٹھا لیے۔ لبوں پر مسکراہٹ بھی آ گئی فیض کو لگا روشنی بڑھ گئی۔ ناسازیٔ طبع کے باعث اس نے کسی قسم کا سنگھار نہیں کیا تھا۔ اسے ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہاں اس کے ہاتھ میں زرد سادہ کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ اور گلے میں دمکتی ہوئی چین۔

وہ یکدم بری طرح چونکا۔ جھری سے اس کا چہرہ ایک زاویے سے دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بے چینی سے جگہ بدلنے کا سوچا۔ اسے اس کا چہرہ دوسری سمت سے دیکھنا تھا۔

اسے ایک بہت خاص چیز دیکھنی تھی۔ جو پہلے مبہوت ہو جانے کے باعث وہ فراموش کر گیا تھا۔ وہ بہت ضروری چیز تھی۔ عرش سے فرش پر گرا دینے

والی...... وہ اس وقت ہواؤں میں اڑ رہا تھا......
اگر...... اگر...... اسے جگہ بدل کر شامیانے کی دوسری سمت جانا پڑتا فاصلہ بہت ہو جاتا یہاں تو وہ اتنا قریب تھا کہ ہاتھ بڑھا کر چھو سکتا تھا۔ لیکن اسے جانا ہوگا۔ تب ہی وہ کھڑی ہو گئی تھی۔ چہرہ کسی کتاب کی طرح کھل کر واضح ہو گیا۔ فیض کی اٹکی سانس بحال ہو گئی۔ جیسے پہاڑ کی چوٹی سے پیر پھسل جائے مگر گرنے سے پہلے تھام لیا جائے۔ زورا کی ناک خالی تھی۔ اس میں لونگ نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ مانگی ہوئی نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا مانگی جا سکتی تھی۔

فیض نے اپنی ہتھیلیاں آپس میں رگڑیں۔ اس روئے زمین پر اس سے بڑا زوار کا کون طلب گار ہو سکتا تھا...... ہاں ...... ہائے ری غلط فہمی۔

تیرا حسن باکمال...... تیری چال بے مثال۔

☆☆☆

غلط فہمی دور ہو جائے تو قربت بڑھ جاتی ہے۔ ملال چھٹ جاتا ہے۔ دنیا زیادہ روشن اور بہت زیادہ پیاری لگنے لگتی ہے۔ غلط فہمیوں سے بھی پناہ مانگنی چاہیے۔ یہ رشتوں کو ایسے کھا جاتی ہیں جیسے دیمک لکڑی کو...... گدھ ماس کو......

اور خوش فہمی...... یہ بے پر کے پرواز کا یقین، خود کو عقل کل سمجھنے والے دانا، برتری کے احساس سے دھرتی پر پیر مارنے والے کمتر......

ایسوں کی خوش فہمیوں کو کوئی دور نہیں کرتا۔ یہ خود ہی ایک دن دم توڑ دیتی ہیں۔ خوش فہم شاد باد ہوتا ہے مست الست، میں...... میں اور بس میں مگر جب خوش فہمی کا غبارہ پھوٹتا ہے تو آواز نہیں آتی۔

اس کا دل بھی ایسا ہی بجھا تھا۔ جیسے راکھ میں دبی چنگاری بالآخر خاموشی سے دم توڑ دیتی ہے۔ وہ تو یہ سوچ بیٹھا تھا۔ یہ شعلہ بھڑکے گا۔ اور آسمان تک لپٹیں جائیں گی۔ چہار عالم روشن ہو جائے گا۔ مگر...... آہ...... خوش فہمی...... تو بندے کو منہ کے بل زمین پر لا پٹختی ہے۔

علاقے کی روایت تھی جس لڑکی کی منگنی یا نکاح ہو جاتا۔ اس کی ناک میں لونگ ہوتی تھی۔ اس نے اس منحوس خیال پر لاحول پڑھتے ہوئے تصدیق کر لی تھی۔ اس کی ناک خالی تھی۔ اسے تسلی ہو گئی۔ وہ مانگی ہوئی نہیں تھی۔ مگر اس کا کیا کرتا کہ اس نے خود کو ہی خود کو "دان" کر دیا تھا۔

ہاں اسے اس بات کا خیال کیوں نہیں آیا۔

اس کا اترا چہرہ اس کی ناسازیٔ طبع کا آئینہ تھا۔ مہندی کی رسم شروع ہونے سے پہلے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دلہن کی ماں سے معذرت خواہانہ انداز سے اجازت طلب کر رہی تھی۔

"بس جی بھابھی...... سر درد ہونے لگ گیا ہے۔"

"آپ آرام سے بیٹھیں۔ کوئی مسئلہ نہیں۔"

وہ نرمی سے کہہ کر اپنا دوپٹا سنبھالتی۔ پنڈال سے باہر نکل آئی۔ وہ بے چینی سے پیچھے لپکا، کیا وہ رات کے اس پہر اکیلے جانے والی تھی۔ دل نے چونکہ خود کو اس کا سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ سو اس کی حفاظت فرض لگنے لگی۔

اسے مخاطب کرنے کی چاہ میں وہ بھاگا۔ ایسے کیسے وہ اکیلی جائے گی۔ وہ اسے چھوڑ کر آئے گا۔ لیکن تب ہی اس کے قدم ساکت ہو گئے۔ وہ اکیلی نہیں جا رہی تھی۔ اسے لینے والا آ گیا تھا۔ یہ فخر تھا...... اس کے چاچا کا بیٹا...... اوہ...... خیر کوئی بات نہیں چاچا کے بیٹے کا فرض تھا وہ اسے ذمہ داری سے لے جاتا۔ لیکن وہ جا نہیں رہا تھا۔ ٹھہر گیا تھا۔ ایسے جیسے برا وقت ٹھہر جاتا ہے۔ اس نے پیروں کا وزن بدلا جس جگہ وہ کھڑے تھے یہاں روشنی کم تھی۔

مگر اس کم روشنی میں بھی اسے زورا کے چہرے سے پھوٹتی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں وہ بے زاری بجھی آنکھیں۔ اداس چہرہ...... وہ خاموشی وہ چولا تھا۔ جسے اتار کر پھینک دیا گیا تھا۔ وہ ایسے کھل اٹھی تھی جیسے مٹی کے پیالے میں بھیگی کلیاں کھل جاتی ہیں۔

اس پر فخر کی محبت پاش نگاہیں...... اس کی آواز گونج دار تھی۔ سرگوشی بھی دل پر دھمک ڈالتی تھی۔ وہ متبسم لہجے میں بول رہا تھا۔

"میں نے کہا تاؤ جی...... آپ کہاں اس وقت وہ سائیکل چلا کے جائیں گے۔ ویسے بھی سارے راستے میں اندھیرا ہے۔ ہوں ناں...... میں لے آتا ہوں۔"

"تاؤ جی کا اتنا خیال......" وہ ہنسی تھی۔

"میرے بھائی پنڈ میں نہیں ہیں اس لیے اتنی ...نیاں سوجھ رہی ہیں۔"

"کوئی نہیں......" وہ چابی گھما کر بائیک اسٹارٹ کرنے لگا۔

"صاف کہو، میرا خیال آ گیا تھا۔ ہے ناں......" وہ پر یقین تھی۔ فخر کا سر نفی میں ہلا۔ وہ حیران ہوئی پھر اسے گھورنے لگی۔ وہ ہنس پڑا۔ چند پل کے لیے نظریں اس کے چہرے پر جما دیں۔ پھر ہینڈل پر دھرا اس کا زرد چوڑیوں والا ہاتھ تھام لیا۔

"صرف اپنا...... اپنی آنکھوں کا خیال تھا۔ جو بے چین تھیں، کہہ رہی تھیں......" اس نے اس کی کلائی چھوڑے بغیر اپنی رسٹ واچ دیکھی۔ "چھتیس گھنٹے سے زیادہ ہو گئے وہ دکھائی نہیں دی۔ ورنہ دل لٹو میں سمجھا لیا کرتا ہوں۔" اس نے قہقہہ لگایا۔

"فخر......" وہ ششدر رہ گئی۔ اس نے اس طرح سے اظہار پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔

"کیا فخر......" اس کے ہاتھ چھوڑ کر بائیک اسٹارٹ کی۔ روشنی کے تیز جھماکے میں وہ دونوں ہوا ہو گئے۔ فخر کی محبت پاش پر یقین نگاہیں...... موم کی طرح پگھلتی زورا...... فیض نے اس کی نیلی آنکھوں کو جھلملاتے دیکھا۔ وہ بائیک پر اس کے پیچھے بیٹھ گئی تھی۔ زرد چوڑیوں والا ہاتھ اس کے شانے پر رکھے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

جبکہ وہ اس دھول بھرے راستے پر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ کیسے اس نے تھوڑی سی دیر میں پوری زندگی کو جی لیا تھا۔ کیسے پلک جھپکتے میں زندگی دغا دے گئی۔

اس نے دوستوں سے سن رکھا تھا۔ سیف اللہ کا ...ستو والے باغ میں پڑھنے کے بہانے ملاقاتیں کرتا ہے۔ اس نے یقین نہیں کیا۔ اس نے تو کبھی نہیں دیکھا۔ اسے پنڈ کے سب چکروں کا پتا تھا۔

یا شاید اس لیے کہ...... وہ چکر فلاں کی بیٹی کا...... فلاں کے بیٹے سے تھا۔

یہ سگے چاچے تائے کی اولادیں تھیں۔ ایک گلی کے گھر تھے۔ اس لیے یہ والا چکر مخفی رہ گیا۔ لیکن جب گھروں میں آنا جانا ہے تو باغ میں ملنے کا کیا مقصد۔

اس کی سوئی اٹک گئی۔ حیرت...... طیش کا روپ دھار گئی۔ طیش حسد میں بدل گیا۔ کیا تھا اس فخر میں...... سیف اللہ کا یتیم بھتیجا...... جو زمین جائیداد کے نام پر ایک گھر میں رہتا تھا اور تھوڑی سی زمین جس سے ماں بیٹا گزر بسر کرتے تھے۔ شکل و صورت کا خوب تھا پر ایسا بھی نہیں کہ زورا جیسی لڑکی اس پر مرتی۔

ہاں پڑھا کو تھا۔ ماں زمین بیچ بیچ کر فیس بھرتی تھی۔ یہ اسے پتا تھا۔ کیونکہ ایک بار تو خریدار خود شریف کمہار تھا۔

فیض نے وہ ساری رات آنکھوں میں کاٹی۔ غیر مرئی نقطے پر نگاہیں جمائے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے۔

☆☆☆

"تاؤ سیف اللہ کا بھتیجا بڑی ہواؤں میں ہے۔ کیا کرتا ہے آج کل...... سلام کا جواب بھی اشارے سے دیتا ہے۔ جیسے بڑا مصروف ہو اور سارے ویلے......" فیض نے بڑے سرسری لہجے میں بات شروع کی۔ یہ تو وہ خود ہی جانتا تھا کہ بات کتنی گہری ہے۔ اتنی کہ کسی کو ڈبو دیا جائے تو کبھی نہ ابھرے۔

"کون...... فخر......؟" صدیق تنکے کو چبا رہا تھا۔ جھٹکے سے توڑ کر پھینکا منہ میں رہ جانے والے برادے کو پھوں کر کے ہوا میں اڑا دیا۔

"ہاں...... وہی فخر......" فیض کے منہ میں نیم گھل گیا۔ وہ سارے شہر سے گاؤں کو جوڑنے والی سڑک کنارے پر بنے چائے کے کھوکھے سے ذرا دور بے ترتیب پتھروں پر بیٹھے تھے۔ فیض کے ہاتھ میں

کنکریاں تھیں۔ جنہیں وہ بلا مقصد سڑک پر مار رہا تھا۔ سر جھکا ہوا تھا۔ نظریں سیاہ سڑک پر جمی تھیں۔ اب سے کچھ دیر پہلے فخر ان سب کے پاس گزرا تھا۔ وہ لاہور جانے والی بس میں سوار ہوا تھا۔ بس اس موڑ پر چند ساعتوں کے لیے رکتی تھی۔ وہ بدقت وقت پر پہنچ سکا تھا۔ ان سب کو مسکرا کر بھی نہ دیکھ سکا۔ کہ بس آ گئی۔

فیض نے ساری رات اسے سوچا تھا گھر میں شادی کی ہلچل تھی۔ وہ ہر چیز سے جان بچاتا دور آ کر بیٹھ گیا۔ اسے یکسوئی درکار تھی۔

مگر یہ یار بیلی ...... اور اس پر فخر کا منہ دیکھ لیا۔ اس کا اندر تک سڑ گیا۔

"ہاں ناں ...... کوئی بڑی افسروں والی پڑھائی پڑھ رہا ہے۔" صدیق نے لاپروائی سے کہا۔

"افسروں والی ...... اوئے سب ہی افسر بننا چاہتے ہیں۔ بنتا بس ایک ہی ہے اور ضروری نہیں کہ وہ ایک یہی ہو۔"

"یہی ہو جائے گا ...... جس طرح کتابوں کے گھوٹے لگاتا ہے ناں ...... اس نے افسروں کا بھی افسر بن جانا ہے۔" مدثر نے ہاتھ کے اشارے سے کھوکھے والے کو تین کپ چائے کا کہا۔

"اور وہ جو اس دن تم لوگ کہہ رہے تھے کہ بغل میں کتابیں ہیں۔ پر کر کے ملاقات آیا ہے وہ کون تھی۔" (وہ ابھی تک گمان میں تھا۔ ملاقاتوں والی لڑکی زورا نہیں ہوگی)۔

"کس دن۔" صدیق نے سڑک کی آواز سے گھونٹ بھرا۔

"جس دن ہم بارش کا کہہ کر لفٹ دے رہے تھے۔"

"اچھا وہ ...... تجھے نہیں پتا کون تھی ...... اس کے تائے کی بیٹی تھی۔ زورا ......" مدثر کو فوراً یاد آ گیا۔ "کسی کو پتا نہ چلے تو اس نے اسے باغ کے پیچھے والے حصے سے بھیجا اور خود کتابیں سینے سے لگا کر سامنے آ گیا۔ جیسے ہم بے وقوف ہیں ......؟"

اس نے ہاتھ پھینکا تا کہ فیض تالی بجا کر تصدیق کرے مگر فیض نے ہونٹوں سے کپ لگا لیا۔ تالی کے لیے صدیق نے ہاتھ مارا۔ پھر دونوں ہنس پڑے۔

فیض کی آنکھیں لبریز ہو گئیں۔ اس نے کھولتی چائے کو ایک گھونٹ میں پینے کی غلطی کی تھی۔

"اوئے آرام سے ......" مدثر نے اس کی کمر سہلائی۔ فیض نے اسے باز رہنے کا اشارہ کیا اور جیب سے رومال نکال کر آنکھیں پونچھیں۔

"جب سگے چاچے تائے کی اولادیں ہیں گھر میں مل لیا کریں۔ اتنی دور باغ میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔" اس کے لہجے کی کڑھن پر دونوں دوستوں نے غور نہیں کیا۔ دونوں ہنسے تھے۔ ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ پھر صدیق نے فیض کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ذرا جھکتے ہوئے آنکھ ماری "گھر میں وہ مزہ کہاں جو ...... باغ والی ملاقات میں ملتا ہے۔

"کیا مطلب ......" اس کے منہ سے بلا ارادہ نکلا۔

"اوئے مطلب تو شہزادہ ایسے پوچھ رہا ہے جیسے جانتا نہیں کہ فرق کیا ہوتا ہے ہاہاہا۔"

فیض کے لب بھینچ گئے۔ ایسے معنی و مطالب جاننے میں وہ ان سب کا استاد تھا۔ مگر دل کے نہاں خانے میں چھپا انکار وجہ سوال بن گیا۔ وہ زورا کے حوالے سے ایسی کوئی بات سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ ایسے لگا جیسے رگوں میں لہو کی جگہ مرچیں بھر گئی ہوں۔

وہ سارے ملاقات، کو کن معنوں میں کس حد تک لے جاتے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

"گھر میں کیسے مل سکتے ہیں۔ تین ٹیم تو فخر کی ماں قرآن پڑھاتی ہے۔"

"اور زورا کا تو اپنا پورا ٹبر ہے۔" مدثر، صدیق اب آپس میں بات کر رہے تھے۔

"ماں پنڈ کی کڑیوں کو دین کا راستہ سکھاتی ہے اور پتر دوسرے کی بیٹی کو دنیا سمجھا رہا ہے۔"

"باغوں میں عشق محبت کی پینگیں ڈالی جا رہی ہیں۔" فیض کا لہجہ اندرونی کھولن کا مظہر تھا۔ "اپنے کو تعلیم نہیں کرتی ماں ...... کہ ایسے عشق معاشقے شریفوں کا طریقہ نہیں ہوتے۔" مدثر اور صدیق ہنس دیے۔

"عشق معاشقے کی بات نہیں ہے۔" مدثر بولا۔ "بچپن کے سنگی ساتھی ہیں۔ سمجھ ایک ہی گھر میں پلے بڑھے ہیں۔ چاچے تائے کی اولادوں میں پسند ہو ہی جاتی ہے۔"

☆☆ گھر کی بات گھر کے اندر ہی رہتی ہے۔ پتا تب چلتا ہے جب تائی کارڈ ونڈنا (بانٹنا) شروع کرتے ہیں۔ سب کہتے دادے نے رشتہ طے کر دیا ہے۔ اندر خانے پلنے والے لو کو ارینج کر کے سب کی عزت رہ جاتی ہے۔" صدیق ہنس پڑا مدثر بڑے جلے سڑے لہجے میں ساروں کا کچا چٹھا کھول رہا تھا۔

"تو کیا کوئی منگنی شگنی ہو گئی ہے ...... میں نے تو نہیں سنا۔" فیض نے بدقت کہا۔

"اوہ جی تو وہ کون سی ضروری ہے۔ بعض رشتے گھڑے گھڑائے ہوتے ہیں۔ کوئی منہ سے نہ بھی بولے تو سب جانتے ہیں۔ ان کا آپس ہی میں ہونا ہے۔" مدثر نے بات ختم کر دی۔

"یہ تو جب سے وہ کرم والا معاملہ خراب ہوا تب سے بے چاروں کو باگ بگیچے (باغ باغیچے) لونے کھدرے ڈھونڈنے پڑے۔ ورنہ تو چوبیس گھنٹے کی ملاقات تھی۔" صدیق نے مدثر کو یاد دلانا ضروری سمجھا۔ مدثر کا سر ہلایا۔

"ہاں ...... یہ تو میرے ذہن سے ہی نکل گیا۔" وہ ہاتھ جھاڑتا کھڑا ہو گیا تھا کیا ...... فیض نے بےصبری سے انہیں دیکھا۔

"یہ کرم کا کیا معاملہ تھا۔" صدیق اور مدثر نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"تجھے نہیں پتا؟ بچہ بچہ جانتا ہے۔"

☆☆☆

کرم کے پیر بریک پر جا لگے۔ سامنے کے منظر نے اسے پتھر کا کر دیا تھا۔ اسے اپنے اندر سناٹے اترتے محسوس ہوئے۔ اپنے دل کی دھڑکن ایسے سنائی دے رہی تھی۔ جیسے بم پر لگا ٹائمر الٹی گنتی پوری کر رہا ہو۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں پھیلتی نمی کو انگلیاں مسل کر کم کرنا چاہا۔ اور آنکھوں کی نمی اس نے تیز تیز پلکیں جھپکیں۔ تو یہ خواب نہیں تھا۔ حقیقت تھی۔ کرم سائیڈ پر ہو گیا۔

سامنے وہ فری ہی تھی۔ اپنی ماں سے الوداعی دعا سلام کرتی ہوئی جھلملاتے لباس چمکتی سینڈل پر سفید بڑی چادر میں خود کو لپیٹے وہ خوشی سے بے حال نظر آتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر لگا تیز گلابی رنگ اور آنکھوں پر کھنچا سیاہ خط اتنی دور سے بھی نمایاں تھا۔ اس کے ساتھ کھڑا مرد اس کا شوہر تھا۔ عتیق۔ وہ جسے کسی اور نے نہیں خود کرم کے اپنے باپ نے کرم پر ترجیح دی تھی۔ ورنہ وہ کرم کی جگہ تھی جہاں وہ شخص وہ نگاہیں جن سے وہ فری کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تو کرم کی ہونی چاہیے تھیں ناں ...... اور وہ مسکراہٹ ...... ایسا حق اس کے علاوہ اور کس کا ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے باپ نے ...... کیسے اسے دھکیل کر کسی اور کو فری کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ فری کی ماں نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں بھر کے چوما تھا۔ پھر اسے لپٹا لیا۔ تب ہی فخر بڑے بڑے شاپر اٹھا کر باہر آ گیا۔ وہ انہیں فری کے شوہر کی گاڑی میں رکھ رہا تھا۔ سیاہ چمکتی کار ...... فری کا میاں افسر تھا۔ کرم کے باپ نے کہا تھا۔ وہ اپنی بھتیجی کسی ٹٹ پونجیے سے نہیں بیاہیں گے۔ انہوں نے کرم کو ٹٹ پونجیا کہا تھا۔ فری کے شوہر نے اپنا سر ساس کے آگے جھکا دیا پیار لینے کو ...... کرم نے جبڑے اس شدت سے بھینچے کہ اس کی کنپٹیاں سلگنے لگیں۔

اب وہ فخر سے گرم جوشی سے گلے مل رہا تھا۔ پھر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا فخر نے فری کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ بیٹھ گئی۔ گاڑی جب تک نگاہوں میں رہی ماں بیٹا ہاتھ ہلاتے رہے۔ گاڑی کرم کے پاس سے فراٹے بھرتی گزری۔ گاؤں کی کچی مٹی

ڈھول بن کر کرم کے منہ پر جا پڑی۔ وہ بری طرح کھانسنے لگا۔ ڈھول تو اسے اس کے باپ نے چٹا دی تھی۔ باپ بھلا ایسے ہوتے ہیں۔ اس کا دل باپ کے لیے نفرت سے لبریز ہو گیا۔

☆☆☆

"سارا دن بیٹھ کر بس حکم چلاتی ہے فری......" زہرہ کی اشتیاق و آسائش سے بھرپور آواز سارے کمرے میں گونج رہی تھی۔ "بہت خوش ہے وہ...... کہہ رہی تھی سب بہت یاد آتے ہیں مگر کیا کرے۔ روز روز نہیں آسکتی۔ عتیق بھائی کو چائنیز کھانے کا شوق ہے۔ فری نے کوکنگ کلاس لینی شروع کر دی ہے اور پتا ہے......" زہرہ کا جملہ منہ میں رہ گیا یہ اسٹیل کا گلاس تھا۔ جو اتنی زور سے اٹھا کر مارا گیا تھا کہ گلاس میں ڈینٹ پڑ گیا۔

"کرم......" بھابھی نے دیکھے بنا سرسراتے لہجے میں کہا۔ ان کا خدشہ درست تھا۔ خطرناک تیور لیے دروازے کے بیچ و بیچ کرم ہی کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔

"میں نے کہا تھا ناں...... اس کا نام نہ لینا اس گھر میں۔" وہ جارحانہ تیور لیے زہرہ کی سمت بڑھا جیسے گلا دبا دینا چاہتا ہو۔ زہرہ کی چیخ نکل گئی۔

"بھابھی......" وہ پلنگ کے اوپر کھڑی ہو گئی پھر جست لگا کر ناہید کے پیچھے جا چھپی۔

"کیا ہو گیا کرم......" ناہید نے بڑے پن سے کہا۔

"برباد ہو گیا کرم...... اور کیا ہو گیا۔" اس نے بھابھی کو جواب دیا اور زہرہ کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ درمیان میں پلنگ حائل تھا۔ اور زہرہ نے ناہید کو ڈھال بنا لیا تھا۔

"یہ......" اس نے انگلی اٹھائی۔

"ان کے گھر گئی تھی ناں......" وہ سوال نہیں کر رہا تھا۔

"میں نے منع کیا تھا ناں...... پھر بھی......" وہ حلق کے بل چلایا اور دروازے پر مکا رسید کر دیا۔

ناہید کا جسم کانپ اٹھا۔ زہرہ بھی خوف زدہ ہو رونے لگی۔

اسے کرم کے جنون سے خوف آنے لگا تھا کیفیت ناہید کی بھی مختلف نہ تھی۔

"امی...... امی......" اس نے یوں آواز لگائیں۔ جیسے مدد کو پکار رہی ہو۔ پر یہ کیا...... ا سے پہلے ابا جی پہنچ گئے۔ خشمناک تیوروں سے پہلے کرم کو دیکھا۔ پھر جب ہراساں کھڑی بہو اور بیٹی دیکھا۔ تو حق دق رہ گئے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" سیف اللہ کی پر جلال آوا سن کر امی بھی آگئیں۔ "اب کیا کر دیا تھا کر نے......" انہوں نے کچھ جانے بوجھے بغیر غیر محسو طریقے سے نفی میں سر ہلایا۔ کہ اگر کرم نے کچھ کر دیا ہے تو وہ دونوں کچھ نہ کہیں...... جو بھی معاملہ پی جائیں۔

"کک...... کچھ نہیں ابا جی......" زہرہ نا کے پیچھے سے نکلی۔

"جی ابا جی، کچھ نہیں...... وہ چھپکلی ابا جی......" زہرہ کو بہانہ سوجھ گیا۔ امی کی آنکھوں میں سکو اترا...... جبکہ ابا جی کی تشکیک برقرار تھی۔

"جی...... وہ چھپکلی......" ناہید پھیکی ہنسی ہنسی

"کوئی چھپکلی نہیں ہے۔ میں ہوں۔" دروازے سے ہٹ کر بیچ میں آگیا۔

"میں نے منع کیا ہے اسے...... یہ نہیں جا گی ادھر...... تو کیوں گئی یہ......" وہ دھاڑا سیف کو اس کے تیوروں نے چونکایا تھا۔ مگر ادھر، کا کان میں پڑتے ہی سارا معاملہ سمجھ میں آگیا۔

"میں فری سے ملنے گئی تھی ابا جی...... سے پوچھ کر ہی گئی تھی۔" زہرہ نے آگے آکر با کہنی تھام لی۔ سیف اللہ نے بیٹے کو دیکھا جو ہوا شیر لگ رہا تھا۔ مگر آنکھوں سے چھلکتی نمی ریخت کو ظاہر کر رہی تھی۔

انہیں سمجھ میں آگیا۔ اسے فری کی آمد کا گیا ہوگا۔

جلال...... ملال میں ڈھل گیا۔ وہ زہرہ کا ہاتھ ھامے کمرے سے باہر نکل گئے۔ ناہید ساکت ڑی تھی۔ شمیم آگے بڑھی۔ اس کا ہاتھ تھام کر اسے رے سے لے جانا چاہا مگر اس نے سخت بے ی سے ہاتھ جھٹک دیا۔ اور کمرے سے نکل گیا۔ ے فری کی آمد کا پتا نہیں چلا تھا۔ اس نے آج فری و دیکھ لیا تھا۔ اس کی شادی کے بعد...... آج پہلی ر...... اتنا ردعمل تو جائز تھا۔ اتنا تڑپ جانا بھی حق تھا۔

☆☆☆

"فری کا رشتہ......" شمیم نے سیف اللہ کی ل دیکھی۔ اسے لگا اسے یقیناً سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

"فری کا رشتہ کسی اور سے بھلا...... ہو سکتا ہے۔"

اس میں اتنی حیرانی کی کیا بات ہے فری کی ادی نہیں کرنی کیا......؟" سیف اللہ نے تیکھی نگاہ ے بیوی کو دیکھا۔

"نہیں کرنی چاہیے تو مگر...... کیا مگر......؟"

"فری کو تو میں نے اپنے کرم کے لیے سوچ ھا ہے۔"

"سوچا تو میں نے بھی یہی تھا مگر اب ارادہ ل کیا ہے۔ میں یتیم بھتیجی اس نکمے کے حوالے نہیں کتا۔" وہ اتنی سختی سے بولے تھے کہ شمیم کے اظ گم ہو گئے۔

"کرم برداشت نہیں کر سکے گا...... وہ...... وہ ...... فری کو پسند کرتا ہے۔" شمیم نے کہا سیف نکے۔

"تو خود کو اس کے قابل بناتا ناں......" وہ دیر بعد بول سکے۔ اپنے تئیں انہوں نے بات دی تھی۔

مگر خود شش و پنج میں پڑ گئے۔ یتیم بھتیجا بھتیجی مانت تھے۔ بہت خوف خدا سے پالا تھا انہوں ں کو...... کرم میں ذرا سی بھی احساس ذمہ داری ہوتی تو وہ سوچتے مگر اپنے لاابالی پن میں اس نے پڑھ کر نہ دیا۔ کاروبار سنبھالنے میں اسے دلچسپی نہیں تھی۔ پھر آوارہ دوستوں کی منڈلی۔ شغل میلے میں وہ تھانے حوالات کے چکر بھی لگا آیا تھا۔ ان کی تو دلی خواہش تھی کہ بھتیجی بہو بن جاتی۔ مگر کرم کے کرم ایسے نہ تھے۔ اس سے مایوس ہو کر سیف اللہ نے رشتہ تلاشنا شروع کر دیا۔ یہ کام وہ خاموشی سے کر رہے تھے۔ اسی خاموشی سے اندر ہی اندر شمیم ان سے لمبی بحثیں کرتی۔ "بیٹے کی اصلاح کے لیے میں بھتیجی کی فلاح کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔"

"تو نہ کمائے کرم...... یہ اتنا سب کس کے لیے ہے۔ بیٹھ کے کھائے گا بیوی بھی کھالے گی۔"

شمیم جھگڑنے لگی۔ اس کے نزدیک یہ اتنی بڑی بات نہیں تھی۔

"شادی کے بعد لڑکے سدھر جاتے ہیں۔" سیف اللہ کو صدمہ پہنچا۔

"اچھا...... اتنی عام سی بات ہے یہ تمہارے لیے۔" ان کا لہجہ دکھی تھا۔

"تو ایک بات بتاؤ تم دو گی کرم جیسے لڑکے کو اپنی زہرہ......؟" شمیم کا ہاتھ کلیجہ پر جا پڑا۔

"ہائے زورا کے ابا جی بس اب کچھ نہ کہنا۔"

کرم کے پیروں تلے سے زمین کھنچ گئی۔ وہ جن مہمانوں کو ابا جی کا خاص الخاص سمجھ کر بہت عزت و احترام سے مل رہا تھا۔ وہ...... اس کا حلق سوکھا۔ وہ فری کے رشتے کے لیے آئے تھے۔ پھر اسے پتا لگا۔ آئے نہیں تھے جیسے کہ رشتے آجایا کرتے ہیں۔ یہ خصوصی طور پر بلوائے گئے تھے۔ ابا جی لڑکا پسند کر کے آچکے تھے۔ اور آج وہ لوگ فری کو دیکھنے بلکہ بات کو آگے بڑھانے آئے تھے۔ وہ بھناتا فری کے سر پر جا پہنچا۔

"تم نہیں جاؤ گی مہمانوں کے سامنے...... اور یہ تم اتنا تیار کس خوشی میں ہو۔"

"میں صرف تیار ہوں کرم...... تمہیں خوش نظر آرہی ہوں تو اور اچھی بات ہے۔"

"مطلب......؟" وہ اکھڑے لہجے میں بولا۔
مگر تب ہی چاچی جی اندر چلی آئیں۔
"بھنوں کے رشتے ہو رہے ہوں تو۔"
"بہن نہیں ہے یہ میری......" وہ چلایا۔ اس نے اظہار نہیں کیا تھا۔ اسے لگتا تھا اس کی ضرورت نہیں...... چاچی جی کے پیچھے اباجی تھے۔
"آواز ہلکی رکھو۔" وہ غرائے تھے۔
"مجھے بات کرنے دیں تاؤ جی......" فری بولی۔
"سب کچھ ٹھیک تھا تم میں کرم...... مگر جس دن تم کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھے......" دل سے اتر گئے۔ "تم صحیح کہہ رہے ہو اب میں تمہاری بہن بھی نہیں رہی۔" (وہ چچازاد ہونے کی طرف اشارہ کر رہی تھی)
"اوہ......" کرم کے پیروں سے زمین کھسکی۔
"وہ تو بس دوستوں کے ساتھ شغل میلے میں۔"
"لیکن، برخوردار یہ شغل میلہ نہیں ہو رہا۔" سیف اللہ نے کمان سنبھال لی۔
"چلو۔" وہ اسے لے ہی گئے۔
پھر اس نے لاکھ سر پٹخا...... مرنے کی دھمکیاں دیں۔ مار دینے کی بھی...... مگر کچھ کام نہ آیا۔ یہاں تک کہ شادی کے دن شروع ہو گئے۔ سارے گاؤں والے حیرت کا شکار تھے۔ یہی کہتا تھا سیف اللہ بھتیجی کو نوہ بنائے گا۔ مگر جب بیٹا نکما نکلا تو کس ایمان داری سے بھتیجی کو بیٹی کی جگہ سمجھ کر بیاہ رہا ہے۔ ورنہ اور لوگ ہوتے تو کہتے اپنی نوہ ہی بناؤں گا۔ دیاہ کے بعد تو منڈے سنور ہی جاتے ہیں۔
ایک طرف سیف اللہ کی واہ واہ ہو رہی تھی۔ اور دوسری طرف بے حسی واشتعال کے جذبات لیے کرم...... فری کے کمرے میں جا گھسا۔

☆☆☆

شروع میں یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس سے سخت مرعوب ہے۔ اسے بہت اعلا و ارفع سمجھتا ہے اور خود کو بہت ادنی۔ کمتر یا پھر...... اوں...... یا پھر ذلیل......

ٹھیک، وہ اس سے بار بار اپنی محبت کا اظہار کر... اس نے سن رکھا تھا نفرت نہیں سہی جاتی۔ وہ... کر کہنا چاہتی تھی کہ یہ محبت برداشت نہیں کر... جا ہی نہیں سکتی۔ کبھی لگتا تھا کہ وہ شاہ زادی ہے... ایک غلام جو اس کے پیروں کے نیچے ہاتھ... گا...... اور پھر یہ وقت آ گیا کہ وہ اس کے... کے نیچے سے زمین کھینچ لینے پر کمر بستہ ہو گیا۔
چاہ (شوق) تھا۔ جو پورا ہو گیا تھا۔... کرنے کا...... اپنے نام کر لینے کا، مردوں کی دنیا میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ کہ اگر ان کے... میں ہو تو وہ زمین جائیداد اور گاڑی کی طرح عور... بھی رجسٹرار کے دفتر جا کر اپنے نام لکھوا آئیں...
ہر فرد عورت کو ایک خاص نظر سے دیکھتا... کچھ سر پر بٹھاتے ہیں۔ کچھ سینے سے لگاتے ہیں... کچھ جوتی سمجھ کر تلوے کے نیچے دبا دیتے ہیں ا... کی زمین پر گھستے پھرتے ہیں۔
اس نے تین ماہ میں یہ تینوں مدارج... آرام سے طے کر لیے کہ پتا بھی نہ چلا۔ عجیب بات یہ تھی۔ اسے تیسرے درجے پر پہنچ کر قر... گیا۔ جیسے وہی اس کا اصل مقام ہو۔ باقی فریب۔
وہ اس کی شخصیت کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ و... جلدی رنگ بدلتا تھا کہ گرگٹ کو مات دے دی... پہلے وہ اس کے سارے کام کرتا تھا۔ جیسے عباد... رہا ہو۔ پھر اس نے رنگ بدلا۔ اب وہ اس... لینے لگ گیا تھا۔ ایسے کہ کروٹ تک... بدلا...ئے۔ شب زفاف جو اس کے نزدیک غم کی... تھی۔ شب ظلمات تھی۔ شب ماتم تھی۔
اس نے ساری رات اس کے حسن کی ت... کرتے اور یہ بتانے میں گزار دی۔ کہ اس حس... اس پر کیسی کیسی قیامت ڈھائی۔ وہ اس سے... کی باتیں کرتا تھا۔ لیکن اب اس نے اس... باتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ وہ یہ...... میں... ویسا...... پہلے وہ اس کا احسان مند تھا کہ ا...

...رف قبولیت بخشا پھر احسان جتانے لگا۔ کہ اس ...ے اپنایا۔
اس کی پہلی بات غلط تھی۔ اس نے ایک بار بھی ...شرف قبولیت نہیں بخشا تھا۔ اس نے تو بس "ہاں" ...ہی۔ جسے کہلوانے کے لیے اس کے سر پر مانو ...ا کا دی گئی ہو۔ اس کی دوسری بات اس نے مان ...ہاں یہ اس کا احسان تھا کہ اس نے اس جیسی کو اپنا ...

"ہاں...... تم ٹھیک کہتے ہو۔"
وہ خاموشی سے سنتی تھی۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ ...نے جواب دیا تھا۔ وہ حیران رہ گیا۔ اس پر اسی ...ایک انکشاف ہوا۔ وہ بولتی نہیں تھی۔ ہنستی نہیں ...اس نے اس کے سر پر "کیوں" کا زہر میں بجھا ...ر رکھ دیا۔
اور کیوں کے جواب میں پوری داستان تھی۔ ...ان میں بہت سے کردار تھے۔ کچھ وہ جن سے ...شدید محبت تھی۔ اور جو اسے چاہتے تھے۔ اور ...وہ جو اس سے نفرت کرنے لگے تھے۔ اور جن ...شاید اسے بھی نفرت ہو چکی تھی۔

☆☆☆

فیض اس کی بو سونگھنے میں لگ گیا تھا۔ پہلا ...ا یہ ملا کہ ساتھ والے پنڈ میں بنے ووکیشنل سینٹر ...لائی بنائی کا گر سیکھنے کے لیے اس نے بھی داخلہ ...ہے۔ اس نے کک لگائی تو سینٹر کے دروازے پر ...ر رکا۔ اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس کے ...ل کی کوششوں کے آغاز میں پہلا قدم ہی ...ل ثابت ہوا تھا۔ وہ سامنے سے آ رہی تھی۔ ...ی نیلی شیشوں والی چادر اس طرح سے اوڑھ رکھی ...لہ وہ گھٹنوں سے نیچے تک ڈھکی ہوئی تھی۔ اس ...اندھے پر بیگ تھا اور ہاتھ میں کچھ چارٹ اور ...ل...... اس نے چادر کو اس مہارت سے چہرے ...لپیٹ رکھا تھا کہ ماسوا آنکھوں کے سب مخفی ...وہ اپنی کسی سہیلی کے ساتھ تھی۔ سینٹر کے سیاہ ...ے کے پار چھابڑی والا زمین پر جا من...... اور کچی انبیاں مسالا لگا کر بیچ رہا تھا۔ دونوں سہیلیاں اس کے پاس جا رکیں۔ منہ میں پانی آ رہا تھا۔
وہ عجلت کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ سہیلی نے تو فوراً ہی ایک قاش اٹھا کر منہ میں رکھ لی اور زور سے آنکھیں میچیں۔ زہرہ نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا اور ہنس دی۔ کاغذ پر رکھی قاشوں کو سنبھالے وہ راستے پر چل پڑیں محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دونوں نے اپنے نقاب ڈھیلے کر دیے تھے۔
ان کے منہ اور زبانیں ایک ساتھ چل رہی تھیں۔ وہ لمبے قدم اٹھاتی تھیں اور تیز چلتی تھیں۔ مگر پھر بھی گھر تک پیدل نہیں جا سکتی تھیں۔ یقیناً سڑک پر آ کر چنگ چی رکشہ لیتیں۔ یا پھر کوئی انہیں لینے بھی آ سکتا تھا۔ سینٹر سے نکلنے والی لڑکیاں گاؤں کی سمت بڑھی تھیں صرف یہ دونوں سڑک تک جا رہی تھیں۔
تین دن کے اندر فیض ان کے معمولات سے واقف ہو گیا۔
تین دن ہی میں صبر ختم ہو چکا تھا۔ اسے ایسے چھپ چھپ کر دیکھنے یا خاموشی سے پیچھا کر کے زنخوں والا کام نہیں کرنا تھا۔ وہ مرد تھا...... مرد بے خوف ہوتا ہے اور دوٹوک بھی...... آج وہ پیچھے نہیں سامنے آنے کے ارادے سے گھر سے نکلا تھا۔
وہ دونوں جیسے ہی سڑک پر چڑھیں۔ اس نے بائیک ان کے قدموں کے پاس لا کر ایسے بریک لگائی کہ وہ دو قدم پیچھے کو ہو گئیں۔ گرنے سے بچنے کے لیے ایک دوسرے کو تھاما۔
"اندھے ہو نظر نہیں آتا کیا......" یہ کڑک دار آواز زہرہ کی تھی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں غصہ کے ساتھ حیرت بھی تھی۔ اس کی سہیلی نے فیض کو پہچان لیا۔ جبکہ زہرہ کی آنکھیں کسی بھی پہچان سے عاری تھیں۔ وہ تاسف سے گر جانے والے اسکیل اور چارٹ کو دیکھ رہی تھی۔
وہ دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"رہنے دو میں اٹھا دیتا ہوں۔" وہ تیزی سے اترا۔ وہ اسکیل اٹھانے کو جھکی تھی۔

''ناں ...... نہیں ......'' اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''جہاں ہو وہیں رہو۔'' اس نے اسکیل اٹھا کر جھاڑا اور ڈھیلے ہو جانے والے نقاب کو کسا۔

''لگتا ہے تم نے مجھے پہچانا نہیں ......'' وہ اسے قطعاً نظر انداز کر کے آگے بڑھنا چاہتی تھیں اس نے تیزی سے گھوم کر پیچھے سے آواز دی۔ زہرہ کے قدم رکے۔ اس نے سہیلی کو دیکھا۔ یہ کون تھا۔ اور یہ کیا طریقہ تھا بلانے کا ...... تب تک وہ سامنے آ گیا۔ نیلی آنکھوں میں اچنبھا تھا۔

''تم زورا ہو ناں ...... صاف لگ رہا تھا وہ جواب جانتا ہے۔ اسے پتا ہے کہ وہ زورا ہی ہے۔ پھر سوال کا مقصد ...... زہرہ کی آنکھیں سکڑیں پھر پھیل گئیں۔

ان میں حیرت کی جگہ اب درشتی جھلکنے لگی تھی۔ جس ٹکراؤ کو حادثہ سمجھی تھی۔ تو وہ دراصل سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ کون تھا یہ لوفر ...... اس طرح سے مقابل آ جانے والا اور اس پر آنکھوں سے چھلکتا اشتیاق۔

''چلو نادیہ ......'' اس نے یک دم سہیلی کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے انداز میں تیزی تھی۔ پر اس کے چار قدموں کو اس نے ایک جست میں برابر کر دیا۔ وہ پھر مقابل تھا بلکہ اس بار ''رکاوٹ'' محسوس ہوا جو آگے بڑھنے میں حارج ہو سکتی تھی۔ یا ہو چکی تھی۔

''میں فیض شریف ...... یاد نہیں ہم بچپن میں اسکول میں پڑھتے تھے۔'' اس کے پاس اس سے بڑی پہچان اور کوئی نہیں تھی۔ اس نے اسی کا ہتھیار بنایا۔ مگر آگے بھی زہرہ تھی۔ اس کی بھنویں آپس میں مل گئی تھیں۔ وہ جیسے اسے تول رہی تھی۔

''بچپن تو کب کا ختم ہو گیا۔ لیکن لگتا ہے تمہارا نہیں ہوا۔'' اس کے لہجے میں طنز کم برہمی زیادہ تھی۔

''مطلب ......؟'' وہ گڑبڑا گیا۔

''تمہیں کسی نے یہ نہیں بتایا کہ راہ چلتی لڑکیوں کو ایسے آواز نہیں دیتے۔''

''اور راستہ تو بالکل نہیں روکتے ......'' اس کا لہجہ زیادہ ہتک آمیز تھا یا آنکھوں سے چھلکتی درشتی۔

وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی لگتا تھا ہاتھ بڑھا کر منہ نوچ لینے کا ارادہ ہو۔ وہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔ پھر اس نے مڑے بغیر سہیلی کا ہاتھ دبوچا۔

''چلو نادیہ ......'' اور پیر پٹختی نکلتی چلی گئی۔ ہکا بکا کھڑا تھا۔ اکھ مٹکے کے معاملے میں وہ کھلا تھا۔ ہر طرح کے معاملے کو بڑی ذہانت سے جاتا تھا۔ مگر ایسے ...... وہ سو باتیں سوچ کر آیا ایسے کہے گی تو ویسے کہوں گا ...... ویسے تو ایسے ...... مگر جیسے وہ کہہ گئی تھی۔

بات یہ ہے کہ ضروری نہیں لعنت ڈالنے لیے دونوں ہاتھوں کا پنجہ کھول کر سامنے والے منہ پر کر دیا جائے۔ لعنت دینے کا ایک انداز یہ بھی جو زہرہ نے اپنایا تھا۔ فیض نے منہ پر ہاتھ پھیر نادیدہ نشان کو صاف کرنا چاہا تھا۔ اس کا منہ ایک چار بخار کی حدت لیے ہوئے تھا۔

☆☆☆

عاشق حسین سڑک پر چلتا جا رہا تھا۔ ایسی دھیانی تھی کہ کنارے پر چلتے، چلتے کب سڑک چڑھ جاتا پتا نہ چلتا۔ پھر کسی گاڑی کا ہارن بجتا ...... کوئی منہ سے چیخ پڑتا۔

''اوئے سیڈ (سائیڈ) تے ہو کے چل مرن دا شوق ہے۔''

''میرے ای گل پینا اے ......'' (میرے گلے پڑنا ہے) تب وہ بری طرح چونکتا اور درست کر لیتا۔ اس کے کف کا بٹن کھلا تھا۔ مگر لگانے کا ہوش نہیں تھا۔ ناخن چبانے سے فرصت تو کچھ دیکھتا سمجھتا۔

آنکھوں کے آگے منظر ٹھہر گیا تھا۔ زورا فیض ...... اس کی کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ فیض کی نگا کے والہانہ پن نے بتا دیا تھا وہ کس ارادے تھا۔ ساتھ ہی زورا کی خشونت اور قطعیت دیا۔ وہ ایسوں کو جوتی کی نوک پر رکھتی ہے۔ پہچان نکالنے ڈاک خانہ ملانے ...... شودا۔

ساتھ ہی سی نکل گئی۔ بے خیالی میں ناخن کے ...ہ گوشت بھی نوچ گیا تھا۔ فیض کو دیکھ کر وہ چونکا ...ا اس نے با آسانی اخذ کر لیا کہ وہ کسی کڑی کے ...یں ادھر آیا ہے۔ مگر وہ کڑی زورا ہو گی۔ یہ تو اس ...مان و گمان میں بھی نہ تھا۔ اس کا دل چاہا وہ ...اگ کر جائے فیض کا گریبان پکڑے اور اسے ایسے ...ے دور پھینک دے کہ وہ مٹی چاٹنے پر مجبور ہو ...ئے۔ اس کے پاس آرے سے چیرنے یا سر میں ...ٹھونک دینے کا خیال بھی تھا۔ وہ تصور کی آنکھ ...نظر کشی کر رہا تھا۔ جب وہ اس کے سر میں کیل ...گے گا تو وہ کیسے تڑپے گا۔ تب اسے کیسی راحت ...ب ہو گی۔ اور زورا کتنی خوش ہو گی۔

''اور زورا ......'' عاشق کا دل کھل اٹھا۔ وہ گھر ...ی پکا تھا۔ دل و دماغ پر چھائی بے بسی آمیز غصے کی ...یت کی جگہ خوشی بھر گئی تھی۔ اس پر اچانک ایک ...اف ہوا تھا۔ زورا نے فیض کو کیسے منہ توڑ جواب ...ا فاذرا غیرت مند ہو گا تو دوبارہ نام نہیں لے گا۔ ...ن فن کرتی سہیلی کا ہاتھ دبوچ کر گئی تھی ...... جب اس روز عاشق حسین نے اس کا راستہ ...کا تھا۔ تب زورا اس پر غصہ نہیں ہوئی تھی۔ یا شاید ...ما گئی تھی۔ یا پھر یہ ...... کہ اس کے دل میں عاشق ...لیے جگہ تھی۔ یا پھر ...... اس کی خوش فہمی کٹی پتنگ ...ی تھی۔ جو جتنا بھی اونچا اڑے گرتی جھاڑی ہی ...ہے۔ مگر وہ خوش تھا۔

☆☆☆

فیض کے دل میں خیال تھا۔ زورا آج سینٹر ...ں آئے گی۔ یا پھر اگر آئی تو ساتھ میں باپ بھائی ...پسند تا ٹانک کر آئے گی۔ عام طور پر شریف ...اں گھبرا کر ایسا ہی کرتی تھیں۔ مگر زورا حسب ...ل اکیلی آ رہی تھی۔ سہیلی کے ساتھ ...... تو کیا وہ ...نہیں تھی یا پھر بہت جی دار تھی۔ ہاں دوسری ...صد فی صد درست تھی۔ زہرہ جی دار تھی گلی میں ...ہوتے ہی اس نے فیض کو دیکھ لیا تھا۔ جو موٹر ...ک پر کھڑا تھا۔ ٹانگیں دونوں جانب پھیلی ہوئی

تھیں۔ ایک بازو بغل میں دیے دوسرے ہاتھ کی انگشت شہادت ہونٹوں پر کھڑی کیے آج اس کے انداز میں اعتماد اور ڈھٹائی کا عکس نمایاں تھا زہرہ کی زہر آگیں نظروں کے جواب میں وہ ایسے مسکرایا۔ جیسے محبت کے سلام کا جواب دے رہا ہو۔ واپسی پر بھی اس کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ دونوں سہیلیوں نے حسب عادت چھابی (چھابڑی) والے سے کچی انبیاں خریدیں۔ اور روانہ ہوئیں۔

ایک دن ...... دو دن اور پتا نہیں کتنے بہت سارے دن ...... فیض کے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ اسے اپنی مردانہ وجاہت پر کلیے کی طرح یقین تھا۔ یہ لڑکیوں کے دل پر برق گراتی تھی۔ وہ اس کی ایک مسکراہٹ پر گری پڑتی تھیں۔

اور ادھر ...... زہرہ جس کے لیے وہ خود کو سنوار کر آتا تھا۔ وہ اس کے پاس سے یوں گزر جاتی جیسے کھمبا کھڑا ہو۔ وہ سڑک کے دائیں جانب کھڑا ہوتا تھا۔ وہ بائیں طرف سے گزرتی تھی وہ بائیں جانب کھڑا ہونے لگا۔ پر آگے بھی زہرہ تھی۔ اس نے راستہ نہیں بدلا وہ اس کے اتنے نزدیک سے گزرتی کہ اس کے ملبوس کی مہک اس کی مشام جان کو معطر کر جاتی لیکن فیض کی بے چین فطرت اتنے پر راضی نہ تھی۔ وہ عاشق حسین جیسا عاشق نہیں تھا ...... جو نجانے کتنے سالوں سے بس دید ہی سے عشق کی پیاس بجھاتا تھا۔ دید ہی کو معراج سمجھتا آیا تھا۔

''اتنی کٹھور لگتی نہیں ہو۔'' زور اکے اس کی بس ہو گئی۔ اس نے بائیک اس کے راستے میں حائل کر دی۔ وہ محبت پاش نگاہوں سے اس کی نقاب سے جھانکتی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ زہرہ نے سہیلی کو دیکھا جیسے اس کی رائے ملانا چاہتی ہو۔

''تم بھی اتنے ڈھیٹ لگتے نہیں تھے۔ کیا کتے کے برتن میں پانی پیتے رہے ہو۔'' فیض کی مسکراہٹ ایسے سمٹی جیسے ریشمی رومال کو آگ پر رکھو تو وہ سکڑ جاتا ہے۔ ''یہ بات کسی اور نے کہی ہوتی ناں تو ......'' وہ بہت دیر بعد بول سکا تھا۔ ''کوئی اور کیسے کہہ سکتا تھا۔

تمہارا بالا اس بار کس سے پڑا ہے فیض کمہار......" وہ مسکرائی تھی اس کی نیلی آنکھوں سے روشنیاں پھوٹ پڑی تھیں۔ فیض کے اندر اترتا طیش کا ابال بیٹھ گیا جیسے ٹانگیں کٹ جائیں تو کوئی بیٹھ ہی جاتا ہے۔ اسے اپنے اندر اترتی بے بسی بہت اچھی لگی۔

"تم پہ سات خون معاف ہیں۔ قسم سے......"

اس نے ہونٹ ایسے سکوڑے جیسے ہوائی بوسہ دیا ہو۔ زہرہ زخمی شیرنی کی طرح اس پر پل پڑنے کے ارادے سے بڑھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا اسکیل فیض کے سینے پر کھبو دیا۔

"لیکن میں معاف کرنے والی نہیں۔"

"میں سزا کے لیے تیار ہوں۔" اس نے اپنے سینے پر لگے اسکیل کو مٹھی میں بند کر لیا۔ لڑکے راستہ روک ہی لیا کرتے تھے۔ گنگنانا...... ہو کے بھرنا...... آوازیں لگانا...... مگر یہ اس طرح سے۔

"جس دن سے تمہیں دیکھا ہے ناں......" وہ حال دل سنانا چاہتا تھا۔ زہرہ کا دباؤ اسکیل پر کم ہو گیا۔ جس چیز کو محسوس کر کے وہ مسکرایا۔ "سفید رنگ تم پر بہت جچ رہا تھا۔"

اوہ...... سفید و زرد لباس اس نے ایک ہی بار زیب تن کیا تھا۔ روبینہ کی مہندی میں اس نے یکدم اسکیل پر اپنا دباؤ بڑھا دیا۔ جیسے وہ اسے خنجر سمجھ کر سینے میں اتار دینا چاہتی ہو وہ اندر تو نہیں اترا۔ البتہ فیض کا اوپری دھڑ بلا ارادہ پیچھے کو ہو گیا۔

زہرہ کا نقاب اتر گیا۔ اس کی ستواں ناک اور پنکھڑی سے ہونٹ سب فیض کی نگاہوں کو خیرہ کر گئے۔ جب وہ دیکھ ہی چکا تھا تو اب وہ کیا کر سکتی ہے۔

"میں زبان کھینچ کر ہاتھ میں رکھ دیتی ہوں وہ جارحانہ انداز سے آگے ہوئی۔

"میں کاٹ کر قدموں میں رکھ دوں؟" اس نے واقعی کتے کے برتن میں پانی پیا تھا۔ زہرہ نے اسکیل کو اس جھٹکے سے دباؤ بڑھا کر چھوڑا کہ فیض لڑکھڑا سا گیا۔ وہ زمین پر تھوکتی آگے کو بڑھی۔ وہ اسکیل کو ہونٹوں سے جوڑے تب تک وہاں کھڑا رہا جب تک وہ نظر آتی رہی۔

☆☆☆

فیض کی ماں نبیلہ سفید چکن کے تھری پیس ڈھیروں سونا لادے، بڑی معزز و مہذب دے رہی تھی۔ وہ بار بار چور نظروں سے مجازی بھی دیکھ لیتی۔ جو اس کی نسبت بہت با اعتماد آسانی کرتے شلوار پر اس نے سفید کلف لگا باندھ رکھا تھا۔

اس نے شمیم اور سیف اللہ کو دیکھا اور بلا مسکرانے کی کوشش کی۔ سوال تو ڈال دیا تھا۔ جواب ملنے کی تو ریت ہے نہیں...... ہاں بھی کرنی تو کڑی والے سوچنے کا ٹیم لیتے ہیں۔ اس بدلا۔ شریف کمہار چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ لگے چائے کے کپ مہلت بن گئے سب اپنی سوچ میں گم تھے۔ نگاہ ملتی تو ایویں مسکرا دیتے۔

نبیلہ سیدھی سادی عورت تھی۔ مگر اس نے محسوس کر لیا تھا۔ شمیم اور سیف اللہ متفکر تھے اور دلی جذبات کو روکے ہوئے تھے۔ فیض نے اس کے آگے زہرہ کا نام لیا۔ تو وہ کتنی دیر ایک نہ بول سکی۔

"وہ ہمیں کہاں دیں گے فیض......"

کیوں؟" اس نے بھویں اچکائیں۔ "ہم کمی ہے؟"

"بات کمی کی نہیں ہے پتر...... لیکن لوگ ذات برادری سے باہر نہیں نکلتے۔"

"اوہ ماں...... وہ پرانے زمانے کی ہیں۔ عبداللہ بھی تو دوسری ذات کی لایا

"ہاں یہ تو تو نے ٹھیک کہا مگر......"

"اوئے مگر اگر کیا...... میرے پتر نے لیا ہے تو اب ہمیں جانا ہے تو تیاری کر۔" کمہار نے اعلان کر دیا۔

"سوچ لو فیض کے ابا...... وہ مان جائیں

"او مجھے منانا آتا ہے۔" شریف کمہار پُراعتماد تھا۔

"ہو سکتا ہے۔ منڈے کڑی کا آپس میں کوئی معاملہ ہو۔" اس نے بیٹے کے لبوں سے چپکی مسکراہٹ سے نتیجہ اخذ کیا اور مطمئن ہو گئی۔ ہاں یقیناً ایسی ہی بات ہو لی۔ مگر اب یہاں بیٹھ کر وہ نئے سرے سے سوچنے لگی۔ ہو سکتا ہے لڑکی تو راضی ہو مگر اس کے گھر والے...... یہ تو پھر پھوآڑا (فتنہ، وبال) پے جائے گا۔

چائے کے کپ تھے۔ ڈر بے تو نہیں کہ گھنٹوں جا کر ختم ہوتی۔ خاموشی بار لگنے لگی۔

"پھر اجازت بھائی سیف اللہ......"

شریف کمہار بولا۔

"کوئی جلدی نہیں ہے۔ آپ آپس میں صلاح مشورہ کرو ہم پھر حاضر ہو جائیں گے۔" نبیلہ بھی دوپٹہ درست کرنے لگی۔ سیف اللہ اور شمیم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"نہیں...... جواب ابھی ہی دینا ہوگا۔" ان کی نگاہیں شمیم پر مرکوز تھیں۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ورنہ ہو گا یہ کہ نبیلہ اور آپ نے گھر جاتے جاتے رستے میں ملنے والے ہر گھوڑے تک کو بتانا ہے۔ پتر کا رشتہ ڈالنے گئے اور ایویں لوگوں کے منہ کو چسکے لگانے کا موقع دیا۔" شمیم کا جواب سیف اللہ کی سمجھ میں آ گیا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے دونوں میاں بیوی کو بیٹھے رکھنے کا کہا اور گلا کھنکھار کر گویا ہوئے۔

"آپ کی تشریف آوری کا بڑا شکریہ بھائی شریف اور باجی آپ کا بھی......" انہوں نے مؤدب نگاہ سے دیکھا۔ نبیلہ کا دل بڑا ہوا۔ "اور جہاں تک صلاح کی بات ہے۔ اس کی ضرورت ہی نہیں...... وہ ناپ تول کر بول رہے تھے۔" نبیلہ اور شریف کے دل ملنے لگے۔ اتنی جلدی۔

"ہونا ہو، زہرہ کا فیض سے ٹانکا تھا اور مائیں دلی رازدار ہوتی ہیں۔" نبیلہ سوچ رہی تھی۔ مگر سیف اللہ کے اگلے جملے نے دونوں کے خیالات پر پانی پھیر دی۔

"زہرہ کا تو میں نے شروع دن سے سوچ رکھا ہے۔ وہیں کروں گا۔ میرا بھتیجا فخر علی......" سیف اللہ کے لہجے میں بھی فخر گھل گیا۔ مہمان بکے بکے رہ گئے۔

"فخر...... کون فخر...... اچھا وہ فخر...... غریبڑا سا منڈا (غریب لڑکا) جس کے پاس کوئی دھن دولت نہیں ہے۔ جو تائے سیف اللہ کے ٹکڑوں پر پلا بڑھا ہے۔ ہاں سنا ہے پڑھنے لکھنے میں تیز ہے مگر......"

"آپ تو خود سمجھ دار ہیں بھائی شریف...... سگے بھتیجے کے ہوتے ہوئے میں کیسے......" وہ اور بھی کچھ بولتے جا رہے تھے۔ نبیلہ اور شریف کے پاس کہنے کو کچھ نہ رہا۔

تو یہ پسندیدگی یک طرفہ تھی۔ دونوں کے قیافے کا گھڑا پھوٹ گیا۔ یہ تو سیدھا سیدھا جواب تھا۔ مزید کی گنجائش نہیں تھی۔ سیف اللہ مہمانوں کو دروازے تک رخصت کرنے گئے۔ البتہ شمیم وہیں کی وہیں کھڑی تھی۔ سیف اللہ کے جواب نے اس کے سر پر تلوار مار دی تھی گویا...... زہرہ کا رشتہ فخر سے...... اب بھی۔

☆☆☆

دوستوں سے وہ زیادہ دیر تک حال دل چھپا نہیں سکا تھا۔ اسے بتانا پڑا کہ اس نے زورا کو من رکھا تھا...... پھر یہ کہ اس نے زورا کو دیکھ بھی لیا۔

"تو......؟" دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"تو یہ کہ وہی تمہاری بھابھی ہوگی۔"

"اچھا......" صدیق طنزیہ ہنسی ہنسا۔

"اور وہ جو باغ میں چاچے کے پتر سے ملاقاتیں کرتی ہے وہ......" مدثر نے بھی سر مارا۔

"وہ...... فیض نے کھینچ کر......" میں معاف کر دوں گا۔" اس نے فیاضی کی انتہا کو چھو لیا تھا۔

"اوئے ہوئے! معاف کرنے والے کو تو دیکھو۔ جیسے وہ معافی مانگے گی۔ بڑی اتھری ہے۔"

فیض خاموش رہا۔ اس نے دوستوں کو نہیں بتایا کہ وہ اتھرے پن کا مظاہرہ نا صرف دیکھ چکا ہے۔ بلکہ اپنی جان پر سہہ چکا ہے۔ اس کے سینے پر دو دن تک اسکیل کے دباؤ کی سرخی موجود رہی تھی۔

"تو میرا خیال ہے فخر کو بھول گیا ہے۔ دیو داس

کی فلم نہیں چلے گی شہزادے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دے دے گا۔

''ہاہاہا......'' صدیق کی مثال پر مدثر لوٹ پوٹ ہو گیا۔

''فخر......'' فیض نے ہنسی تھمنے کا انتظار کیا۔

''کون فخر......'' وہ مسکرایا۔ ''بھول گئے کرم اللہ کو......وہ دے گا کیا اپنی بہن کا ہاتھ اسے......''

''اوہ...... ہو......'' دونوں دوستوں کے منہ کھلے اور بند ہو گئے او ہاں یہ تو سوچا ہی نہیں۔

''ٹھیک کہہ رہا تھا فیض......'' میدان صاف تھا۔ وہ بھی مطمئن ہو گئے۔ مگر یہ جو سیف اللہ نے انکار کیا......اور جو انکار کی وجہ بتائی وہ......شریف کمہار نے اسے زہرہ سے اچھی دس لاکر کھڑی کر دینے کا دعویٰ کر کے لعنت بھیج دینے کا کہا تھا۔ اسے قطعاً کوئی شکایت یا ناراضی نہیں ہوئی تھی سیف اللہ سے۔ اس کی جگہ وہ بھی ہوتا تو سگے بھتیجے پر کسی کو فوقیت نہ دیتا۔ لیکن فیض کیا کرتا۔ اس کو زہرہ سے اچھی نہیں......زہرہ ہی چاہیے تھی۔ اس نے اس معاملے پر ساری ساری رات جاگ کر سوچا۔ سوتے جاگتے کھاتے نہاتے......مگر یہ تفریق کا ایسا سوال تھا۔ جسے جس طرح بھی دل کرو جواب صفر ہی آتا ہے۔ وہ کیا کرے زہرہ کو اٹھا کر لے آئے۔ مگر دل کے بغیر عورت بھلا کس کام کی۔

لیکن وہ اسے خود سے محبت کرنے پر مجبور تو کر سکتا ہے ناں......کہ وہ اسے چاہتا ہے وہ بھی اسے چاہے۔ لیکن کڑوا نوالہ اگر چبا بھی لیا جائے تو بھی تھوک دیا جاتا ہے۔ محبت بھی بھی کروائی جاتی ہے۔ محبت سبق نہیں ہوتی کہ رٹے لگوا دیے جائیں۔ اور محبت......سوچتے سوچتے وہ بری طرح چونکا۔ جیسے بے خیالی میں دیا سلائی کو چھو لیا جائے۔ کون سی محبت......اسے زورا سے محبت تو نہیں ہوئی تھی۔ ہاں دلچسپی ہوئی تھی۔ اور پھر ضد ہو گئی تھی۔ یہ خیال آتے ہی اسے زہرہ کی نیلی آنکھوں کی نفرت آمیز سرخی یاد آ گئی۔ اس کا وہ ہتک آمیز انداز......جو اس نے حسن کی ادا کہہ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ اور اس جملے......اس نے اسے کتے سے مشابہ قرار دیا تھا

''ٹھیک ہے زہرہ سیف اللہ......میرا تو تم ہونا نہیں تھا۔ مگر پھر میں تمہیں فخر کا بھی ہونے دوں گا۔''

''مگر کیوں؟'' اس کے اندر سے منمناتی نکلی۔ ''ایویں۔'' اس نے باآواز بلند خود کلامی کی

''مزہ آئے گا......'' ہنس دیا۔

اسے پتا تھا اس نے کہاں سے سیندھ ہے۔ یہ تو مسئلہ ہی کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

اس پر آج کل خودستائی کا دورہ چڑھا ہوا وہ میں کے بارے میں اتنا بولتا تھا کہ اس کے کان ہو جاتے تھے۔ اور صرف ہلتے لب دکھائی تھے۔ میں یہ......میں وہ......میں، میں، میں باتیں بھی کیسی......جن پر کوئی ذی ہوش کم از کم کی طرف ایک نظر دیکھ لینے کے بعد بھی یقین کرے۔ جیسے جب میں چاند پر گیا تھا......یا میں نے ستاروں پر کمند ڈالی یا شیروں کی کچھار گھس کر سب کو اک نگاہ ڈال کر مسمرائز کر دیا۔

یا پھر وہ اپنی وہ تعریفیں بتاتا جو نجانے کس موقع پر لوگوں نے کیں۔ کبھی اپنے زندگی گزار کے اصول بتاتا......وہ یہ سمجھتا ہے کہ......کہ، کہ

اس کی قرب و جوار میں رہنے والے کے بارے میں ایک رائے تھی۔ خاص طور پر ع کے بارے میں......وہ بنیادی طور پر عورت خراب چیز سمجھتا تھا۔ فتنہ......فساد، اور یہ کہ عو کیسے رکھنا چاہیے۔ یہ کام ہر ایک کو نہیں آتا۔ کہتے ہوئے وہ سینہ چوڑا کر کے اسے ایک جتا سے دیکھ کر مسکرا دیتا۔

''جب میں بات کرتا ہوں تو سب کہ اس نے جو کہنا ہے وہ ہی سب سے صحیح ہو ایسے کیا دیکھتی ہے۔ تجھے میری باتوں کا آتا کیا؟'' ایک روز اسے بولتے بولتے جھ

''تو میری کہی بات کی تائید نہیں کرتی۔ میں کیا پاگل ہوں جو بول بول کر تھکتا ہوں۔ کتا ہوں جو بھونکتا ہوں۔'' اس نے اس کا بازو دبوچ لیا۔

''میں کیا بولوں؟'' وہ اچانک حملے سے بری طرح گھبرا گئی تھی۔

''تو مجھے ہلکا لیتی ہے ناں......تو سمجھتی ہے میں جھوٹ بولتا ہوں۔'' وہ پر یقین تھا۔ اس کی نظریں بدل گئیں۔ ''اگر اسے پتا لگ جاتا کہ وہ تو اسے کبھی سچی ہی نہیں تو......'' اور بیویاں اپنے مجازی خدا کی ہاں میں ہاں ملاتی ہیں اور تو......'' اس نے گردن ایسے اٹھائی جیسے کبھی فرعون نے اٹھائی ہو گی۔

''اپنے میاں سے ہنستی بولتی ہیں۔ ان کا دل لگانے کو طرح طرح کی باتیں کرتی ہیں اور تو......''

''کیا بات کروں؟'' اس کا بازو ایسے کسا جا رہا تھا جیسے پیچ کس گھمانے سے نٹ کستا جاتا ہے۔

''تو تو ایسے مسوم (معصوم) بن رہی ہے۔ جیسے کچھ جانتی نہیں......سب جانتا ہوں میں تیرے بارے میں تجھ سے بھی زیادہ......سمجھی۔'' اس نے بازو کو موڑ دیا تھا اور پسلی کے پاس نرم گوشت چٹکی کاٹ لی تھی۔

''سی......ی ی ی......آں......''

''آواز نہ نکالنا۔'' اب آواز پر تو وہ قابو پا سکتی تھی۔ آنسوؤں کا کیا کرتی۔ اس کی آنکھوں کو بھرتا دیکھ اس نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ دور جا کر بیٹھ گیا۔ اب وہ ہاتھ سر پر مار رہا تھا۔ وہ حسب عادت پچھتا رہا تھا۔ اس نے اس کے سامنے قسم کھائی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں آنے دے گا۔ پھر بھی کر گیا غلطی۔

وہ تیزی سے اٹھا اور اس کے قدموں میں بیٹھ کر پیروں پر ہاتھ رکھ دیے۔ گھگھیانے لگا۔ ہاتھ جوڑے اس کی آنکھوں میں معافی کی استدعا تھی کہ خون معاف کر دیے جائیں وہ انداز سے اس جگہ کو مسلنے لگا تھا جہاں چٹکی کاٹی تھی۔

''مجھے غصہ نہ دلایا کرناں......'' وہ پچکارنے لگا پیار کرنے لگا اور معافی مانگنے کی یہ آخری کوشش زخم پر نمک پاشی جیسی ہوتی تھی۔ اس سے اچھا تو وہ اسے ڈنڈوں سے کوٹ ڈالتا۔

☆☆☆

''بچہ......کس کا بچہ......'' حیرت نے اس کے نقوش کو بگاڑ دیا تھا۔ اس نے باری باری ماں اور بیوی کو دیکھا۔ ماں جو خوشی سے بے قابو ہوئے جاتی تھی۔ اور بیوی......اسے لگا اس نے منہ پر آٹا مل رکھا ہو......اتنا سفید چہرہ......؟ جیسے، جیسے مردہ خانے میں رکھی لاش جیسے......اس کی ماں......ہولے ہولے تالی پیٹتے ہوئے کوئی گیت گا رہی تھی۔ اس کی حیرت پر خشونت غالب آ گئی۔ پھر اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔

''مجھے نہیں چاہیے بچہ......بچے کا کیا کرنا ہے میں نے......ہے ناں......ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے کافی ہیں......ہے ناں......'' اس نے اسکول میں پڑھنے والے لڑکوں کی طرح اچانک اس کے شانے پر بازو پھیلا دیا۔ اور اس کے سر کو اثبات میں ہلانے لگا۔

''ہے ناں......'' وہ تو کچھ بھی نہیں بولی تھی۔ مگر جس طرح ہلائی جا رہی تھی۔ صاف لگتا تھا۔ ہم خیال ہے۔

''توبہ استغفار......ہائے میرے اللہ......''

ساس کے تالی پیٹنے والے ہاتھ توبہ کے لیے آسمان کی طرف اٹھ گئے۔ وہ اللہ کے عذاب سے ڈر گئی تھی۔ پھر وہ چیل کی طرح اٹھی۔ بہو کو اس کے شکنجے سے جھپٹ کر اپنے پیچھے کرتے ہوئے اسے ایسا دھکا دیا۔ کہ وہ بمشکل گرنے سے بچا۔

''ماں......'' تحیر سے پکارا۔

''خبردار جو مجھے ماں کہا۔ نکل جا یہاں سے......'' ماں نے پاس پڑی لکڑی بھی کھینچ ماری اور بہو کو اپنے جلو میں لیے اندر چلی۔

☆☆☆

سیف اللہ کے کمرے میں داخل ہوتی زہرہ کا پاؤں ہوا میں معلق ہی رہ گیا۔ موضوع گفتگو وہ تھی۔ اس نے چوکھٹ تھام کر اپنے حواس قائم رکھنا چاہے۔ آوازیں باہر تک آ رہی تھیں مگر اس نے پھر بھی محتاط انداز سے پردے کو ذرا سا سرکایا۔

سامنے نخوت زدہ چہرہ لیے آپاں جی تھیں۔

بہت پریشان دکھائی دیتی شمیم ......اور کرسی پر بیٹھے سیف اللہ......انہوں نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے اور ٹھوڑی گریبان میں ڈال دی تھی۔

”کیا ہوا زہرہ......ایسے کیوں کھڑی ہو۔“ اس کی پشت پر ناہید کی اچنبھا بھری آواز ابھری۔ وہ بدک کر مڑی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”وہ اندر......میرا......“ اس نے شہادت کی انگلی سے اشارہ دیا۔

ناہید نے سانس بھری۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پیچھے لے کر چلی۔ وہ بار بار مڑ کر کمرے کی سمت دیکھ رہی تھی۔ ”بیٹھو......“ ناہید نے اسے شانوں سے تھام کر بٹھایا اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ ”جس گھر میں بیری ہو وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں۔“

”پتھر آتے ہیں بھابھی......مجھے تو لگتا ہے مجھ پر منجنیق سے حملہ کر دیا گیا ہے۔“ وہ اس سے بڑھ کر اور کیا مثال دے سکتی تھی۔

”تو تمہیں پتا لگ گیا۔ عاشق حسین تو پاگل ہے۔ اسے کون دے گا اپنی بیٹی......“ تھوڑی دیر پہلے ناہید بھی ساس سسر کے ساتھ شریک گفتگو تھی۔ جس وقت وہ سالن لگ جانے کے خیال سے باورچی خانے کی سمت بھاگی۔ موضوع عاشق حسین تھا۔ عاشق حسین نے کچھ دنوں سے نیا چلن اختیار کر لیا تھا۔ اس نے اپنے گھر کی مسجد میں نماز پڑھنے کے بجائے اتنی دور اس محلے کی مسجد میں آنا شروع کر دیا تھا۔ جہاں سیف اللہ پانچ ٹائم جاتے تھے۔ آپاں جی کا قیاس......جس پر وہ پتھر پر لکیر کی طرح قائم تھیں۔ سیف اللہ کو درست لگنے لگا۔ وہ جیسے ان کے انتظار میں کھڑا رہتا تھا کہ انہیں سلام کر سکے، سیف اللہ نے اسے ایک دن ایک نمازی سے جھگڑتے دیکھا کہ وہ سیف اللہ کے ساتھ کیوں کھڑا ہے۔ وہ تو اس کی جگہ ہے۔ وہ سر جھکا کر اتنا مؤدب ہوتا تھا کہ انہیں وحشت ہوتی تھی۔ اور آج فجر میں تو اس نے حد کر دی......بلکہ نہیں حد ٹاپنے سے پہلے

سیف اللہ نے اس کا منہ بند کر دیا۔ وہ مسجد سے تو وہ ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ نگاہ ملتی تو مسکرا پھر ناخن کترنے لگتا۔ سیف اللہ کی آنکھوں ناگواری چھلکی تو فوراً ہاتھ کو پیچھے کر لیا۔ بلاوجہ ہنس دیا۔ پھر مؤدب بن گیا۔

”اچھا عاشق حسین......اپنی ماں کو سلام میرا......“ راستہ دوشاخہ ہو گیا تھا۔ دائیں جانب ا کا گھر اور بائیں جانب اس کا۔

”جی......“ وہ چونکا۔ ”جی جی......کہہ دو گا۔“ وہ خوش ہو گیا۔ لیکن آگے بڑھنے کے بجا پھر بھی وہیں کھڑا تھا۔ سیف اللہ کی کنپٹی سلگنے لگی۔

”جاتا کیوں نہیں......“ احمق انہیں خود ہی قد بڑھانے پڑے۔ پھر ابھی وہ چار قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ اس نے پکار لیا۔

”ماموں سیف اللہ......“

”ہاں!“ وہ چونک کر پلٹے۔ ”وہ امی......اس دن آپ کے گھر آئی تھیں۔“ وہ ان کے نزدیک آیا۔ سیف اللہ بری طرح چونکے۔ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ ان کی آنکھیں سکڑیں۔

”میری شادی کی بات کرنے......رشتہ کروا کی بات......“ وہ بلاوجہ ہنسا۔ سیف اللہ کے کا کھڑے ہو گئے۔ ماں سے مایوس ہو کر وہ خود ان سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی اتنی جرأت......کو سوجھ بوجھ والا بندہ اس طرح سے راہ نہیں روکتا۔

”تمہیں حمیدہ بہن نے بھیجا ہے منڈے۔“

”نہیں......“ وہ جیسے جھینپا تھا۔

”خیر......میری بات ہو گئی تھی۔ ملوں گا عنقریب......ہو جائے گا ان شاء اللہ۔“

”نہیں ماموں جی......“ وہ بات ختم کر آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ وہ مقابل آ گیا۔ ”انہو نے پوری بات کی نہیں......اصل بات......در“ سیف اللہ کے بدن سے تپش نکلنے لگی۔

”ایک منٹ......“ انہوں نے اس کے شا پر ہاتھ رکھا اور نگاہیں اس کے چہرے پر جما دیں۔

”اصل یا نقل......میں نے کہا ناں میں حمیدہ مل لوں گا۔ تم اب جاؤ۔“ ان کی آنکھوں سے اور لہجے سے قطعیت ٹپک رہی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو اللہ کی کیفیت بھانپ جاتا۔ مگر وہ عاشق حسین بلاوجہ مسکرانے لگا۔ لیکن ابھی اسے کچھ اور بھی کہنا مگر اس کا منہ کھلنے سے پہلے سیف اللہ نے ہاتھ یا۔ وہ اسے جانے کا اشارہ کر رہے تھے۔

”جی جی اچھا......“ وہ کچھ دیر تو رک کر کچھ تا رہا۔ پھر چہرے پر تابعداری سج گئی۔ یکدم مڑا اور چل دیا۔ موڑ مڑنے سے پہلے پلٹ کر انہیں مسکرایا اور ہاتھ بھی ہلا دیا۔

شمیم ششدر رہ گئی اور آپا جی اپنی نشست سے چھل اچھل جاتی تھیں۔

”میں نہ کہتی تھی سیف اللہ......“ انہوں نے پر ہاتھ مارا۔

”دیکھنے میں ہاتھ پیر والا ہے، بڑے ہاتھ ے پیر......اور بڑا سر......مگر اندر سے خالی ہے پڑ......(کھوپڑی) بھلا ایسے بھی کوئی۔“ ناہید سوچا زہرہ نے اندر چھڑے عاشق والے قصے کو لیا ہے۔ جب ہی ایسی حواس باختہ ہو گئی ہے۔ زہرہ نے تھوک نگلا۔ عاشق کا کیا ذکر......وہ تو س کی جرأت پر حیران تھی۔

”عاشق حسین......اس نے کیا کیا ہے؟“

”اوہ......“ ناہید نے زبان دانتوں تلے دبائی۔

لیں بھابھی......“ اس نے اس کا ہاتھ جھنجھوڑا۔ ”اس س کی بیٹی مانگ لی؟“ اس کے انداز میں عجلت حیرت اور پریشانی عود کر آئی۔ ناہید نے نظریں یں۔ زہرہ ہولے ہولے سے ناہید کا ہاتھ ہلا رہی یکدم ساکت ہو گئی۔ اس پر قیامت خیز انکشاف اسے بادلوں بھری وہ سیاہ شام یاد آ گئی۔ جب بھاء ......عاشق نے اس کا راستہ روکا تھا۔

”ہاہ......“ اس نے دونوں ہاتھ کھلے منہ پر جما اس کی نیلی آنکھیں خوف و حیرت سے پھیل تھیں۔

”بھاء عاشق......“ اس نے زبان دانتوں تلے داب لی۔ اسے اب ناہید کے اثبات کی ضرورت نہیں تھی۔ اس پر جواب کشف بن کر اتر گیا تھا۔ ”تمہیں تو کسی نے بھی نہیں بتانا تھا۔ میں سمجھی تم سن کر آ گئی ہو۔ اسی لیے میں نے بھی بات کر لی۔“ وہ پچھتا رہی تھی۔

”اگر تم نے عاشق والا ذکر نہیں سنا تو پھر تم کیا سن کر اتنی پریشان ہوئیں زہرہ......“ ناہید نے الجھ کر دریافت کیا۔

”میں......“ اس نے کھوئے انداز سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ”میں تو وہ......“ فیض کے رشتے کا سن کر......اس جملہ قصداً ادھورا چھوڑ دیا۔

”اوہ......چھوڑو تم......“ ناہید نے اپنا لہجہ بے پرواہ کر لیا۔ ”رشتے تو آتے رہتے ہیں۔ ہم نے کون سا کر لینا ہے۔ ہنہہ......یاد نہیں میری بہن کی شادی میں کتنے لوگوں نے تمہارا پوچھا تھا۔“

”وہ اور بات تھی بھابھی......سب کو کہہ دیا گیا تھا۔ اس کا طے ہے چاچے کے گھر۔“

”مگر اب تمہارا رشتہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے زہرہ......ابھی تمہارے بڑے زندہ ہیں۔ یہ تمہارے پریشان ہونے کی باتیں نہیں ہیں۔“

”نہیں بھابھی......“ اس کی آواز رندھ گئی۔ ”دو اتنے برے اور خراب گندے مردوں کو ساری دنیا چھوڑ کر ایک میں ہی نظر آئی۔“

”اچھی چیز تو سب کو نظر آ جاتی ہے۔“ ناہید نے اس کی بھیگتی پلکوں پر اپنی پوریں رکھ دیں۔

”میں تو کبھی منہ ڈھانپے بغیر گھر سے نہیں نکلی بھابھی......“ اوہ تو زہرہ سیف اللہ اپنے فتنہ پرور حسن سے واقف تھی۔

”حسین ہونا تو عذاب ہو گیا......اللہ کسی کو پیارا بنائے ہی ناں۔“ اس کی نظریں سنگھار میز کے آئینے سے جھلکتے اپنے سراپے سے الجھ گئیں۔ اس نے اللہ سے گلہ کیا تھا یا درخواست کی تھی۔ پتا نہیں۔

”پاگل ہو تم......عزتیں تو چیچک زدہ عورتوں کی

بھی لٹ جاتی ہیں۔ اندھی اور لولی لنگڑی کی بھی...... کس کی نیت کب اور کس پر خراب ہو جائے کیا پتا۔"
ناہید اس کی سادگی پر دکھی دل سے بولی۔

"اب کیا ہوگا بھابھی......" اس نے تکان زدہ لہجے میں پوچھا۔

"یہ جو فیض......"

"کون فیض......" ناہید نے بھڑک کر کہا۔

"اس کے ماں باپ کو تو ابا جی نے اسی وقت جواب دے دیا تھا۔"

"کیا جواب......؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

☆☆☆

"میں تو سمجھی آپ نے شریف کمہار کو منع کرنے کے لیے فوری طور پر بہانہ بنایا ہے۔" شمیم بھونچکی رہ گئی تھی شوہر کی بات سن کر...... سیف اللہ نے ایک خفا مگر قطعی تاثر دیتی بیوی پر ڈالی۔

"ایسی باتیں یونہی بہانہ بنانے کے لیے نہیں کی جاتیں۔ آپ سمجھائیں اپنی بہن کو آپاں جی......"

"کیا اب یہ ممکن ہے۔" آپاں جی نے تسبیح رکھ دی۔ تو وہ بھی بہن کی طرح ہی سوچ رہی تھیں۔

"کیوں......؟" سیف اللہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اب کیا ہوگیا؟" وہ واقعی اتنے انجان تھے یا بڑھتی عمر نے یادداشت پر کچھ بداثرات چھوڑ دیے تھے۔

"کرم......" شمیم آپاں جی کو دیکھتے ہوئے زیرلب بولی تھی۔ سیف اللہ کی تیوری چڑھ گئی۔

"کیا کرم......؟ بولو چپ کیوں کر گئیں زہرہ کی ماں......" ان کا انداز جارحانہ تھا۔

☆☆☆

بہت سوچ سمجھ کر زہرہ نے فخر کو فون ملایا۔

اس کے اپنے پاس فون نہیں تھا۔ ابا جی کے فون سے چوری نے اسے اپنی نظروں میں گرا دیا مگر اب اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ دو منٹ سے کم وقت کی کال میں وہ اسے بس تم آجاؤ ایک دن کے لیے...... اچھا ایک گھنٹے کے لیے...... مجھ سے زیادہ اہم ہے پڑھائی نہیں فون پر نہیں بتا سکتی۔ پہلے منٹ میں عجلت بھرے جملے تھے۔ دوسرے منٹ میں وہ روتی رہی۔ پھر اس نے فون رکھ دیا۔ کال ڈیلیٹ کر دی۔

"وہ آکر کیا کرے گا؟" ناہید کی سمجھ میں نہیں آ رہا
ناہید کے سوال پر وہ بھی سوچ میں پڑ گئی۔
وہ کیا کرے گا۔ وہ اسے کیوں بلا رہی تھی۔ اس اپنا دل ٹٹولا۔ ہاں اس کے لاشعور میں تھا کہیں...... فخر کو سب کچھ بتائے گی کہ کیسے وہ سیل کا مال ہو تھی...... اور وہ اس کے سامنے رونا چاہتی تھی۔

اس سب میں اصل قصوروار کون تھا۔ فساد کی جڑ جی نے بوئی تھی۔ یا کرم کا وہ احساسِ ذلت...... نقصان جسے وہ معاف کرنے کو تیار نہ تھا۔ وہ سا رات جاگتی رہی۔ کتنا سیدھا سیدھا حساب تھا۔ کرم شادی فری سے ہو جاتی اور زہرہ کی فخر سے...... مگر ا نے یتیم بھتیجی کے ساتھ بھلا کرتے کرتے جا انجانے میں اس کی راہ میں کانٹے بو دیے تھے۔

☆☆☆

کرم شیطان کی آنت کی طرح سیدھی سڑک کنارے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈا جا رہا تھا۔ سیاہ تارکول سلک کا کپڑا لگ رہا تھا۔ سڑ کے دونوں اطراف بڑے بڑے درخت درختوں کے سرے اوپر جاکر ایک دوسرے جا ملے تھے۔ شاخیں آپس میں ایسے مدغم ہو چکی کہ پہچان مشکل تھی کون سی کس کی...... درخت دوسری طرف تا حد نگاہ کھیت تھے۔ ہریالی کی میں بارش کی مہک نے مل کر سماں باندھ دیا تھا۔

ہوا چلتی تو پتوں پر ٹھہری بوندیں پوچھا دیتیں۔ سنسان ذیلی تنگ سڑک سے کبھی کبھا سائیکل، بائیک یا پھر بھوسے کا ٹرک گزر جاتا کی خاموشی پر دھبا لگ جاتا۔ اور پھر وہ رہ جا درختوں پر بولنے والے پرندے اتنی خوب ص فضا پر عجیب سی پژمردگی چھائی تھی۔

یا اسے لگ رہی تھی۔ اس کا اندر اداس اسے باہر کی خوشی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ پا ایک ٹرک گزرا تھا۔ اس کی چنگھاڑتی آواز کے اندر طیش بھر دیا۔ اس نے ایک پتھر اٹھا کر پوری طاقت سے ٹرک کے پچھلے حصے پر اچھال دیا اور ایک غلیظ سی گالی دی۔ منہ سے تھوک نکلا جسے اس نے ہاتھ کی پشت سے رگڑ دیا تب ہی......

"السلام علیکم کرم بھائی......" بہت مؤدب محتاط لہجے میں اسے کسی نے پکارا تھا۔ وہ غصیلے پن سے مڑا۔ اسے اس وقت تنہا رہنا تھا۔ کس کی اتنی جرأت کہ مخل ہوا۔

"اوہ......تو......" اس کی نظریں خنجر ہو گئیں۔

"کیسے ہیں آپ...... اکیلے اکیلے......" آنے والا اس کے تیوروں سے بے نیاز حال احوال دریافت کر رہا تھا۔ کرم کی آنکھیں سکڑیں۔ ناک پھولی، جبڑے بھنچے۔ وہ دیکھا اسے رہا تھا۔ یاد زہرہ آ گئی۔

"الو کا پٹھا۔ اس کی اتنی مجال......" اس کا کھلا ہاتھ مٹھی میں بدل گیا اور مٹھی گھونسہ بن کر مقابل کے جبڑے پر جا لگی۔

"تیری اتنی جرأت کہ تُو نے میری بہن کے بارے میں سوچا...... ہیں...... ٹھاہ......" دوسرے گھونسے پر مقابل کے منہ سے خون کا فوارہ چھوٹ گیا۔ وہ تڑپ کر جھک گیا۔ کرم نے اپنا گھٹنا اوپر کو اٹھایا جو اس کے پیٹ سے جا لگا۔ ہاہ...... پھر اس نے اس کے بال دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اسے ایسے ہلانا شروع کیا۔ جسے دیگ کو ہلایا جاتا ہے۔

ساری دنیا سے قطع تعلقی کا اعلان۔ کسی کے بھی جینے مرنے سے کوئی فرق نہ پڑنے کا دعویٰ کرنے والے کرم سے بھی زہرہ کے لیے مقابل کی جرأت ناقابل برداشت تھی۔

زہرہ......" وہ اس کے ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرنے لگا جن سے اس نے چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔

"وجہ بھی تو بتاؤ۔ ایسے مجھے کیا سمجھ آئے گی یار......" وہ بے بسی سے بولا۔ زہرا رو رہی تھی۔

زہرہ کو کرنٹ لگا۔ اس کے ہاتھ گود میں گر گئے۔ "یار! بھاء عاشق نے نہیں اس عاشق نے

فخر کے لیے ہی لفظ استعمال کیا تھا ناں......"

کتنی کراہیت محسوس ہوئی تھی اسے...... تو دراصل خوب صورتی کہنے میں ہوتی ہے۔ کہنے والے میں۔

"اب ایسے کیوں دیکھ رہی ہو۔" وہ اس کی سرخ آنکھوں کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

اس کا سر نفی میں ہلا۔ اس نے ہونٹ کچلے۔ وہ متامل نظر آنے لگی۔

"کیا تم......" ادھورا جملہ کہہ کر اس نے سر جھٹکا۔

"کیا میں......؟" وہ مسکرایا۔ حقیقت یہ تھی کہ اسے زہرہ کے ایسے رونے سے اس طرح بلانے سے سخت تشویش لاحق ہوگئی تھی۔ زہرہ نے یکدم اس کے ہاتھ کی پشت کو چھوا۔

"کیا تم چاچی جی کو نہیں بھیج سکتے...... کہ وہ ابا جی سے میرا رشتہ مانگ لیں۔" فخر چونکا۔ اس نے زہرہ کو دیکھا پھر اس کے ہاتھ کو...... زہرہ نے تیزی سے ہاتھ اٹھا کر دوپٹے کے اندر کرلیا۔ وہ چہرہ موڑ کر آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

"میں بھیج تو دوں گا...... مگر...... کرم......" اس نے کیوں، کوتی الوقت نظرانداز کردیا۔

"تم کرم سے ڈرتے رہنا اور باقی دنیا زہرہ کو فالتو کا مال سمجھ کر سوال ڈالتی رہے گی۔" بالآخر اس نے کہہ دیا۔ فخر چونکا۔

"کس نے ڈال دیا سوال......" وہ ایسے چونکا جیسے جھولی میں بچھو آگرے۔ زہرہ کی پلکیں اٹھیں اور پھر جھکیں تو کتنے ہی آنسو ریشمی گالوں سے لڑھک کر نادیدہ ہوگئے۔

"زہرہ......" وہ بے چین ہو کر اس کے سامنے سے اٹھ کر اس کے برابر آبیٹھا تھا۔

ستو والے باغ کے پاس سے گزرتے ہوئے فیض کی بائیک کی رفتار غیر ارادی طور پر دھیمی ہوگئی۔ اس کے چہرے پر تنفر پھیل گیا۔ زہرہ اور فخر یہیں ملاقاتیں کرتے تھے۔ حسد و غضب کی لہر نے اس کے منہ کا ذائقہ بدل دیا۔ اس نے اس کڑواہٹ کو تھوک دیا اور آستین سے منہ پونچھتے ہوئے۔ بائیک کو ریس دینا چاہی۔ مگر تب ہی اس نے فخر کو دیکھا۔ جو بہ عجلت باغ کی دیوار کے ساتھ چل رہا تھا۔ پھر وہ باغ میں داخل ہوگیا۔

"یہ کب آیا......؟" سوال کے جواب سے پہلے اسے دوسرا قوی خیال سوجھا۔

"او...... ہونا ہو یہ ملاقات کا وقت ہے۔ اس کے دل میں کھلبلی ہونے لگی۔ ذرا دیکھے تو بڑی کڑک اور پارسا نظر آتی زورا...... ملاقات میں کیسی لگتی ہے؟" وہ بائیک ایک طرف کھڑی کرتا باغ کے اندر داخل ہوگیا۔

یہاں اونچے لمبے تنے والے آم کے درخت تھے۔ شاخیں زمین پر چھتری کی طرح یوں پھیلی تھیں کہ چلنے پھرنے کی جگہ کم رہ گئی تھی۔ وہ دبے قدموں شاخیں ہاتھ سے پرے کرتا آگے بڑھا اس کے تصور کی آنکھ ایک بے حیا منظر کو پیش کررہی تھی۔ جس کے ہونے کا اسے شک تھا۔ یقین تھا اور سب سے آخیر میں خواہش...... آنے والے لمحات کی سنسنی نے اس کی ہتھیلیوں پر خارش سی پیدا کردی۔ باغ کا گھنا پن کھل کھیلنے کے لیے نہایت سازگار تھا۔

تب ہی وہ دونوں دکھائی دے گئے۔ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ زہرہ کی آنکھوں میں مان، ملال، یقین، وہم اور محبت تھی۔ جبکہ فخر وہ نرم مگر باحیا نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ فیض کی توقع پر پانی پھر گیا۔ وہ نجانے کیا باتیں کررہے تھے۔ ا

فیض کا مزاج بگڑ گیا۔ وہ تو کچھ اور ہی سوچے بیٹھا تھا۔ پر یہاں تو بڑی پاکیزہ سی محبت چل رہی تھی۔

اس نے دیکھا فخر کی حیرت پر غصہ غالب آگیا تھا۔ فخر کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ رنگت اناری ہوگئی۔ اس نے اپنے جبڑے کو سختی سے جکڑ لیا تھا۔ زہرہ سسکیاں بھر رہی تھی۔

"تم مناسب وقت کا انتظار کررہے ہو فخر...... جبکہ وقت گزر رہا ہے۔ ابھی تو صرف یہ ہے کہ مجھے اپنی ذات کے حوالے سے برا لگ رہا ہے۔ میں زندگی بھر نہیں بھول سکوں گی کہ میرے لیے فیض جیسے اور......" اس سے عاشق حسین کا نام بھی نہ لیا۔

"گندے مردوں نے سوچا۔"

"اور تم یہ سوچو......" ان آئے دن آنے والے رشتوں کی ذراسی — بھنک — بھائی عبداللہ یا کرم کو پہنچ گئی تو وہ مجھے رخصت کرکے دم لیں گے۔

وہ تو پہلے ہی ابا جی سے کہتے ہیں جوان لڑکی کو گھر میں بٹھا کیوں رکھا ہے۔

یہ تو ناہید بھابھی جیسی سمجھ دار عورت کا کمال ہے۔ جو عبداللہ بھائی نے میری جان بخش دی ہے۔

"ورنہ اس سے پہلے...... اور کرم کے بارے میں کیا کہوں...... وہ تو...... میرا پکا دشمن بنا ہوا ہے۔ ابا جی کا منہ مارتا ہے اسے...... ورنہ تو وہ......" زہرہ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اسے فخر کی بے دھیانی محسوس ہوگئی تھی۔

اور فخر واقعی کچھ نہیں سن رہا تھا۔ پتا نہیں زہرہ نے بے وقوفی کی تھی یا۔

اس کا دماغ کھول رہا تھا۔ اگر اس پل فیض سامنے آجاتا تو وہ اس کا حشر نشر کردیتا۔ اور عین اسی لمحے فضا میں موبائل فون کی بیل نے ارتعاش پیدا کردیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو چونک کر دیکھا۔ زہرہ فون نہیں رکھتی تھی۔ اور فخر کی رنگ ٹون یہ نہیں تھی۔ دوسری بیل پر آواز کا منبع مخفی نہ رہا تھا۔ یہ کسی کے پیر تھے۔ فخر نے بجلی کی سی تیزی سے بھاگتے چور کو پکڑ لیا تھا۔ زہرہ کی چیخ نکل گئی۔

یہ تو فیض تھا۔ جو پکڑے جانے پر ایک لمحے کے لیے سراسیمہ ضرور ہوا تھا۔ فخر نے اسے گریبان سے دبوچ لیا۔

"ذلیل کمینے...... تیری یہ مجال......" فیض نے جھٹکے سے خود کو چھڑایا۔ اپنا کالر جھاڑا۔ ان دونوں کو دیکھا۔ فخر کی نگاہیں چھری ہوگئیں۔ زہرہ نے ترنت چہرہ ڈھانپا۔

"اب کیا فائدہ......" اس کا کہنے کا مقصد تھا کہ وہ تو اسے جی بھر کے دیکھ ہی چکا تھا۔ فخر ایسے اچھلا جیسے اسپرنگ لگے ہوں۔ اس نے فیض کے منہ پر گھونسا مارا تھا۔ جو اس کے گال کو چھو کر گزرا فیض نے جھکائی دے دی تھی۔ اب وہ فخر پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ فخر نے ہاتھ پھیلائے کہ وہ آئے...... آئے اس کے مقابل۔

فیض اپنے قدم تولتے ہوئے مسکرایا۔

"مزہ نہیں آیا...... اتنی ٹھنڈی ملاقات......"

"بکواس بند کر ذلیل انسان......" فخر پھر اسا ئڈ ہوگیا۔

"مارو اسے مارو۔" اسے زہرہ چلائی۔

یہی تو وہ چاہتی تھی کہ مگر تب ہی چارپائی پر دھرا فخر کا موبائل بول پڑا۔ دونوں چونکے زہرہ کی آنکھوں میں خوف ابھرا۔ اسکرین پر تا ؤجی بلنک کررہا تھا۔

"ابا جی......" زہرہ کے منہ سے نکلا۔ فیض کے لیے اتنا موقع کافی تھا۔ فخر اس کے پیچھے لپکنا چاہتا تھا مگر مسلسل بجتا فون...... تا ؤجی اب اسے فون نہیں کرتے تھے جب سے۔

اس نے فیض کے پیچھے جانے کا ارادہ ترک کردیا۔

"اللہ خیر......" زہرہ کا دل بیٹھنے لگا تھا۔ اس نے اس سمت دیکھا جدھر فیض گیا تھا۔ اسی وقت فیض پلٹا۔ زہرہ کو خود کو دیکھتا پایا۔ تو ایک ہوائی بوسہ اچھال دیا۔ زہرہ کے پورے جسم سے بھوری چیونٹیاں لپٹ گئیں۔ اس نے اس کی سمت تھوک دیا اور رخ بدل کر فخر کو دیکھا جو فون او کے کرنے نہ کرنے کی کش مکش میں تھا۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- شازیہ شاہ

میک اپ ---- سلیک بائی عینی

فوٹو گرافی ------ ایم۔کاشف

صدف

اے چشم ماندہ دل ناشاد

لمبا سا کچا صحن جس کے آدھے میں اینٹیں لگی تھیں اور آدھا کچا تھا ۔ سامنے دو بڑے کمرے بغلی باورچی خانے کے ساتھ عرصہ دراز تک جسے دروازہ میسر نہیں تھا گرمیوں میں جالی کا پردہ باورچی خانے کی چوکھٹ کی زینت بنتا اور سردیوں میں موٹی ٹاٹ جیسی چادر۔

میرا نے بچپن کی یادوں میں سے ایک حسین یاد، گھر کے پچھواڑے ایک کچا احاطہ جس میں جامن' امرود اور لوکاٹ کے درخت لگائے گئے تھے جن کا سایہ گزرتے وقت کے ساتھ اتنا گھنا ہوگیا تھا کہ بھری دوپہر میں بھی شام کا گمان ہوتا تھا اور اس گھر میں کالے میٹھے جامنوں اور کچے پکے لوکاٹ کے علاوہ جو چیز دلچسپی کا باعث تھی۔ وہ تھی خالہ جان کی دختر نیک اختر نیرہ ارباز میرے لیے نینی باجی۔

گوری چٹی اونچی لمبی وہ کیا کہتے ہیں آہو چشم سیمیں بدن' پتا نہیں اسکول کالج کیوں نہیں جاتی تھیں ،ہاں پڑھی لکھی تو تھیں۔ اخبار' رسالے اور تصویروں والے میگزین پڑھتیں ۔کبھی کبھار ان ہی رسالوں میں سے تصویریں کاٹ کاٹ کر کپڑوں کو اسی ڈیزائن میں سلواتیں۔ان کی سہیلی اف اتنی زہر لگتی تھی مجھے اس کے سامنے تو انہیں کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔

''یہ ڈیزائن دیکھو تہمینہ''

اور وہ ناک سکوڑ سکوڑ

''نہیں پرانا ہوگیا ہے ۔آوٹ آف فیشن ہے۔'' ہائے ہاف سیلوز فل کو چھوڑو اور جب میرے گال زور زور سے کھینچتیں تو میری آنکھیں بھر آتیں۔

اف ظالم چڑیل اور جاتے جاتے ٹوکری بھر جامن اور لوکاٹ لے جاتے ہوئے نینی باجی سے کہتیں۔

''نینو آنا ناں میرے گھر اور اس چھوٹی کو بھی لانا قسم سے بہت دن ہوئے۔تم گھر نہیں آئیں امی بھی تمہیں یاد کر رہی تھیں۔''

نینی باجی ہلکے سے مسکراتے ہوئے سر ہلاتے انہیں دروازے تک چھوڑنے جاتیں۔

اماں اور خالہ امی اکٹھی بیٹھتیں تو دنیا کا ہر دوسرا کام بھول جاتیں پھر تو حال احوال کے بعد موسم' موسمی بیماریوں کے ساتھ آس پڑوس کے حالات' بڑھتی مہنگائی، بدنیتی، ملکی صورت حال چاند گرہن اور سورج گرہن کے اثرات ـــــــ کے بعد اپنی مرغوب غذا کی تیاری جو ہرے بھرے رنگ برنگے ہر نام اور ہر طرح کے ساگ اور پکوائی کے مختلف طریقے، توے پر بھون کر تیار ہونے والا ساگ وچنے کی دال میں ڈالنے والا سرد تاثیر والا،گرم تاثیر والا گویا ساگ نہ ہوا نعمت غیر مترقبہ ہوگیا جس کے سامنے مرغ مسلم پانی بھرتا نظر آتا تھا اور ملنے جلنے والیاں اس ذوق سے شناسائی رکھنے کے باعث بہترین سوغات جو ساگ پر مشتمل ہوتی بغل میں دبائے خالہ امی کے حضور پیش کرتیں۔

خالہ امی دھو دھلا کر صاف کرتیں اور بہن کی راہ تکتیں کہ کب مل کر بیٹھیں اور من پسند سوغات پیٹ بھر کھائیں۔

ایسے میں میرا دل جلتا اور جلے دل پر پھاہے رکھنے کا کام کرتیں آنسہ نیرہ، میری نینی باجی بھی اونچے درختوں سے من پسند جامن اتارتیں تو کبھی آلو کے چپس بناتیں۔ ادھر دونوں بڑھیاں (یہ میں نہیں ا میاں کہتے ہیں) باتیں کرتے نڈھال ہو کر ہلتیں ،ادھر واپسی کا ارادہ بنتا اور میں دوبارہ آنے کے وعدے کے ساتھ رخصت ہوتی، پھر کب آنا ہوگا۔

کسی دن خالہ کی طبیعت کا سن کر ارباز چاچا کی پنڈی سے آمد پر یا کسی اور خاص دن اور دن بھر خاطر مدارات میں مصروف نینی باجی ہماری واپسی پر قدرے اداس خالہ امی کے پہلو میں کھڑی دروازے تک ہمیں رخصت کرنے آتیں۔

پھر دن گزرے، مہینے اور رفتہ رفتہ سال امی اور خالہ جان کی رنجش تھی کہ ارباز چچا کا اختلاف۔ عمر کم تھی ۔واقعہ کیا تھا سمجھ نہیں پائی مگر وہ ملنا جلنا اور جلدی جلدی ملنا ختم ہوگیا۔ اب ملاقات خاص خاص موقعوں تک محدود ہوگئی۔ خاندان میں کسی کی شادی کی تقریب میں آمنا سامنا ہوجاتا ۔کسی کے بچے کے عقیقے پر، کسی



مشترک رشتہ دار کے گھر دعوت پر ورنہ پھر وہی دوری۔ میں بھی پہلے اسکول اور پھر کالج تک پہنچ گئی۔

پہلے امی ہر جگہ ساتھ لے جاتی تھیں۔ اب زیادہ تر گھر میں ہی رہتی، پڑھائی کرتی۔ فارغ وقت میں رسالے اور میگزین پڑھتی اور ٹی وی پر بھی کبھار لگنے والے نور جہاں اور ناہید اختر کے گانے سنتی۔

میرے بڑے بھیا ارسلان رضا پچھلے کئی سال سے کنسلٹنٹ انجینئر کے فرائض ادا کر رہے تھے۔ قابلیت اور اپنے پروفیشن سے عشق نے انہیں تو نوازا ہمیں بھی ان کے توسط سے دنیا جہاں کی نعمتیں اور راحتیں ملیں۔ پرانے محلے سے ہاؤسنگ سوسائٹی تک اور پرانے ہنڈا سے لے کر جی ایل آئی تک، پھر رہن سہن، طور طریقے سب کچھ تیزی سے بدلا۔ اس روانی نے دنیا سے بے نیازی تو دی مگر مذہب سے رغبت بڑھ گئی۔ امی ابو اکٹھے حج کی سعادت حاصل کر چکے تھے اگلی باری میری تھی۔

شادی کے نام سے بھاگنے والے ارسلان بھائی اب کچھ آمادہ دکھائی دیتے تھے۔ شاید جس خواب کی تمنا نے انہیں اتنے عرصے اتنی سخت محنت میں مبتلا رکھا تھا وہ پالیا تھا۔ ایک اچھی پر آسائش زندگی دینی دنیوی معاملات نپٹانے کے وسائل اور وہ سب کچھ جس کی تمنا انسان کرسکتا ہے لہٰذا اب اس گھر کو ایک اچھی لڑکی کی ضرورت تھی۔

لفظ لڑکی پر ارسلان بھائی کو اعتراض تھا کہ وہ خود اپنی وہ عمر گزار کر سنجیدگی کے دور میں داخل ہوگئے تھے لہٰذا ان کا مطالبہ ایک پڑھی لکھی، بردبار، ان کی ذمہ داریوں میں ساتھ دینے والی سوبر خاتون۔ اماں کے اندر کی جذباتی ماں جو اتنا عرصہ جانے کہاں سوئی پڑی تھی یکدم بیدار ہوئی اب لڑکی دیکھنے کی مہم پر روانہ ہوئیں۔

آج رفیق دانے والا کی بیٹی کو دیکھنے جانا ہے جو نئے محلے کی پڑوسن خالہ رضیہ کی بھانجی تھیں۔ بقول شخصے چندے آفتاب چندے ماہ تاب رنگت شہاب پر بہار جو ایک بار دیکھے بار بار دیکھنے کی آرزو کرے، اور کہے ایک بار دیکھا ہے دوبارہ دیکھنے کی آرزو ہے۔

غرض یہ کہ ایسا کرشمہ جہاں سوز ہے کہ کسی کے بھی ہوش و حواس کو ٹھکانے لگانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اماں تو اتنی خوبیوں کا سنتے ہی بنا دیکھے ہی فریفتہ اور ہم دل ہی دل میں اپنے پیارے بھیا کے اعلا دماغ کی خیر مانگتے ساتھ دینے پر مجبور۔ وقت مقررہ پر سیٹھ صاحب کے گھر پہنچے۔ والہانہ نہ سہی پر تپاک استقبال کے بعد سجے سجائے ڈرائنگ روم میں پہنچے وہ حسن جہاں سوز ہنوز پردے میں تھا۔

تھوڑی دیر بعد چلمن کے پیچھے جو چہرہ نظروں کے سامنے آیا اس کے سامنے ساری کہانیاں ہیچ لگیں۔ واقعی آج کے دور میں ایسا حسن کبھی کبھار ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ سیاہ لباس میں سرخ و سفید رنگ، سرو قامت اور متناسب سراپے کے ساتھ یقیناً ایک شاہکار تھا۔ حسن کے علاوہ تعلیمی اسناد کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ تھا۔ ایم اے اکنامکس، ایم فل، بی ایڈ ایم ایڈ اور اب پی ایچ ڈی کے لیے پر تول رہی تھیں۔ گھرانے کی تہذیب، رہن سہن کچھ بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں تھا مگر آخر میں ...... جب انہوں نے گھر داماد کی شرط رکھی تو اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی اور ہم بخیریت گھر لوٹے۔

پھر اس کے بعد ہر دوسرے دن کسی آنٹی کی بتائی جگہ پر لڑکی دیکھنے جاتے مگر کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی کہ بات نہ بنتی۔ آج بھی ایسے ہی کسی معرکے کے بعد گھر لوٹے تو تھکاوٹ سے برا حال ہوتے ہوئے وضو کیا کہ عصر کی نماز نکلی جا رہی تھی۔ نماز پڑھنے کے بعد جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ایک چہرہ چھم سے نگاہوں کے سامنے آکر ٹھہر گیا۔

نینی باجی میرے بچپن کو خوش گوار بنانے میں ایک اہم کردار، میری اچھی یادوں کا ایک اچھا حصہ۔ اماں بتاتی ہیں کہ کچھ مہینوں کے فرق سے وہ ارسلان بھائی کی ہم عمر ہیں اور پھر رات کی ہانڈی روٹی کی فکر میں الجھی اماں سے اپنے اس خیال کا اظہار کیا۔ تقریباً ایک ہفتہ پہلے کلثوم آنٹی کے گھر دعوت پر میں نے نینی باجی کو دیکھا۔ گزرے وقت نے ان پر کوئی خاص

نقوش نہیں چھوڑے تھے۔ دبلا پتلا سراپا ایک خوبصورت سی فربہی میں ڈھل گیا تھا۔ چہرہ وہی، نقوش وہی، ان کی ملائمت ویسی ہی۔ مگر آنکھیں لحظہ لحظہ رنگ بدلتیں، کبھی گلابی سی کبھی شاد، کبھی غمگین اور کبھی سوچتی پر سوچ کا سرا نہ دیتی گھنے جنگل جیسی۔ وقت ان کے ساتھ ساتھ مجھ پر بھی تو کچھ نقوش چھوڑ گیا تھا۔ لاابالی باتیں ہلکے پھلکے فلسفے میں بدل گئی تھیں۔ ناقابل فہم باتیں سمجھ میں آنے لگی تھیں اور چہرہ شناسی کا دعوا مکمل طور پر درست نہ سہی مگر کچھ نہ کچھ سمجھ کا دعوا تو کر ہی سکتی تھی۔

اماں نے پہلے تو میری بات کو بے توجہی سے سنا پھر ایک سرد آہ بھری اور بچپن کی الجھی گتھی ان کی باتیں سن کر دھیرے دھیرے کھلتی گئی۔ دونوں بہنوں کی محبت، خالو کی اپنے سسرال سے ازلی کدورت اور خالہ کو بہن بھائیوں سے محبت کے صلے میں ملنے والے ان کے طعنے۔ اماں کی بھیا کے نوجوانی کے زمانے کی خواہش اور اس کا برملا خالہ کے سامنے اظہار جو نینی باجی اور ارسلان بھائی کے رشتے کے حوالے سے تھا۔ جواباً خالو کا سارا کینہ اور بغض و عناد کھل کر سامنے آگیا۔

پھر تو خالہ کے خاندان کے بڑوں سے لے کر ارسلان تک سب کے خوب ہی بخیے ادھیڑے اور آئندہ کے لیے ملنے جلنے پر پابندی لگادی کہ خالو کے اپنے بھتیجے کوئی امریکہ پلٹ تھا تو کوئی ڈاکٹر۔ انہیں یقین واثق تھا کہ ان کی اکلوتی بیٹی کے لیے رشتوں کی کوئی کمی نہیں۔ خالہ مزید کسی جھگڑے فساد سے بچتے گھر تک محدود ہوگئیں اور اماں نے اپنی ان سے محبت کو دل میں دبائے عزت نفس بچانے کو ترجیح دی۔ یوں ایک مثالی محبت اور میل جول ختم ہوگیا۔

اب اتنے عرصے بعد میری بات نے دبی محبت کی چنگاری کو پھر سے بھڑکا دیا۔ کہیں سے خالہ جان کا فون نمبر بھی مل گیا پھر تو گلے شکوے رونا دھونا سب کچھ ہوا اور تجدید تعلقات کے لیے اماں نے ہی بڑھ کر قدم اٹھایا۔ میں یعنی روشین رضا خوشی خوشی ایک بار پھر اماں کے ہم قدم تھی۔

وہی راستے، وہی مکان، ویسا ہی چھتنار سایہ ہاں گزرے وقت کے ساتھ کچھ تبدیلیاں آئی تھیں۔ سرخ اینٹوں اور کچے صحن کی جگہ سفید جھاگ ٹائل بچھے تھے۔ جالی کے پردے کی جگہ خوبصورت نقشین دروازہ کمروں میں جدت کا عنصر نظر آرہا تھا۔

پچھلے صحن میں تیزی سے دوڑی میرے بچپن کی کوئی ایک یاد۔ ہاں سیمنٹ کے پکے فرش کے ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر وہی جامن، وہی لوکاٹ، وہی امرود کے گھنے سایہ دار۔ درخت جن کی شاخوں پر پرندے بیٹھتے اور پتے ہوا سے ہلکورے کھاتے۔

کھلے کواڑ سے اندر تو آگئے تھے اب صحن میں کھڑے سوچ رہے تھے کہ اچانک خالہ امی باہر آئیں پھر تو جو رم جھم ساون برسا کہ پانی کے لیے جگہ کم پڑ گئی۔

پھر گزرے سال کا احوال بہ زبان خالہ کچھ یوں تھا کہ خالو کو اپنے جن رشتہ داروں پر بہت مان تھا انہوں نے ہی ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپا۔ خاندانی وراثت کی تقسیم میں اپنے وسائل اور حیثیت کو استعمال کرتے انہیں مکمل محروم کرنے کی تیاریوں میں تھے۔ کسی مخلص خیر خواہ کی بروقت آگہی نے آنکھیں کھول دیں۔ اپنا حصہ پورا نہ سہی مگر جیسے تیسے وصول کیا مگر دل میں موجزن محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر یک دم جامد ہوا تھا۔ اب احساس تو ہوا کہ اکلوتی سالی اور ان کے سارے خاندان کے ساتھ کیسی زیادتی کر بیٹھے ہیں مگر خود سے رابطہ کرنے میں بھی عار محسوس ہوا۔ خالہ تو پہلے بھی ضد میں بیٹھی تھیں۔ اب مزید اکڑ گئیں۔

خیر خالو سے ملاقات ہوئی۔ گزرے وقت نے اور بہت سی تبدیلیوں کے ساتھ مزاج میں بھی نرمی پیدا کردی تھی۔ محبت سے ملے، امی کی عاجزانہ التجا پر مثبت جواب کا عندیہ دیا۔ نینی باجی کا حسن لاجواب قائم تھا۔

منگنی وغیرہ کے بجائے جلدی شادی کی تاریخ طے کردی گئی۔ اب آنے والا وقت نینی باجی اور ارسلان بھائی کے ساتھ اچھا گزرنے والا تھا۔ امی کا چہرہ روشن تھا اور میرا دل شاد۔

☆

آمنہ ریاض

دشتِ جنوں

آئے کت کے ڈراموں نے اسامہ کو اس حد تک متاثر کیا کہ اس نے خود کو الماری میں بند کرلیا جہاں وہ دم گھٹنے سے مرگیا۔ آئے کت نے اسے بچانے کی کوشش بھی نہیں کی۔

اسامہ کی موت نے پاشا کی آنکھیں کھول دیں اور اس نے ساری سچائی کبیر کو اور کبیر نے معاویہ کو بتادی۔ آئے کت نے منصوبہ کے تحت معاویہ کو احساس جرم میں مبتلا کرنا چاہا مگر ناکام رہی۔ اپنی جھوٹی پریگنینسی اور مس کیرج کے ڈرامے سے اس نے معاویہ کی ہمدردی جیت لی۔ معاویہ کو پاشا جھوٹا لگنے لگا۔ اور اس نے محض آخری کال کرنے کی بنا پر شیرازی کو اسامہ کی موت کا ذمہ دار قرار دے دیا۔ معاویہ نے آئے کت کا چیک اپ کروایا جس سے اس کا جھوٹ سامنے آگیا وہ ماں بن ہی نہیں سکتی تھی مگر اس سے پہلے ہی آئے کت معاویہ کا رشتہ ٹھکرا کر ترکی چلی گئی تھی۔

آئے کت سمجھ رہی تھی کہ معاویہ اس کی حقیقت سے ابھی تک ناواقف ہے۔ اس لیے صاعقہ ممانی کے بھتیجے کی شادی میں شریک ہونے پاکستان آگئی۔ جہاں معاویہ نے اپنے منصوبے کے تحت اسے شادی کے لیے راضی کر لیا۔ پاشا کا احساس جرم بڑھتا گیا جبکہ شہربانو نے جو اس کے باپ کے دشمن کی بیٹی تھی پاشا سے خفیہ نکاح کرنے سے انکار کردیا۔

۳۰

تیسویں اور آخری قسط

وہ تینوں بھاگتے ہوئے کچن میں آئے تھے۔
وہ کچن میں نہیں تھی۔ کیف نے آتے ہی کچن کا کونا کونا چھان مارا یہ ان تینوں کے لیے فکر کا مقام تھا۔
وہ پاگلوں کی طرح اسے ڈھونڈ رہے تھے مگر وہ وہاں نہیں تھی۔ وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے باہر ہال میں آگئے۔
اسی وقت منفرا کی نظر فلک بوس سے باہر جانے والے دروازے پر پڑی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا ایسے جیسے کوئی جاتے جاتے کھلا چھوڑ گیا ہو۔ منفرا کو نئی فکر نے گھیر لیا۔
''دروازہ کھلا ہوا ہے۔'' اس نے فکرمندی سے ان دونوں کا دھیان باہر کی جانب دلایا۔ ''مجھے لگتا ہے کبیر بابا جاتے ہوئے دروازہ کھلا چھوڑ گئے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آئے کت باہر چلی گئی ہو؟ باہر چیک کرنا چاہیے۔''
کیف نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ تینوں تیزی سے باہر کی جانب بڑھے۔
اسی لمحے کیف کی نظر صوفے کے پاس خون کے چند قطروں پر پڑی۔
آئے کت کی فکر میں وہ تینوں ہی پہلے اس خون کو دیکھ نہیں پائے تھے۔
کیف نے ان دونوں کو باہر کی جانب جانے دیا اور خود رک کر خون دیکھنے لگا۔
وہ صرف ایک قطرہ نہیں تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گرنے والے قطروں کی پوری لائن تھی جو سیڑھیوں تک گئی ہوئی تھی۔ کیف بھاگتا ہوا سیڑھیوں کی طرف آیا۔ خون کے قطروں کی وہ لائن اوپر کی طرف جارہی تھی۔
کیف نے خود کو کسی بری صورت حال کے لیے تیار کیا اور ان دونوں کو بتائے بغیر اوپر کی جانب بڑھ گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ دونوں کچھ ایسا دیکھیں جو انہیں مزید خوف زدہ کردے۔
وہ دونوں بھاگتی ہوئی باہر آئی تھیں۔
ڈرائیو وے پر کھڑے ہو کر ان کی نظر لان میں جہاں تک گئی، وہاں ان کے علاوہ کوئی موجود نہیں تھا۔ مین گیٹ بھی بند تھا یعنی آئے کت فلک بوس کے اندر ہی موجود تھی۔
لیکن کہاں؟
ایک ہاتھ کمر پر ٹکائے اور دوسرے سے سر کو پکڑے منفرا بے حد فکرمندی سے لان کا جائزہ لے رہی تھی۔
اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ پلک جھپکے اور آئے کت اس کے سامنے آجائے۔
کچھ ایسا ہی حال خوش نصیب کا بھی تھا۔ اسے کچھ فکر یہ بھی تھی کہ اس کی باتوں سے چڑ کر ہی آئے کت نے خود کو کٹ لگایا تھا اگر اب وہ خود کو مزید نقصان پہنچاتی تو یقیناً اس کی ذمہ دار وہی ہوتی۔
وہ دونوں اسے ڈھونڈتے ہوئے فلک بوس کے دائیں حصے کی جانب نکل آئی تھیں۔
اپنے نام سے مشابہ وہ قلعہ فلک بوس ان کے ساتھ، ان کے سامنے پوری شان سے کھڑا تھا۔
اس وقت جب منفرا مایوس ہو کر واپس جانے کو پلٹی، اس نے غیر ارادی طور پر سر اٹھا کر اوپر کی جانب دیکھا۔ اور اسے لگا پورا قلعہ فلک بوس اس کے سر پر آگرا ہے۔

☆☆☆

اسے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ ان خون کے قطروں کا پیچھا کرتے ہوئے کتنی سیڑھیاں چڑھا تھا۔ اسے اس وقت صرف یہ معلوم تھا کہ اسے آئے کت کو بچانا تھا۔ ہر حال میں لیکن خون کے بڑھتے ہوئے قطرے اسے خوف زدہ کررہے تھے۔ جس قدر خون اس کے جسم سے بہہ چکا تھا، کیف کو لگا کہ وہ شاید اسے زندہ حالت میں نہیں ڈھونڈ سکے گا لیکن اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔
وہ خون کے قطرے ایک ٹیرس پر جا کر ختم ہوئے اور وہ سامنے ہی کھڑی تھی۔

اپنے پیروں پر...... زندہ سلامت...... لیکن اس کے بازو سے ابھی بھی خون بہہ رہا تھا۔ اس کا چہرہ خطرناک حد تک زرد تھا اور...... وہ ٹیرس کی دیوار کے اوپر کھڑی تھی اپنے بازو پھیلائے۔

☆☆☆

وہ ٹیرس فلک بوس کی تیسری منزل کا حصہ ہے یا چوتھی۔ وہ اندازہ نہیں کرپائی۔ اس لمحے اگر وہ کچھ جانتی تھی تو وہ یہ کہ اس ٹیرس کی ایک دیوار پر آئے کت ہاتھ پھیلائے کھڑی۔ وہ اتنی اونچائی پر تھی کہ منفرا کو خوف کی شدت سے اپنا خون جمتا ہوا محسوس ہوا۔ پتھر کے بت کی طرح وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
خوش نصیب نے جو اسے اوپر کی جانب تکتا پا کر اس کی نظروں کا تعاقب کیا اور کچھ ایسی ہی حالت اس کی بھی ہوئی جیسی منفرا کی تھی۔ دونوں ہی سمجھ نہیں پارہی تھیں کہ اس وقت انہیں کیا کرنا چاہیے۔ پھر اس دیوار کے دوسرے کونے کے پاس انہوں نے کیف کو نمودار ہوتے دیکھا۔
سکون کا سانس آنا۔ پہلی بار ان دونوں پر اس جملے کا اصل مطلب واضح ہوا تھا۔
''کیف وہاں پہنچ گیا ہے۔ اس کے پاس...... اب وہ بچ جائے گی۔'' پہلی بات جو ان دونوں کے دماغ میں تھی وہ یہی تھی۔
اتنی دور سے بھی وہ دیکھ سکتی تھیں کہ آئے کت کے سفید لبادے پر جگہ جگہ خون لگا ہوا تھا۔ اسے اپنی کلائی کاٹے کم از کم بیس منٹ گزر چکے تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس کے جسم کا زیادہ تر خون ضائع ہوچکا ہے اور پھر بھی وہ اپنے پیروں کھڑی تھی۔ منفرا کو حیرت ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ آئے کت کی حالت کو کس بیماری کا نام دے۔
''آگئے تم...... تمہارا ہی انتظار کررہی تھی میں۔'' آئے کت نہ صرف اسے دیکھ چکی تھی بلکہ اسے دیکھ کر اب مسکرا بھی رہی تھی۔
کیف کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ ہوا بہت تیز چل رہی تھی اور آئے کت کے ڈگمگاتے قدم اسے پریشان کررہے تھے۔ وہ غیر محسوس انداز میں آگے بڑھنے لگا جب وہ بولی۔
''آگے مت آؤ۔ تمہیں لگتا ہے میں گر جاؤں گی؟'' اس نے سوال کیا پھر ہنسی تھی۔ ''ایسا کچھ نہیں ہوگا اور اگر ہوا بھی تو کیا۔ تم جانتے ہو میں مر نہیں سکتی۔ آیوشمتی نہیں مر سکتی۔'' وہ اب ڈگمگاتے ہوئے دیوار پر چلنے لگی۔
ان دونوں نے اسے اپنی جگہ سے ہلتے دیکھا مگر وہ دیوار سے اتری نہیں بلکہ وہ اب آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کا رخ فلک بوس کے اگلے حصے کی طرف تھا۔ وہاں ہوا بہت تیز تھی اور اس کا ہوا سے پھڑپھڑاتا ہوا لبادہ اس کے چلنے میں رکاوٹ کا باعث بن رہا تھا۔ اس کے قدموں کی لڑکھڑاہٹ وہ دونوں اتنی دور سے بھی محسوس کرسکتی تھیں۔
منفرا کو محسوس ہوا کہ جیسے وہ چلنے کے ساتھ ساتھ کچھ بول بھی رہی۔ شاید وہ کیف سے بات کررہی تھی لیکن اس کی آواز وہ یہاں کھڑی ہو کر سن نہیں سکتی تھی۔
''آخر کیف اسے نیچے کیوں نہیں اتار رہا۔'' منفرا نے خوش نصیب کی جھنجلائی ہوئی آواز سنی لیکن فی الحال اس میں جواب دینے کی ہمت بھی نہیں تھی۔
''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ آیوشمتی نہیں مر سکتی۔ مگر تم یہ سب کیوں کررہی ہو؟ دیوار سے نیچے اتر آؤ۔ مجھے تمہاری بات پر پورا یقین ہے تمہیں کچھ نہیں ہوسکتا۔'' کیف نے آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
اس نے پیچھے مڑ کر کیف کو دیکھنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں وہ بری طرح لڑکھڑائی۔
''دھیان سے۔'' کیف نے چیخ کر کہا تھا۔ آئے کت ہنس پڑی۔
''تمہارا عمل تمہارے لفظوں کا ساتھ نہیں دے رہا لڑکے! تم ابھی بھی اس بات سے ڈر رہے ہو کہ میں نیچے

گر کر مر جاؤں گی مگر مجھے کچھ نہیں ہوگا۔" کیف کو اس "یقین" سے خوف آیا۔

"نن...... نہیں...... مجھے تمہاری بات پر یقین ہے...... پورا یقین ہے۔"

"تمہارے ساتھ جو لڑکی تھی اسے نہیں ہے۔ مجھے اسے یقین دلانے دو۔"

"وہ بے وقوف ہے۔ اس کی بات مت سنو۔" آئے کت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ابھی بھی اپنے پرانے مشغلے میں مصروف تھی۔

اور اگر اس طرح دیوار پر چڑھ کر وہ انہیں ڈرانا چاہتی تھی تو وہ پوری طرح کامیاب رہی تھی۔

وہ لوگ ڈر چکے تھے۔

آیو شمتی سے نہیں۔

آئے کت سے۔

وہ چلتے چلتے فلک بوس کے اگلے حصے تک آ گئی۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ زرد ہو چکا تھا۔ آنکھیں بوجھل تھیں اور چلتے ہوئے ٹانگیں کانپ رہی تھیں مگر وہ کیف کی منتوں کے باوجود دیوار سے نیچے آنے پر راضی نہیں ہو رہی تھی۔

نیچے کھڑی منفرا اور خوش نصیب مسلسل اس کی خیریت کی دعا مانگ رہی تھیں۔

"سنو...... اگر تم میری بات مانو گی اور دیوار سے ابھی نیچے آ جاؤ گی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم پر لگے سارے الزام سب کے سامنے لاؤں گا اور سب کو بتاؤں گا کہ قصور تمہارا نہیں بلکہ آئے کت کا تھا اور یہ کہ تم بے قصور ہو۔" کیف نے آخری حربے کے طور پر کہا۔

وہ اس کے قریب آ گیا تھا لیکن اسے پکڑ کر دیوار سے اتارنے میں تامل کا شکار تھا۔ ذرا سا بھی جھٹکا لگنے سے وہ نیچے گر سکتی تھی۔

آئے کت نے اس کی طرف دیکھا۔ کیف کو اس کی آنکھوں میں عجیب سی تکلیف نظر آئی۔ ایسی تکلیف جو بازو پر لگے کٹ کی صورت میں بھی ظاہر نہ ہوئی تھی۔

"مجھے اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔" اس نے سر جھٹکا۔ بدن میں بڑھتی نقاہت اب اسے پریشان کرنے لگی تھی۔ "مگر ٹھیک ہے تم کہتے ہو تو میں نیچے آ جاتی ہوں۔"

آئے کت نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے نیچے اترنا چاہا۔ کیف تیزی سے اس کی مدد کے لیے آگے بڑھا تھا مگر اس سے پہلے ہی وہ نیچے اتر چکی تھی۔ بس وہ یہ بھول گئی کہ اسے چھت کی طرف اترنا ہے...... نہ کہ نیچے باغ کی طرف۔

منفرا اور خوش نصیب نے دیکھا آئے کت نے اپنا رخ باغ کی طرف موڑ لیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے ہوا میں ایک سفید کپڑا لہرایا۔ چند سیکنڈ کا کھیل تھا اور وہ کپڑا ایک ناتواں وجود لیے ڈرائیو وے پر آ گرا۔

خوش نصیب نے اپنی چیخیں روکنے کے لیے اپنے منہ کو مضبوطی سے دونوں ہاتھوں سے دبا لیا۔ منفرا پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے پڑے خون آلود وجود کو دیکھ رہی تھی۔ اوپر کھڑے کیف نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے ہوئے نیچے دیکھا اور اذیت سے آنکھیں بھینچ لیں۔

جس وقت آئے کت کا جسم زمین سے ٹکرایا، اسی وقت فلک بوس کا مین گیٹ خودکار انتظام کے تحت کھلا اور معاویہ کی جیپ فراٹے بھرتی ڈرائیو وے پر آ کر رکی۔ اردشیرازی، معاویہ اور پاشا نے اپنی آنکھوں سے آئے کت کو نیچے گرتے اور پھر اس کے سر کو کئی حصوں میں بٹتے دیکھا۔

معاویہ گاڑی سے باہر نکل آیا۔ اس کے قدم اس وجود کی طرف بڑھے جس نے اس سے اس کا بھائی چھینا تھا وہ وجود جس سے اس نے زندگی میں سب سے زیادہ نفرت کی تھی اور شاید محبت بھی۔

وہ گھٹنوں کے بل اس کے پاس جا بیٹھا۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو نکل کر آئے کت کی لاش کے پاس، زمین پر جا گرا۔ بالآخر انتقام کا سفر اختتام کو پہنچا تھا۔

☆☆☆

ہم دشتِ جنوں کے سودائی۔۔۔!
ہم گردِ سفر، ہم نقشِ قدم
ہم سوزِ طلب، ہم طرزِ فغاں
ہم حیرت و حسرت، یاس و علم
ہم دشتِ جنوں کے سودائی۔۔۔!
یہ دشتِ جنوں، یہ پاگل پن
یہ پیچھا کرتی رسوائی
یہ رنج و الم، یہ حزن و ملال
یہ نالۂ شب، یہ سوزِ کمال
دل میں کہیں بے نام چبھن
اور حدِ نظر تک تنہائی
ہم دشتِ جنوں کے سودائی۔۔۔!
اب جان ہماری چھوٹے بھی
یہ دشتِ جنوں ہی تھک جائے
جو روح و بدن کا رشتہ تھا
کئی سال ہوئے وہ ٹوٹ گیا
اب دل کی دھڑکن رک جائے
اب سانس کی ڈوری ٹوٹے بھی
ہم دشتِ جنوں کے سودائی۔۔۔!

منفرا نے اسے آئے کت کی تدفین کے چوبیس گھنٹوں بعد دیکھا جب وہ تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ کمرے میں آیا اور سر جھکا کر صوفے پر جا بیٹھا۔ اس کے ہر ہر انداز سے تھکن اور دکھ جھلک رہا تھا۔

وہ اور پاشا اسے قبرستان میں وسامہ کے برابر دفنا آئے تھے۔ اس کے جنازے میں صرف چار لوگ موجود تھے۔ وادی تک اطلاع جانے ہی نہیں دی گئی تھی حتیٰ کہ پولیس سے بھی اس معاملے کو چھپا لیا گیا تھا۔ کیف کو اس معاملے میں کس مشکل سے چپ کروایا گیا تھا یہ بالکل الگ داستان تھی۔ اردشیرازی نے اسے دھمکیاں دی تھیں اور وہ چاہ کر بھی پولیس کے پاس نہیں جا سکا تھا۔ اسے اپنی جان کی تو کوئی خاص پروا نہیں تھی لیکن خوش نصیب کی وجہ سے خاموشی اختیار کرنا اس کی مجبوری بن گئی۔ قصہ مختصر کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو سکی کہ کوئی دس سال تک فلک بوس میں قید رہنے کے بعد چپ چاپ مر گیا ہے۔

اور اب وہ اس کے سامنے تھا۔

وہ کھڑکی میں کھڑی تھی۔ اس نے مڑ کر بس ایک نظر ہی اسے دیکھا اور پھر دوبارہ باہر دیکھنے لگی تھی۔

"تم...... مجھ سے...... کچھ پوچھنا چاہتی ہو؟" کچھ دیر بعد معاویہ کی آواز سنائی دی۔

"کیا مجھے کچھ پوچھنا چاہیے؟" منفرا نے مڑے بغیر کہا۔

معاویہ خاموش ہوگیا۔ اس کے پاس اپنے کسی عمل کی صفائی نہیں تھی یا شاید وہ دینا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس کے نزدیک وہ حق پر تھا۔ اس کے چہرے پر دکھ ہی دکھ تھا۔

"تو اسی لیے مجھے فلک بوس میں اکیلے گھومنے پھرنے کی اجازت نہیں تھی۔ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ میں بھٹک جاؤں گی بلکہ مسئلہ یہ تھا کہ کہیں میں فلک بوس کی سب سے بڑی سچائی تک نہ پہنچ جاؤں۔ کہیں میں تمہاری اصلیت نہ جان لوں معاویہ۔"

"تم کیا کہہ رہی ہو منفرا! میری اصلیت؟ کیا ہے میری اصلیت؟" معاویہ نے حیرانی سے کہا تھا۔

منفرا کو اس کی بے خبری پر غصہ آیا۔

"خود کو اتنا لاعلم اور معصوم ظاہر نہ کرو معاویہ! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنے ظالم اور بے حس ہو سکتے ہو۔ تم نے ایک جیتے جاگتے انسان کو یہاں قید رکھا حتیٰ کہ اس نے خود کو موت کے گھاٹ اتار لیا اور تم ابھی بھی خود کو حق پر کہتے ہو۔" اس کے انداز میں افسوس ہی افسوس تھا۔

منفرا آنکھوں میں دکھ سمیٹے اس کے چہرے کو تک رہی تھی۔ یہ وہ معاویہ نہیں تھا جسے وہ جانتی تھی۔ یہ تو کوئی اور ہی تھا جس کے نزدیک اپنا کیا ہوا ظلم ہی ٹھیک تھا۔

"تم جانتے ہو معاویہ کہ اسے حبس بے جا میں قید رکھنے پر تم خود مجرم بن چکے ہو۔۔۔ وہ تمہاری وجہ سے ذہنی مریض بنی اور اس نے خودکشی کر لی اور۔"

معاویہ نے اسے بات مکمل نہ کرنے دی تھی۔

"یہی سب...... یہی سب اس نے میرے بھائی کے ساتھ کیا تھا۔ اسے ذہنی مریض بنا دیا تھا۔ اسے اتنا پاگل کر دیا کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے لی۔

تم جانتی ہو کہ اپنے اکلوتے رشتے کو کھو دینا کیسا ہوتا ہے۔ اس دنیا میں اگر مجھے کوئی خود سے زیادہ عزیز تھا تو وہ وسامہ تھا منفرا! کتنا چاہتا تھا وہ اسے۔ کس قدر محبت کرتا تھا اس سے...... اور اس نے کیا کیا...... اس نے اسی کی جان لے لی۔ صرف دولت اور خوب صورتی کے لیے۔ یہ مجھ سے مانگتی دولت۔ میں نہ دیتا تو کرتی یہ سب۔ مگر اس نے تو مجھ سے میرا اکلوتا رشتہ ہی چھین لیا اپنی خوشی کے لیے۔"

منفرا نے دیکھا کہ معاویہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اسے تکلیف ہوئی تھی اس کے آنسوؤں سے۔

"معاویہ! تم...... تم پولیس کے پاس جاتے۔ عدالت سے مدد لیتے۔ تمہارے پاس ریسورسز تھے۔۔۔ تم انصاف حاصل کر سکتے تھے۔ مگر تم نے تو خود کو ہی گناہ گار کر لیا۔"

"دنیا کی کوئی عدالت اسے ایسی سزا نہ دیتی جس سے وہ روز مرتی روز جیتی۔ دنیا کی کوئی عدالت اسے ایسی سزا نہ دیتی جس سے وہ، وہ تکلیف محسوس کر سکتی جس سے میرا بھائی گزرا تھا اور مجھے اسی درد سے اسے گزارنا تھا۔ میرے لیے مشکل نہیں تھا کہ میں اسے اپنے ہاتھوں جان سے مار دیتا۔ مگر میں اسے اس اذیت کا پتہ کیسے دیتا جو میرے بھائی کو ہوئی تھی۔ جو مجھے ہوئی۔ میں نے اسے صرف ایک ماہ میں وہ سب سبق پڑھا دیے جن کا عکس دس سال گزرنے کے بعد بھی اس کے دماغ پر قائم رہا۔" اس کو اپنے کیے پر ذرہ برابر بھی افسوس نہیں تھا۔

"اور عدالت تو صرف آئے کت کو سزا دیتی۔ اس کا ساتھ دینے والوں کو تو کوئی سزا نہ ملتی۔ پاشا۔ بابا کبیر۔ ان سب کو کیسے سزا ملتی ان کے کیے کی۔ میں نے ان سب کو سزا دی۔ ساری زندگی کے لیے ان سب کو ان دیکھی زنجیروں میں قید کر دیا۔ میرے بھائی کے قاتل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان دیکھی قید میں قید رہے۔"

"تم مجھے یہاں کیوں لاتے تھے؟ کیا اسے دکھانے کے لیے؟"

منفرا کو عجیب کراہیت محسوس ہوئی معاویہ کی باتوں سے۔ وہ آئے کت کو سزا دینے کے لیے اس کو استعمال کرتا رہا تھا۔

معاویہ نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔

"میں سمجھا نہیں۔ تم کیا کہہ رہی ہو؟ میں کسے اور کیا دکھانا چاہتا تھا؟"

"کیا تم اس سے محبت کرتے تھے معاویہ؟" وہ بس یہی پوچھ پائی۔ اس کے لیے یقین کرنا مشکل تھا کہ معاویہ صرف اپنے بھائی کی وجہ سے اس حد تک چلا گیا تھا۔

معاویہ نے جواب نہیں دیا۔ اس نے آنکھیں موند کر سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔

"میں پہلے ہی بہت پریشان ہو منفرا۔ میری پریشانی میں اضافہ مت کرو۔" اس کے لفظ سخت لیکن لہجہ بے چارگی بھرا تھا۔

"مجھے جواب چاہیے معاویہ!" وہ چیخ اٹھی۔

"ہاں میں کرتا تھا اس سے محبت۔ وسامہ کی موت کے بعد میں اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ مگر جس دن مجھے اس کی حقیقت معلوم ہوئی، میں نے اس سے زیادہ نفرت کسی سے نہیں کی۔" وہ ویسے ہی آنکھیں موندے جواب دے رہا تھا۔ "تم جانتی ہو منفرا نفرت کا رشتہ محبت کے رشتے سے بھی زیادہ مضبوط ہوتا ہے اور جب آپ اس رشتے کو کھو دیتے ہیں تو آپ خود بھی ٹوٹ جاتے ہو۔ خود کو بھی کھو دیتے ہیں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔

منفرا اس کی شکل دیکھتی رہی۔ اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔

وہ چاہ کر بھی معاویہ کو کہہ نہیں پائی کہ نفرت اور محبت تو ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔ یہ تو انسان اور اس کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ کس پہلو کو چنتا ہے۔

"مگر منفرا...... مجھے سکون تو ابھی بھی نہیں ملا۔ یہ سب کر کے بھی میرا سکون غائب ہے۔ میرا دل مجھ سے ہی خفا ہے۔ مجھے بتاؤ منفرا کہ میں کیا کروں کہ مجھے سکون مل جائے۔ تمہیں پانے کے بعد جب میں کچھ پرسکون ہوا تو وہ کیوں لوٹ کر واپس آئی؟ کیوں میرے سکون کی دشمن بن گئی پھر سے۔"

اس کی ہچکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں اور منفرا کو ان ہچکیوں کے درمیان اپنا سکون کھوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"لوٹ کر واپس آئی؟" منفرا بڑبڑائی۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ اس جگسا پزل کے کچھ حصے ابھی بھی غائب تھے۔ کہانی وہ نہیں تھی جو اسے بتائی گئی۔

"کب آئی تھی وہ یہاں؟ تمہاری کیا بات ہوئی اس سے؟" معاویہ نے اپنی شرٹ کی آستین سے ہی اپنی آنکھیں پونچھیں۔

"وہ تو...... دس سال سے یہاں ہی تھی معاویہ؟ تم نے اسے یہاں قید کر رکھا تھا۔ ہے نا؟" منفرا نے رک رک کر پوچھا۔ انداز ایسا تھا جیسے خود بھی متذبذب ہو گئی ہو۔

"تمہیں میں پاگل نظر آتا ہوں؟" معاویہ نے درشتی سے کہا۔ "ہاں ٹھیک ہے کہ میں نے اسے غصے میں اغوا کروایا تھا۔ میں نے اسے کچھ عرصہ یہاں بند بھی رکھا تھا۔ لیکن...... میں ساری عمر تو اسے یہاں نہیں رکھ سکتا تھا نا۔ اس کے بعد میں نے اسے یہاں سے جانے کی اجازت دے دی تھی۔"

منفرا شل رہ گئی۔ تو کیا آئے کت اور کبیر نے ان سے جھوٹ بولا تھا؟

☆☆☆

"پاشا!" کبیر اسے ڈھونڈتا ہوا ان کی طرف آیا۔

"یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس کے لہجے سے پریشانی ظاہر تھی۔
"کچھ نہیں۔" پاشا سرد مہری سے بولا۔
"تم ٹھیک ہو؟" کبیر نے پوچھا۔
"آپ کو لگتا ہے میں ٹھیک ہو سکتا ہوں؟" پاشا جیسے پھٹ پڑا تھا۔ "ایک انسان جسے ٹشو پیپر کی طرح سب نے استعمال کیا ہو وہ ٹھیک ہو سکتا ہے؟ پہلے آئے کت نے مجھے استعمال کیا تھا پھر معاویہ نے اور سب سے آخر میں اردشیرازی نے۔ معاویہ نے اپنا بدلہ لینے کے لیے مجھے اس لڑکی کے قتل پر اکسایا جس سے میں محبت کرتا تھا اور میں اتنا پاگل تھا کہ ان لوگوں نے اکسایا اور میں ان کی سنتا رہا۔"

وہ کبیر خان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں اتنا غصہ تھا کہ کبیر خان پریشان ہو گیا۔
"اور پھر اپنے بیٹے کا پھیلایا گند سمیٹنے کے لیے اردشیرازی نے مجھے ہمیشہ کے لیے ان دیکھی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ جانتے ہیں بابا یہ کس وجہ سے ہوا؟ یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا۔ آپ کی نام نہاد دشمنی اور اصولوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ آپ نے اپنی دشمنی پر اپنا بیٹا قربان کر دیا۔ میری ماں اس غم میں دنیا چھوڑ گئی۔ بتائیں میں کیا کروں؟ کیا کروں کہ مجھے سکون ملے؟ میں آپ کو دیکھتا ہوں تو مجھے غصہ آتا ہے۔ میں معاویہ اور اردشیرازی کو دیکھتا ہوں تو میرا دل کرتا ہے میں ان کی حقیقت دنیا کو چیخ چیخ کر بتاؤں...... کہ یہ صاف شفاف، ٹپ ٹاپ نظر آنے والے لوگ جن کے لباس پر ڈھونڈنے پر بھی کوئی سلوٹ نہ ملے، وہ اپنے اندر کتنی کالک سمیٹے ہوئے ہیں۔
آپ لوگوں نے اپنے اپنے انتقام کے چکر میں کسی دوسرے کا خیال ہی نہیں کیا۔
معاویہ نے نہیں سوچا کہ اس کے انتقام کا اس کی فیملی پر کیا اثر ہوگا۔
آپ نے میری محبت اپنی دشمنی کی بھینٹ چڑھا دی۔
اور اردشیرازی نے ہم سب کو اپنے بیٹے پر قربان کر ڈالا۔"
"پاشا تم نے کبھی مجھے شہر بانو کے بارے میں نہیں بتایا تھا ورنہ میں ضرور کچھ کرتا۔"
"آہ...... کاش میں آپ کو جانتا نہ ہوتا تو ضرور آپ کی اس بات پر یقین کر لیتا۔ اگر میں آپ کو اس کے بارے میں بتاتا تو مجھے یقین ہے کہ مجھ سے پہلے آپ خود اسے مار ڈالتے۔ آپ کے لیے آپ کے مالکان اور آپ کی دشمنی سے زیادہ اہم کچھ نہیں رہا۔ نہ آپ کا بیٹا، نہ آپ کی بیوی اور نہ ہی ان کی خوشیاں۔"
"تم کیا چاہتے ہو پاشا! میں کیا کروں تمہارے لیے۔ جو تمہیں باپ کی محبت پر یقین آ جائے۔"
"آپ کو لگتا ہے اب میں کچھ چاہ سکتا ہوں۔ میں زندہ بھی نہیں ہوں۔ چلتی پھرتی لاش بن چکا ہوں۔ اپنی بے وقوفی میں، میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے ختم کر دیا جسے اتنا چاہا تھا کہ اپنا آپ قربان کر ڈالنے کو دل چاہتا تھا بابا۔ بتاؤ اب میں کیا چاہوں۔ کیسے چاہوں؟ بتاؤ میں کیسے اس گناہ کے لیے خود کو معاف کر ڈالوں۔" وہ روتے ہوئے بول رہا تھا۔
اس کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلتے ہوئے الفاظ کبیر خان کو تکلیف دے رہے تھے۔
"میں نے سوچ لیا ہے۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔" پاشا نے رک رک کر کہا۔ "مجھے سکون چاہیے اور وہ کم از کم یہاں ملنا ممکن نہیں۔ آپ رہیے یہاں سکون سے۔ ویسے بھی معاویہ تو ہے ہی یہاں آپ کے لیے۔ مجھے بھولنے کے لیے آپ کو زیادہ تردد نہیں کرنا پڑے گا۔"
کبیر نے اسے روکنا چاہا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتا ہے لیکن پاشا اس کا ہاتھ جھٹک کر وہاں سے چلا گیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

کبیر اس کے پیچھے فلک بوس سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

"تم نے پاشا کو شہر بانو کے قتل پر اکسایا تھا؟" منفرا نے متفکر سے انداز میں پوچھا تھا۔
"یہ تمہیں آئے کت نے کہا ہے یا پاشا نے؟" معاویہ حیران نظر آ رہا تھا۔
"ک...... کبیر بابا نے۔" منفرا نے اٹک کر بتایا۔
"کیا مذاق ہے۔" معاویہ بھڑک اٹھا۔ "تمہیں میرے پیچھے کیا کیا بتایا گیا ہے؟ ذرا تفصیل سے بتاؤ اور تمہیں یہ کیوں لگا کہ میں نے آئے کت کو دس سال یہاں قید کر کے رکھا ہے؟ کیا آئے کت نے کہا ہے تمہیں؟"
اور منفرا نے اسے ایک ایک بات تفصیل سے بتا دی۔
"مائی گاڈ۔" معاویہ ہکا بکا سب سن رہا تھا۔ "پہلی بات یہ کہ میں نے آئے کت کو کچھ ماہ بعد ہی یہاں سے جانے کا کہہ دیا تھا۔ میں نے کبیر بابا کو یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ وہ آئے کت کو اپنی نگرانی میں یہاں سے نکالیں گے۔ دوسرا یہ کہ میں نے پاشا کو قتل کرنے کا نہیں کہا تھا۔ ہاں میں اپنے بھائی کا بدلہ لینے کے لیے پاگل ہو رہا تھا۔ اسی پاگل پن میں، میں نے پاشا کو بھی کہا کہ اسے اپنی محبت کی بے قدری کا بدلہ لینا چاہیے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ جا کر اس لڑکی کو موت کے گھاٹ اتار دے۔ بلکہ جب اس نے یہ سب کر دیا تو میں نے اس سے خفگی کے باوجود اسے یہاں سے باہر بھجوا دیا کیونکہ میں کسی نہ کسی حد تک خود کو اس سب کا ذمہ دار سمجھتا ہوں۔" معاویہ بولنے پر آیا تو بولتا ہی چلا گیا۔
"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کبیر بابا نے آئے کت کو یہاں سے نکالا کیوں نہیں اور پھر یہ سب جھوٹ؟"
"مجھے لگتا ہے معاویہ! کچھ غلط ہو رہا ہے۔ کہیں نہ کہیں کچھ بہت غلط ہے۔ میں نے آئے کت کو دیکھا ہے۔ اس کا حال بہت برا تھا۔ وہ ذہنی مریضہ بن چکی تھی۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ تم یہ سب کر سکتے ہو کسی کے ساتھ بھی۔ چاہے وہ تمہارا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔"
"وقتی غصہ تھا منفرا۔ انسان تھا میں۔ کوئی فرشتہ نہیں اور، اور سچ تو یہ ہے کہ ہاں میں محبت کرنے لگا تھا اس سے۔ اٹک گیا تھا میں وسامہ اور آئے کت کی محبت کے درمیان۔ لیکن کب تک۔۔۔ بھائی کی محبت کا پلڑا بھاری ہی لیکن غصہ اترنے کے بعد میں کب تک اسے اس بدلے کی آگ میں جھونک سکتا تھا۔"
معاویہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ منفرا کو وہ آنسو اپنے دل پر گرتے ہوئے محسوس ہوئے۔
وہ آگے بڑھی اور اس نے معاویہ کو ساتھ لگا لیا۔ اس سے زیادہ وہ فی الحال کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی اپنی آنکھوں سے بھی پانی بہہ نکلا۔
اب کی بار وہ دونوں محبت کے مرنے پر مل کر رو رہے تھے۔
"مجھے کبیر بابا سے بات کرنا ہوگی۔" معاویہ نے کچھ دیر بعد اٹھتے ہوئے کہا۔
پھر پورا فلک بوس چھان مارا لیکن کبیر بابا یا پاشا کا کچھ پتا نہیں تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اردشیرازی نے معاویہ اور منفرا کو اپنے کمرے میں بلا بھیجا۔ انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پانچ منٹ بعد ہی دروازے پر دستک دینے کے بعد معاویہ اور منفرا اندر داخل ہوئے۔
اردشیرازی سنگل صوفہ پر، گود میں لیپ ٹاپ رکھے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ ان کی آنکھیں تو اسکرین پر تھیں لیکن دماغ کسی خیال میں الجھا ہوا تھا۔ دستک کی آواز پر وہ چونک کر دروازے کی جانب متوجہ ہوئے۔ کمرے میں داخل ہوتے بیٹے اور بہو کو دیکھ کر انہوں نے بے حد سنجیدگی سے ان دونوں کو سامنے پڑے

صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود لیپ ٹاپ بند کر کے سامنے پڑے میز پر رکھ دیا۔
آنکھوں پر لگا باریک سا چشمہ انہوں نے اتار کر اپنی آنکھوں کو سہلایا۔ ان کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ساری رات جاگتے رہے ہیں۔

''تم لوگوں کا واپسی کا کیا پلان ہے؟'' معاویہ اور منفرا کے بیٹھتے ہی اردشیرازی نے بلاتمہید سوال کیا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں آج شام یا زیادہ سے زیادہ کل صبح تک واپسی کے لیے نکل جاؤ۔ بلکہ اچھا ہے کہ تم لوگ کچھ عرصہ کے لیے مونٹوک چلے جاؤ۔ معاویہ کو بھی کام سے کچھ آرام مل جائے گا اور منفرا تم اپنے پیر سے مل لینا۔''

منفرا نے کن اکھیوں سے معاویہ کی جانب دیکھا۔ وہ دونوں ہی جانتے تھے کہ اردشیرازی مشورہ نہیں ما رہے تھے۔ یہ سیدھا سادا حکم تھا۔ ایسا حکم جس سے بالکل مخالف فیصلہ وہ کل رات کر چکے تھے۔

آئے کت کے جانے کا دکھ تھا یا منفرا کی باتوں کا اثر۔ معاویہ نے کل رات فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ پولیس کو سب دے گا۔ اس کے بعد اس کے ساتھ کیا ہوگا، اس بارے میں اس نے سوچنے کی زحمت نہ کی تھی۔ ہاں منفرا اور اپنے بچ کے لیے وہ ضرور پریشان ہوا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اردشیرازی اس کے بچوں اور بیوی کو پناہ دے دیں گے۔

وہ منفرا کو اس بارے میں صبح آگاہ کر چکا تھا۔ منفرا چپ چاپ اس کی شکل تکتی رہی۔ اس کا ذہن اس حد مفلوج تھا کہ وہ نہ معاویہ کے فیصلے کو سراہ سکی تھی نہ ہی مخالفت کر پائی۔

آئے کت کے بارے میں جاننے کے بعد اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ معاویہ کے خلاف جا اسے بچانے کی کوشش کرے۔ اس کے اندر کی اچھائی اسے اکسا تی تھی کہ سب بھول کر صرف ایک اچھا انسا ہونے کا ثبوت دے اور ساری حقیقت دنیا کے سامنے لائے لیکن وہ انسان تھی فرشتہ نہیں کہ اپنے مفادات کو طور پر نظر انداز کر پاتی۔ اپنی ذات سے ہٹ کر اس وقت اسے اپنے بچوں کا خیال تھا اور جہاں تک اس کی ذات تھی تو اس پوری کہانی میں وہ اپنا کردار سمجھنے سے قاصر تھی۔

وہ فلک بوس میں کیوں تھی۔

وہ معاویہ کی زندگی میں کیوں تھی۔

شاید اب ساری زندگی اسے اس کیوں کے پیچھے ہی بھاگتے رہنا تھا۔

''بابا...... میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔'' معاویہ کی آواز منفرا کو اس کی سوچ کے دائرے سے باہر کھینچ لائی
وہ دونوں ہی جانتے تھے کہ اردشیرازی کو اس فیصلے کے حق میں قائل کرنا تقریباً ناممکن تھا۔

''کیسا فیصلہ؟'' اردشیرازی محتاط سے انداز میں پوچھ رہے تھے۔ معاویہ کا انداز انہیں کھٹک رہا تھا۔

''آپ نے مجھ سے ابھی تک کچھ بھی نہیں پوچھا؟ کیا آپ نہیں جاننا چاہتے کہ وہ کون تھی جو کل۔'' معا نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''تم جو بتانا چاہتے ہو۔ وہ بتاؤ۔ مجھے جو پوچھنا ہوگا اس کے بعد پوچھ لوں گا۔'' اردشیرازی سنجیدگی سے بولے

''وہ لڑکی آئے کت تھی۔'' معاویہ نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔ اتنا کہہ کر وہ باپ کے چہرے کو کھوجنے لگا وہ ہمیشہ کی طرح بے تاثر ہی تھا۔

''جانتا ہوں۔'' اردشیرازی نے اسے اپنا چہرہ کھوجتے دیکھ کر کہا تھا۔

اور پھر معاویہ نے انہیں سب سچ بتا دیا تھا۔ اپنی شادی کی رات سے، اس کے اغوا تک سے لے کر آزاد کرنے تک ایک ایک بات اس نے باپ کو بتائی۔ وہ چپ چاپ اس کی بات سنتے رہے۔

''بابا آپ یقین کریں میں نے اسے کچھ عرصے بعد ہی یہاں سے جانے کا کہہ دیا تھا۔ لیکن اب مجھے پتا چلا ہے کہ وہ دس سال سے یہاں تھی۔ کیوں؟ کس لیے؟ کیسے؟ کسی ایک سوال کا جواب بھی میرے پاس نہیں ہے۔ بیر بابا نے ان لوگوں سے کہا ہے کہ وہ میرے آرڈر پر یہاں قید تھی اور اب جب میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں تو وہ یہاں سے غائب ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں پولیس کو سب بتا دوں گا۔ ایک ایک بات۔ اس کے بعد جو بھی ہوگا میں دیکھ لوں گا۔'' بات کے اختتام تک معاویہ کی آواز سے غصہ چھلکنے لگا۔

''تمہارے سب سوالوں کے جواب میرے پاس ہیں۔ وہ لڑکی آئے کت تھی میں جانتا ہوں۔ وہ یہاں تمہارے آزاد کرنے کے بعد بھی قید رہی کیونکہ یہ میرا آرڈر تھا۔ سو اب تم پولیس کے پاس جا کر کیا کہو گے کہ تمہارے باپ نے اتنا عرصہ ایک لڑکی کو یہاں قید کر کے رکھا تھا؟'' اردشیرازی نے سگار سلگاتے ہوئے پرسکون لہجے میں ان دونوں کے سر پر بم پھوڑا تھا۔ وہ دونوں ہی حیران پریشان ان کی شکل دیکھ رہے تھے۔

''میں تمہارا باپ ہوں معاویہ! تمہیں کیسے لگا کہ تم مجھ سے کچھ چھپا سکو گے۔ تمہیں کیوں لگا کہ تم میرے علم میں لائے بغیر کسی کو یہاں قید کر دو گے اور مجھے معلوم نہیں ہو سکے گا۔ تم کیسے بھول گئے کہ کبیر خان تمہارا خدمت گار سہی لیکن اپنی سیلری وہ مجھ سے ہی لیتا ہے۔ تمہیں لگا وہ مجھ سے غداری کرے گا اور تم سے وفاداری نبھائے گا۔'' انہوں نے سگار کا کش لیا اور بات کو پھر سے جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''مجھے حیرت ہے کہ تم نے ایسا سوچا بھی کیسے؟''

منفرا کا دل چاہا وہ وہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے۔ اسے اپنا آپ دو ذہنی مریضوں کے درمیان پھنسا ہوا لگ رہا تھا۔

''کیوں کیا آپ نے ایسا۔ جب مجھ پر یقین نہیں تھا تو کیوں آئے اس معاملے میں۔'' سرد مہری معاویہ کے چہرے سے جھلکنے لگی تھی۔

''میں نے کہا نا معاویہ! تم میرے بیٹے ہو اور میں یہ کیسے برداشت کر لیتا کہ وہ دو ٹکے کی لڑکی میرے بیٹے کے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کرے۔ میں تمہاری شادی سے پہلے بھی یہ سچ جانتا تھا کہ وہ لڑکی کرپٹ ہے۔ لیکن تم نے میری بات نہیں مانی۔ ایکسپیریمنٹ کرنا اچھی بات ہے۔ ایکسپیرینس آتا ہے اس چیز سے۔ سو میں نے تمہیں روکا نہیں مگر ایک بات جان لو کہ اگر اس رات تم اس لڑکی کو غائب نہ کرتے تو یہ کام میں کرتا لیکن اپنے بیٹے کو اس کرپٹ عورت کے لیے ضائع نہ ہونے دیتا۔''

معاویہ نے ایک آہ کے ساتھ صوفے کی پشت سے کمر ٹکا لی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

''آپ ہمیشہ سے جانتے تھے کہ وسامہ کی موت کے پیچھے آئے کت کا ہاتھ ہے؟''

''ہمیشہ سے تو نہیں لیکن تمہاری شادی کے فیصلے کے بعد جان گیا تھا۔ کبیر خان نے مجھے بتا دیا تھا۔'' وہ اطمینان سے بولے۔

''پھر تو آپ یہ بھی جان گئے ہوں گے کہ میں آئے کت سے محبت کرتا تھا؟'' معاویہ طنزیہ انداز میں بولتے ہوئے جیسے منفرا کی موجودگی کو مکمل فراموش کر گیا۔

اردشیرازی نے ایک نظر منفرا پر ڈالی اور پھر سرد مہری سے کہا۔

''وہ تو تم وسامہ سے بھی کرتے تھے، لیکن اس کی محبت تم آئے کت کے لیے فراموش کر بیٹھے اور آئے کت کی محبت کو منفرا کے لیے۔ فی زمانہ محبت کوئی اتنا ٹھوس جذبہ نہیں رہ گیا معاویہ کہ اس کے لیے تم رانجھا یا مجنوں بن جاتے۔ یہ اکیسویں صدی ہے جس میں محبت بھی سوچ سمجھ کر کی جاتی ہے۔''

معاویہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”کاش آپ نے یہ سب کرنے کے بجائے مجھے روکا ہوتا تو شاید آج میرے دل پر اتنا بڑا بوجھ نہ ہوتا۔“ اپنی بات کہہ کر کمرے سے نکل گیا تھا۔ منفرا کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ معاویہ کے پیچھے جاتی۔ وہ چپ چاپ وہاں ہی بیٹھی رہی تھی۔

”منفرا بیٹا! میں جانتا ہوں کہ اس بارے میں جاننا تمہارے لیے تکلیف دہ ہے۔ معاویہ جذباتی ہو رہا ہے لیکن تو عقل مند ہو۔ سمجھاؤ اسے۔ پولیس کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اول وہ اس کی کسی بات پر یقین نہیں کریں گے۔ وسامہ کی موت کی وجہ خواب آور دوائیوں کی زیادہ مقدار بتائی گئی تھی۔ یہ پولیس کے پاس جا کر سچ بھی بتائے گا تو بھی کوئی اس کی بات نہیں مانے گا اور ہر حال میں معصوم آئے کت ہی کہلائے گی۔ سارا مسئلہ ہم دونوں کے لیے کھڑا ہو جائے گا۔ جو میں ہونے تو نہیں دوں گا پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ وہ یہ باب پھر سے نہ کھولے۔ عزت کمانے میں سال لگتے ہیں، گنوانے کے لیے ایک لمحہ کافی ہوتا ہے۔ میں اسے بچا بھی لوں تو بھی ہمارے نام پر ایک دھبہ ضرور لگ جائے گا۔ جو میں بالکل نہیں چاہتا۔“ ایک لمحے کے توقف سے انہوں نے بات مکمل کی۔

منفرا کچھ نہیں بول پائی۔ دل ہی دل میں وہ جانتی تھی کہ اردشیر ازی وہی کریں گے جو وہ کہہ رہے تھے۔ تھوڑی رشوت، تھوڑے تعلقات اور سب کچھ ان کے حق میں چلا جائے گا لیکن ان کی نام نہاد عزت پر ضرور دھبہ لگ جائے گا۔

”یہ لڑکا...... کیف...... یہ کب سے یہاں ہے؟“ انہوں نے منفرا کی خاموشی کو رضامندی جان کر اگلا سوال کیا۔

”پانچ، چھ دن سے۔ خوش نصیب کا کزن ہے۔“ منفرا نے آہستہ سے بتایا۔ پھر وہ کیف کو یہاں بلانے کی وجہ بتانے لگی۔

”یعنی وہ بھی آئے کت اور اس کی کہانی سے واقف ہے؟“ اردشیر ازی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”جی۔ اسی نے آئے کت کو ڈھونڈا تھا فلک بوس میں۔“ منفرا نے کیف کے بارے میں چھپانا مناسب خیال نہیں کیا۔

”کوئی مسئلہ تو کری ایٹ نہیں کرے گا؟“ اردشیر ازی نے بغور منفرا کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”صحافی ہے۔“ منفرا نے آہستہ سے کہا۔ ”مگر میں سمجھا دوں گی ان لوگوں کو۔ کوئی مسئلہ نہیں کریں گے۔“ جانے منفرا کو کیا خیال آیا کہ اس نے فوراً ہی بات کو بڑھایا تھا۔

”ہم م م...... ٹھیک ہے۔ تم اپنے لفظوں میں سمجھا دینا اور اگر نہ سمجھے تو میں انہیں بھی سنبھال لوں گا۔“ ان کے لہجے میں چھپی دھمکی اور لفظوں میں چھپا مفہوم منفرا سے پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ اسے ایک لمحے کے لیے اردشیر ازی سے خوف محسوس ہوا۔

”ٹھیک ہے بیٹا! تم جاؤ اور معاویہ کو سمجھاؤ۔ میں مزید اس معاملے کو کھینچنا نہیں چاہتا اور نہ ہی میں کسی اور کو اس کام کی اجازت دوں گا۔“

انہوں نے منفرا کو جانے کی اجازت دیتے ہوئے اپنا ارادہ مکمل طور سے اس پر واضح کر دیا تھا۔

☆☆☆

وہ ایک چمکتی ہوئی صبح تھی۔

کئی دن کی ناراضی کے بعد آخرکار آج سورج نے اپنی شکل دکھا دی تھی۔

وادی، پہاڑ، درخت...... حتیٰ کہ جہاں بھی نظر جاتی، جمی ہوئی برف پڑی نظر آتی جو سورج کی کرنوں میں چمکتی دکھائی دیتی تھی۔

وہ کچھ دیر پہلے ہی آئے کت کی قبر پر دعا کی غرض سے آئی تھی۔ دعا سے فارغ ہو کر جب دل واپس فلک

ں جانے کو راضی نہ ہوا تو وہ کچھ فاصلہ پر ایک ایسے کنارے پر آ بیٹھی جو پہاڑ کی آخری حد تھی۔

اس حد سے نیچے، بہت نیچے سندھ کا دریا تیزی سے بہتا تھا۔ وہ چپ چاپ جمے پانی پر نظر ٹکائے بیٹھی تھی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ جسمانی طور پر تو وہاں موجود ہے لیکن ذہنی طور پر وہ کہیں بہت دور پہنچی ہوئی تھی۔

آئے کت کو دنیا سے گئے تین دن گزر چکے تھے اور اس کی موت نے اسے بہت بے سکون کر دیا تھا۔ دل ہی دل میں وہ خود کو اس کی موت کا ذمہ دار سمجھ رہی تھی۔ اس سے کی گئی بحث اب تک اس کے دل و دماغ میں تازہ تھی اور وہ چاہ کر بھی اس سب کو بھول نہیں پا رہی تھی۔

آئے کت سے اس کا دور دور تک کوئی رشتہ نہیں تھا سوائے انسانیت کے اور اسی رشتے کے تحت اس نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔ اگر اسے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ وہ اپنی بات ثابت کرنے کے لیے ایسا کچھ کر بیٹھے گی تو شاید وہ بھی اسے کچھ سمجھانے کی غلطی نہ کرتی۔

ہوا میں خنکی تھی۔ وقفے وقفے سے چلتی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے، خون کو جما دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

ایسے ہی ایک جھونکے کے نتیجے میں خوش نصیب نے جھرجھری لے کر اپنے کندھوں پر پڑی شال کو کچھ اور مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹ لیا۔

ستا ہوا چہرہ، روئی روئی آنکھیں۔۔۔ سرخ ہوئی ناک اس جھونکے سے کچھ مزید سرخ ہو گئی تھی۔

ہوا سے بے قابو ہو کر اپنے چہرے پر بکھرے بالوں کو اس نے دوبارہ سے کانوں کے پیچھے اڑس لیا اور اسی عمل کے دوران اسے احساس ہوا تھا کہ اس کے ہاتھ بالکل سن ہو چکے ہیں۔

نیچے دریا کے کنارے کچھ بچے کھیلتے پھر رہے تھے۔ ان کی ہنسی کی آواز ہوا کا حصہ بن کر اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ انہیں دیکھتے دیکھتے ایک غم زدہ سی مسکراہٹ اس کے چہرے کا حصہ بن گئی۔ اسے بہت کچھ یاد آ گیا۔

روشن امی۔۔۔

ماہ نور۔۔۔

عرفات ماموں۔۔۔

اپنا بچپن۔۔۔ اور اپنے نام سے منسلک بہت سے قصے جو اسے منحوس ثابت کرتے تھے۔

اسے فضل منزل آج شدت سے یاد آ رہی تھی۔

اسے صیام یاد آئی تھی۔۔۔ طوطا بھائی یاد آئے تھے۔ حتیٰ کہ آج تو فضیلہ چچی بھی یاد آ رہی تھیں۔

اور پھر اسے شامیر یاد آیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر وہ مسکراہٹ بھی دم توڑ گئی۔

اس کا دل ماہ نور کے لیے بے تاب ہو گیا۔ وہ ماہ نور سے ناراض تھی۔ بہت زیادہ ناراض اور تمام تر خفگی کے باوجود وہ واحد کام جو وہ کر سکتی تھی اس نے کیا تھا۔ آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے بہت دل سے اپنی بہن کی سلامتی اور خوشیوں کی دعا مانگی تھی۔

”اگر تم مرنے کے ارادے سے یہاں بیٹھی ہو تو پلیز مجھ پر ہی مر مٹو۔ ٹھنڈ سے مرنے کی کیا ضرورت ہے۔“

خوش نصیب، کیف کی آواز سے بُری طرح چونکی جو اس لمحے اس کے ساتھ آ بیٹھا تھا۔ وہ گڑبڑاتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کیف کو شدت سے اس کے غیر حاضر ہونے کا احساس ہوا۔ شاید وہ اس کی بات کو بھی سمجھ نہیں پائی تھی، ورنہ شاید خود نہ مرتی لیکن اسے یہاں سے ہی دھکا دے کر ضرور مار دیتی۔

خوش نصیب نے کوئی بھی تاثر دیے بغیر چہرہ موڑ لیا۔ اس کی نظروں کا مرکز ایک بار پھر سے دریا کنارے کھیلتے بچے تھے۔

''کیا میں نے تمہیں ڈرا دیا؟'' کیف نے نرمی سے پوچھا۔
اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''ہاں......شاید......تھوڑا سا۔''
کیف لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد پہلے سے زیادہ نرمی سے بولا۔ ''آئی ایم سوری۔''
خوش نصیب نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ایسے معافی مانگ لینا اس کی سرشت میں شامل نہیں تھا خاص پر خوش نصیب سے معافی مانگنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔
''اینڈ آئی ریلی مین اِٹ۔'' کیف نے اس کی آنکھوں میں موجود حیرت کو بھانپتے ہوئے دفاعی انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بات مکمل کی تھی۔
''اٹس اوکے۔ میرا ہی دھیان کہیں اور تھا۔'' وہ پھر سے دوسری طرف دیکھنے لگی۔
''اور وہ ''کہیں اور'' یقیناً میں تو نہیں ہو سکتا۔'' کیف نے مسکراتے ہوئے تبصرہ کیا۔
خوش نصیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ الجھی ہوئی لگتی تھی۔
''بھول جاؤ جو کچھ بھی ہوا ہے۔ جو کچھ بھی ہوا کم از کم اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے۔'' کیف نے اس بار سنجیدگی اختیار کی۔ وہ جیسے اس کی سوچ تک رسائی حاصل کر چکا تھا۔
''میں اسے بھول نہیں پا رہی کیف! یہ احساس مجھے پرسکون ہونے نہیں دے رہا کہ مجھے غلط ثابت کرنے کے لیے اس نے اپنی جان لے لی۔ میں......میں......تو بس......اس کی مدد کرنا چاہتی تھی۔'' خوش نصیب کی آواز بھرا گئی۔ رک رک کر بہت مشکل سے اپنی بات مکمل کر پائی تھی۔ آنسوؤں کا گولہ حلق میں اٹک کر رہ گیا تھا۔
''میں جانتا ہوں خوش نصیب! کہ تم اس کی مدد کرنا چاہتی تھیں۔ شاید دنیا کو تمہارا طریقہ غلط لگے مگر تمہاری نیت صاف تھی۔ ویسے بھی جس انسان کو تم جانتی تک نہیں تھیں۔ جس سے دور، دور تک تمہارا کوئی واسطہ نہیں اسے جان بوجھ کر نقصان کیوں پہنچاؤ گی تم۔'' کیف وہ بول رہا تھا، جو وہ سننا چاہ رہی تھی۔
''تم پریشان مت ہو اور نہ ہی تمہیں ڈرنے کی ضرورت ہے۔ بس ایک بات یاد رکھو میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں۔'' کیف نے اس کا ہاتھ ہاتھ تھامتے ہوئے کہا تھا۔
خوش نصیب اس کی آخری بات پر اس کی شکل دیکھ کر رہ گئی پھر اس نے نرمی سے اپنا ہاتھ واپس کھینچ کر گود میں رکھ لیا تھا۔ کیف نے لمحہ بھر کے لیے اپنے خالی رہ جانے والے ہاتھوں کو دیکھا اور پھر جیسے زبردستی مسکرا دیا۔
''مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کیف۔ آئے کت نے وسامہ کے بارے میں بتاتے ہوئے کئی جگہ ایسے سایوں کا ذکر کیا تھا جو وسامہ نے فلک بوس میں دیکھے تھے۔ اس نے یہاں تک کہا تھا کہ وہ سائے دیواروں میں سے گزر جاتے تھے۔ اگر آیو قسمتی آئے کت ہی تھی اور وہ انسان تھی تو وہ سائے کس کے تھے؟''
کیف مسکرایا۔ ''تم پھر سے کنفیوز ہو رہی ہو۔''
''میں صرف جاننا چاہتی ہوں۔''
''دیکھو یار! کنفرم تو میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا مگر میں نے کہیں پڑھا تھا اور میرا اپنا تجربہ بھی ہے کہ انسان جب بہت زیادہ خوف زدہ ہوتا ہے تو اس کی حسیات پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے کام کرنے لگتی ہیں۔ اسے اس کے اردگرد کی چیزیں سلوموشن میں کام کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ بالکل کسی فلم کی طرح۔ ایسے میں اسے وہ چیزیں بھی دکھائی دیتی ہیں جو اصل میں موجود نہیں ہوتیں۔ جو اس کے لاشعور کا حصہ ہوتی ہیں، شعور کا نہیں۔ وسامہ کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ جب وہ خوف زدہ ہوتا تھا تو اسے اپنے اردگرد وہ سب اصل میں محسوس ہوتا تھا جو وہ سلیپ پیرالائز اٹیک کے دوران دیکھ یا محسوس کر رہا ہوتا تھا۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

خوش نصیب نے بغور اس کی بات سنی تھی۔ دونوں ایک بار پھر اپنی سوچ میں گم ہو گئے تھے۔ خاموشی ان کے درمیان آ کر بیٹھ گئی تھی۔ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ایک دوسرے کو پکڑنے کی کوشش میں نڈھال وہ بچے ان دونوں کی نگاہوں کا مرکز بن گئے تھے۔ کیف بھی جیسے خوش نصیب کی طرح اپنے بچپن میں جا پہنچا تھا۔
''میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔'' وہ خوش نصیب کی آواز پر چونک کر حال میں واپس آیا تھا۔
''کک......کہاں؟''
''مجھے نہیں پتا۔ مگر میرے لیے اب اس جگہ پر مزید رہنا ممکن نہیں ہے۔'' وہ تھکے تھکے سے انداز میں بات کر رہی تھی۔
''مجھے خوف آنے لگا ہے فلک بوس سے۔ سب سے بڑھ کر میں معاویہ اردشیرازی کو دیکھنا نہیں چاہتی۔ م......مجھے اس انسان سے ڈر لگنے لگا ہے بلکہ......مجھے وہ انسان لگتا ہی نہیں ہے۔'' بات کے اختتام تک اس کی مدھم آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔ خوف اس کی شکل سے ہی نہیں اس کے ہر، ہر انداز سے ظاہر ہوتا تھا۔ کیف کو اس پر ترس آنے لگا۔
''میرے ساتھ واپس چلو خوش نصیب! وہاں سب تمہارے منتظر ہیں اور اپنے کیے پر شرمندہ بھی۔'' اس نے پھر سے کہا۔
''بالکل نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔'' اب کی بار اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔ ''یہ جاننے کے بعد کہ وہ شامیر بھی وہاں موجود ہے۔ چاہے اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہو چکا ہو۔ پھر بھی تم مجھے کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں وہاں چلوں جب کہ اب تو تم سچ بھی جان چکے ہو۔'' وہ بہت غصے سے بول رہی تھی۔
''تم شامیر کے لیے واپس نہیں جاؤ گی۔ تم ماہ نور کے لیے واپس جاؤ گی۔ سب سے بڑھ کر میرے لیے واپس چلو۔ ویسے بھی مسز معاویہ نے مجھے اس رات تمہارے کیے ہوئے اقرار کے بارے میں بتایا ہے جس رات میں گم ہو گیا تھا۔ نصیبن۔'' کیف مسخرے پن سے بول رہا تھا۔
خوش نصیب کو منفرا سے اس غداری کی امید نہیں تھی اس لیے سٹ پٹا کر رہ گئی۔
''مجھے نصیبن مت کہا کرو کیف کے بچے۔''
''جان کہہ لیا کروں؟'' معصومیت سے پوچھا گیا۔
''میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی اگر تم ایسا کہو گے تو۔'' خوش نصیب چیخی۔
''بالکل......مجھے پورا یقین ہے تم ایسا ہی کرو گی۔'' کیف نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ڈرنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔
''اور میں چاہتا ہوں کہ جیسے مجھے تم پر یقین ہے ویسے ہی تم مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں خوش نصیب! میں تمہیں وہ سب واپس دلواؤں گا جو تم سے چھینا گیا تھا اور دوبارہ کبھی تمہیں اپنے حوالے سے مایوس ہونے نہیں دوں گا۔''
وہ بے حد جذب سے بول رہا تھا۔ خوش نصیب کو اپنا دل پگھلتا ہوا محسوس ہوا مگر مجروح ہوا اعتبار اتنی جلدی واپس حاصل ہو پاتا تو کیسے۔
''کیف! تم مجھے میری ماں واپس نہیں دلا سکتے۔ تم چاہو بھی تو میرا احساسِ زیاں کم نہیں کر سکتے۔ سب سے بڑھ کر میں ایک بار اپنے کردار پر بہت کچھ سن چکی ہوں۔ دوبارہ میری ہمت نہیں ہے وہ سب سننے کی۔ اگر لوگ..

شامیر کے حوالے سے بات نہیں کریں گے تو ان تین سالوں کے بارے میں جواب مانگیں گے اور میری گو دینے والا جا چکا ہے دنیا سے۔ ماموں حیات ہوتے تو اور بات تھی لیکن اب۔"

"میں...... میں دوں گا تمہاری گواہی۔ مجھے تمہارے کردار پر ذرہ برابر بھی شک نہیں ہے اور میں مانتا ہوں روشن چچی کو واپس نہیں لاسکتا مگر تم اپنی بہن کو واپس حاصل کرسکتی ہو خوش نصیب۔ تم ہماری کھوئی ہوئی دوستی کو واپس سکتی ہو۔ جہاں سب کچھ ہاتھوں سے پھسل رہا ہو نا، وہاں اس دکھ میں ہاتھ آتی چیز کو گنواتے نہیں ہیں خوش نصیب۔"

"تم ایموشنل ہو رہے ہو اور تم یہ بات جانتے ہو۔"

"میں سب جانتا ہوں۔ مگر تم یہ نہیں جانتیں کہ ان تین سالوں میں، میں کبھی تم سے غافل نہیں ہوا۔ ہم ہمیشہ تم سے یہ بات چھپائی کہ اسلام آباد میں تمہارے ایڈمیشن کا کام میں نے کروایا تھا۔ میں تمہارے سامنے نہیں تھا مگر تم سے غافل بھی نہیں تھا۔ ماموں سے ہمیشہ میں تمہارے بارے میں جانتا رہا۔ مجھ سے بس یہ غلطی ہوئی کہ میں نے کبھی ان سے تمہاری رہائش کے بارے میں نہیں پوچھا۔ ماموں کے جانے کے بعد جب تک میں رضوی صاحب کے گھر کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوسکا تم اور وہ لوگ وہاں سے جاچکے تھے۔ اگر تمہیں میری بات یقین نہیں ہو تو میں تمہیں وہاں لے جاتا ہوں۔ تم وہاں پڑوس میں پوچھ لینا اور اس مال سے بھی جہاں تم جاب کرتی تھیں۔ میں ہر جگہ تمہیں ڈھونڈتا رہا ہوں۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر خوش نصیب کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

"میرا یقین کرو۔ مجھے ایک موقع دو۔ پلیز......"

"کیا چاہتے ہو کیف؟" وہ جیسے بے بس ہوگئی تھی۔

"شادی، میں شادی کرنا چاہتا ہوں تم سے۔" کیف نے بے حد سنجیدگی سے کہا تھا۔

"میرے لیے اتنی جلدی سب بھولنا ممکن نہیں ہے۔" لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے آہستہ سے کہا۔

"میں انتظار کرلوں گا۔" کیف نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔ "مگر پلیز میرے ساتھ واپس چلو۔ وہاں سب اپنے کیے پر شرمندہ ہیں اور سب سے بڑھ کر میں تمہیں پھر سے کھونا نہیں چاہتا۔"

خوش نصیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چپ چاپ متذبذب سی اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہو رہا تھا جو بہنے کو بے تاب تھا۔ کیف اس کے ہاتھ کو تھپکتا رہا۔ اس کی اثبات بھری خاموشی کیف کو پرسکون کرتی چلی گئی۔

"میرا دوست آج شام ہمیں لینے آئے گا۔ چلوگی میرے ساتھ؟" اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہ تھی۔ خوش نصیب آنسو بھری آنکھوں سے اسے تکتی رہی پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

اسی شام زرگل کیف اور خوش نصیب کو لینے آپہنچا۔ انہیں واپسی کے لیے خاص تیاری کی ضرورت نہیں تھی جو تھوڑا بہت سامان تھا، خوش نصیب پہلے ہی سمیٹ چکی تھی۔ منفرا کو وہ دونوں پہلے ہی اس بارے میں اطلاع دے چکے تھے سو بس اب اسے خدا حافظ کہنے آئے تھے۔

دروازے پر ہونے والی دستک سے وہ چونک کر متوجہ ہوئی۔ خوش نصیب اور کیف اجازت ملنے پر اندر داخل ہوگئے۔ منفرا انہیں دیکھ کر بامشکل مسکرائی۔

"ہم واپسی کے لیے نکل رہے تھے۔ اللہ حافظ کہنے آئے ہیں۔" خوش نصیب کہتے ہوئے آگے بڑھی۔ منفرا نے کیف کو سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خوش نصیب کو اس نے ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر بٹھالیا۔

چند لمحے اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

"میں تمہارے لیے بہت خوش ہوں خوش نصیب! تم نے اچھے وقت پر ایک بہترین فیصلہ کیا ہے۔"

خوش نصیب اس کی بات پر مسکرادی۔

"اللہ تمہیں بہت سی خوشیاں دے۔ یہ تمہارے لیے زندگی کی ایک نئی شروعات ہے۔ کوشش کرنا کہ پچھلی تمام باتوں کو بھلا کر آگے بڑھ سکو۔ یہ بندہ تمہارے لیے پاگل ہے۔" اس نے کیف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کوشش کرنا کہ اسے ہمیشہ اپنے پیچھے ایسے ہی پاگل رکھو۔" وہ شرارتی سے انداز میں بول رہی تھی۔

وہ دونوں ہی اس کی بات پر ہنس دیئے۔

"امید کرتا ہوں کہ آپ ایسی ہی ایک دعا میرے لیے بھی مانگیں گی کہ یہ لڑکی بھی میرے لیے پاگل ہو جائے۔" کیف نے اس کی بات کا جواب اس کے ہی انداز میں دیا۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

پھر منفرا سنجیدہ ہوگئی۔

"کیف! یہاں جو کچھ بھی ہوا۔ اسے بھول جانا۔ تم دونوں ہی سب باتیں بھلا دینا۔" وہ دونوں ہی اس کی بات پر حیران ہوئے۔ دونوں ہی اس کی بات کا مفہوم سمجھ گئے تھے۔

"منفرا یہ غلط ہے۔" خوش نصیب نے افسردگی سے کہا۔ کیف چپ رہا۔

"میں جانتی ہوں یہ غلط ہے مگر...... جو ہونا تھا وہ ہوچکا ہے۔ ہر کوئی اپنے کیے کی سزا بھگت چکا ہے اور بھگت رہا ہے۔ تم دونوں نے ایک لمبا عرصہ دکھوں سے لڑتے گزارا ہے۔ اب میں نہیں چاہتی کہ ایسے کسی بھی معاملے میں پڑ کر تم لوگ پھر سے اپنی خوشیاں خود پر حرام کرلو۔ جس کے لیے ہم کچھ کرنا چاہتے تھے وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ کیا اور کیسے پرووو۔ کروگے تم لوگ کہ جو ہمیں معلوم ہوا وہ سب سچ ہی تھا۔" منفرا اتنا اکتا کر بول رہی تھی کہ کیف کو حیرانی ہوئی۔

"تم پولیس کے پاس جاؤ گے۔ انہیں سب بتاؤ گے اور اس کے بعد؟ ثبوت کہاں سے لاؤ گے کیف؟ اپنے آپ کو سچا کیسے ثابت کرو گے؟ تمہارے ایک سچ کے مقابلے میں یہاں دس جھوٹے گواہ پیش کردیئے جائیں گے۔ تم کبھی بھی کچھ بھی ثابت نہیں کرپاؤ گے اور اس کے بعد تمہارا کیا ہوگا؟ تمہیں لگتا ہے اردشیر ازی تمہیں ایسے چھوڑ دیں گے؟ نہیں کیف! تمہارا ایک فیصلہ تمہیں تباہ کرکے رکھ دے گا۔"

منفرا مضطرب دکھائی دے رہی تھی۔

"آپ چاہتی ہیں میں سچ جان کر بھی اسے چھپانے میں آپ سب کا ساتھ دوں؟" کیف سرد سے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"دیکھو۔ میں جانتی ہوں کہ تم ایک اچھے انسان ہو۔ تمہارے لیے سچ کو چھپانا بھی جھوٹ بولنے کے برابر ہے۔ لیکن میں تم سے ریکوئسٹ کرتی ہوں کہ سچ چھپالو۔ اس میں ہم سب کی بہتری ہے اور ہم سب میں تم دونوں بھی شامل ہو۔"

منفرا اگلے دس پندرہ منٹ تک کیف کو قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

"مجھے کیوں لگ رہا ہے منفرا کہ آپ کچھ جان چکی ہیں اور اب ہم سے وہ بات چھپا رہی ہیں؟" خوش نصیب جو بہت دیر سے چپ بیٹھی ان کی باتیں سن رہی تھی یک دم ہی بولی۔

"کیوں کہ کچھ باتوں کا چھپے رہنا بہت سے نقصان سے بچالیتا ہے۔ جیسے آئے کت کی سچائی کا چھپے رہنا۔ تم

لوگ بس یہ جان لو کہ جو کچھ ہمیں معلوم ہوا۔ وہ آدھا واقعہ تھا۔ پورا سچ ابھی بھی تم لوگ نہیں جانتے اور میرا یقین کرو۔ معاویہ قصوروار ہے لیکن اتنا نہیں جتنا ہمیں بتایا گیا تھا۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

"ہم نکلتے ہیں واپسی کے لیے۔" کیف اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

خوش نصیب اور منفرا نے بھی اس کی پیروی کی۔ خوش نصیب بچوں کے کاٹ کے پاس جا کھڑی ہوئی جھک کر دونوں کو پیار کرنے لگی پھر وہ منفرا کی جانب مڑی۔

"آپ تینوں کو بہت مس کرنے والی ہوں۔" اس کی آواز سے اداسی جھلکتی تھی۔

"ہم بھی بہت مس کریں گے خوش نصیب!" منفرا نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا۔ پھر وہ کیف کی جانب مڑی۔ "اس کا بہت خیال رکھنا کیف! اور پلیز اب بچوں کی طرح لڑنا چھوڑ دو۔"

کیف نے مسکرا کر سر ہلایا اور اللہ حافظ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

"خوش نصیب!" منفرا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑا۔ "میرے بارے میں کوئی برا گمان نہ کرنا یقین مانو اگر سچ سامنے لانے کا کوئی فائدہ ہوتا تو میں تم لوگوں کا ساتھ ضرور دیتی۔ لیکن......" وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی تھی۔ "کوشش کرنا کیف کچھ غلط نہ کرے۔"

"میں پوری کوشش کروں گی۔" خوش نصیب نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

منفرا باہر تک اسے چھوڑنے آئی تھی۔ کیف پہلے ہی سامان باہر لا کر گاڑی میں رکھ چکا تھا۔ منفرا کو ہاتھ ہلا کر وہ گاڑی میں جا بیٹھے۔ کیف نے گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے ایک الوداعی نگاہ فلک بوس پر ڈالی۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا آنے کت کی کہانی فلک بوس کے سینے میں ہی دفن کرنی ہے۔

☆☆☆

رکشا گلی میں آ کر رک گیا۔

خوش نصیب نے باہر نکلتے ہوئے ادھر ادھر کا جائزہ لیا۔ سب ویسا ہی تھا۔ بس وہی بدل گئی تھی۔

کیف کرایہ ادا کر کے اس کی جانب مڑا تو وہ گم صم کھڑی گھر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کیف اس کی کیفیت اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا۔ کچھ سال پہلے اسے اس گھر سے ایسے نکالا گیا تھا کہ ہمیشہ کے لیے اس گھر کے دروازے اس پر بند کر دیے گئے تھے۔

اور اب وہ ایسے واپس آئی تھی کہ اس کا سر اٹھا ہوا تھا۔ اس کے آنے سے پہلے اس کی سچائی یہاں آئی تھی۔

"اندر چلیں۔" کیف نے اسے حوصلہ دینے کے لیے اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آجاؤ۔" کیف نے آگے بڑھ کر گھنٹی بجائی۔

دروازہ کھولنے والی فہمینہ تھی۔

"کیف۔" اس نے خوشی سے نعرہ لگایا تھا اور بھائی کے گلے لگ گئی۔

وہ تقریباً تین مہینے بعد بھائی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظر ابھی تک پیچھے کھڑی خوش نصیب پر نہیں پڑی تھی۔

"دیکھو میں کسے ساتھ لایا ہوں۔"

کیف نے مسکرا کر اس کا دھیان پیچھے کھڑی خوش نصیب کی طرف دلایا اور وہ جیسے ساکت ہو گئی۔ اپنی آنکھوں پر یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ خوش نصیب کے گلے آ لگی۔ اس کی گرفت میں ا

تھی کہ خوش نصیب کو اپنا دل پگھلتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ چاہ کر بھی بے رخی کا مظاہرہ نہیں کر سکی۔

وہ دونوں اسے اندر ٹی وی لاؤنج میں لے آئے۔ صابر تایا نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور وہ ان کے گلے ملتے ہوئے رو دی۔ اس کے علاوہ وہ کرتی بھی کیا۔

اس کی نظریں مسلسل ترسی ہوئی نگاہوں سے گھر کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"کاش روشن امی آپ یہاں موجود ہوتیں۔" اس نے دکھی دل کے ساتھ سوچا۔

پھر اس کی نظریں ماہ نور کو تلاش کرنے لگیں۔ آخر کار اس کی تلاش ختم ہو گئی۔ وہ لاؤنج کے دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ باہر کی طرف۔ اس کی آنکھیں خوش نصیب پر جمی ہوئی تھیں۔

اور خوش نصیب...... وہ جیسے پتھر کی ہو گئی۔

"ماہ نور!" اسے یقین نہیں آیا کہ یہ اس کی بہن ہے۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اس کی خوب صورتی ماند پڑ گئی تھی۔ رنگت میں زردی گھلی تھی۔

وہ خود ہی آگے بڑھی اور ماہ نور کے گلے لگ گئی۔ وہ دونوں رو رہی تھیں۔ انہیں بہت سے دکھوں پر مل کر رونا تھا۔

کچھ دیر بعد کیف نے انہیں ڈانٹ کر علیحدہ کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اب جب وہ ایک ساتھ ہیں تو انہیں رو کر اس خوشی کے موقعے کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ وہ کچھ دیر لاؤنج میں ہی ان لوگوں کے ساتھ بیٹھی رہی پھر ماہ نور اسے اپنے ساتھ کمرے میں لے آئی اور وہاں خوش نصیب نے پہلی بار اپنے بھانجے کو دیکھا اور اسے گود میں لے کر اسے ایک اور جھٹکا لگا۔ وہ بچہ نارمل نہیں تھا۔ اس بچے کی ٹانگیں نہیں تھیں۔

"جادو کرنے والوں کی اولاد بھی نارمل نہیں ہوتی خوش نصیب۔" ماہ نور نے بے حس سے انداز میں کہا۔ "اور شامیر کے سر پر تو اور بھی بہت سے گناہوں کا بوجھ ہے۔"

خوش نصیب نے اس کی جانب دیکھا اور کچھ بول نہیں پائی۔ وہ بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ماہ نور آہستہ سے اس کے پیروں کے پاس زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"کیا کر رہی ہو ماہ نور! پلیز......" اس نے خفگی سے ماہ نور کے ہاتھ پکڑ کر کھولے تھے۔

"مجھے معاف کر دو خوش نصیب! اگر تم معاف کر دو گی تو مجھے اللہ بھی معاف کر دے گا۔ بہت برا کیا تھا میں نے تمہارے ساتھ اور دیکھو نا مجھے کیسی سزا ملی ہے۔" وہ رو رہی تھی۔ اور روتے روتے اس نے اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا تھا۔

خوش نصیب کا دل دکھا۔ وہ خود بھی رونے لگی۔

"ماہ نور میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ ہو ہی نہیں سکتی۔ ایک ہی تو رشتہ بچا تھا میرے پاس۔ میری بہن۔ اس سے بھی ناراض ہوتی تو خود پر ظلم کرتی۔ میں کبھی بھی تم سے خفا نہیں ہوئی۔ کبھی بھی نہیں۔"

"مجھے سچ بہت دیر سے معلوم ہوا تھا خوش نصیب۔ تب جب شامیر مجھے اپنے ساتھ رومانیہ لے گیا تھا۔ اصل بات بہت دیر سے معلوم ہو سکی۔ اسے کسی حاملہ عورت کی قربانی دینی تھی اور وہ مجھے قربان کرنے کے لیے وہاں لے کر گیا تھا جس سے اسے کوئی شیطانی طاقت مل سکتی۔ اس نے اپنی اولاد کے بارے میں بھی نہ سوچا جو ابھی تک دنیا میں بھی نہیں آئی تھی۔ بہت برا کیا ہے اس نے میرے ساتھ۔ بہت ہمت کر کے میں وہاں سے بھاگ نکلی اور جانتی ہو اللہ نے اسے دنیا میں ہی عبرت کی تصویر بنا دیا۔ اس کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی۔ ایک ٹانگ کٹ گئی اور وہ خوب صورت چہرہ جو معلوم نہیں کتنی لڑکیوں کو بے وقوف بنانے کا ذریعہ بنا تھا وہ مکمل طور پر جل گیا۔" ماہ نور کی باتوں میں ربط نہیں تھا۔

خوش نصیب دم بخود اس کی بات سن رہی تھی۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اللہ نے کتنا کرم کیا اس پر کہ ماہ نور کو بچالیا تھا۔

"ماہ نور...... تم...... تم اسے چھوڑ دو۔ کیوں اب تک اس کے ساتھ ہو۔"

"میں نے بھی یہی سوچا تھا۔ جب یہ سب ہوا تھا تو میرے دل میں اتنی نفرت تھی کہ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اسے اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار دوں۔ اس کا زخموں کے نشانات سے بھرا ہوا چہرہ۔ وہیل چیئر پر اس کا لاچار وجود مجھے اس سے ہمدردی پر مجبور نہیں کر سکا۔ وہ محبت جو مجھے اس سے تھی کہیں دور جا سوئی۔ میں اسے مارنے کے منصوبے بنانے لگی۔ یہاں تک کہ میری اولاد دنیا میں آگئی۔ اور تب پہلی بار میں نے خود کو مجبور پایا۔ میں اگر شامیر کو مار دیتی یا اس سے الگ ہو جاتی تو اپنے بچے کو کیا جواب دیتی۔ اسے کیا بتاتی کہ اس کا باپ کہاں ہے۔ شامیر کی چیخیں، اس کی معافیاں جو کام نہیں کر سکی تھیں۔ وہ میرے بچے کی معصوم کلکاریوں نے کر دکھایا۔

میں نے اسے صاف بتا دیا کہ محبت نہیں کر پاؤں گی۔ ہاں خدا ترسی کر لوں گی۔

ویسے بھی کچھ سزا تو مجھے بھی ملنی ہی چاہیے نا۔ میں نے کون سا کچھ اچھا کیا ہے تمہارے ساتھ۔ اچھا ہے دونوں ساتھ رہیں اور ایک دوسرے کے وجود کے باعث اذیت حاصل کرتے رہیں۔"

"تم پاگل ہو ماہ نور!" وہ سوال نہیں تھا تبصرہ تھا۔

ماہ نور اس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔

"خوش نصیب اگر ہو سکے تو مجھے اور شامیر کو معاف کر دو۔ تمہارا دل یقیناً ہمارے دلوں سے بڑا ہے۔"

"تمہیں معافی کی کیا ضرورت ہے جب میں تم سے خفا ہی نہیں ہوں۔" خوش نصیب نے پیار سے کہا۔

"اور...... شامیر......؟" ماہ نور نے کچھ جھجک کر پوچھا۔

خوش نصیب کچھ بول نہیں سکی۔ اسے معاف کرنا بہت مشکل تھا اس کے لیے۔

"آؤ تمہیں کچھ دکھاتی ہوں۔ پھر شاید تمہیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کمرے سے ملحقہ ایک اور کمرے میں لے آئی۔ خوش نصیب نے دیکھا کہ وہ وہیل چیئر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ بری طرح مسخ تھا۔ ٹانگوں پر ایک کپڑا پڑا تھا۔ وہ وہیل چیئر کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے ہوئے تھا۔

"شامیر!" ماہ نور نے اسے پکارا۔ "خوش نصیب آئی ہے۔"

خوش نصیب کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے شامیر کو آنکھیں کھولتے اور پھر اپنی جانب تکتے دیکھا۔ اس کی اکلوتی آنکھ خوش نصیب پر جمی تھی۔ تباہ ہوئے خدوخال کے ساتھ وہ ایک اکلوتی آنکھ اس کے چہرے کو خوفناک بنا رہی تھی۔ شامیر نے چند لمحوں بعد دونوں ہاتھ اس کے سامنے باندھ دیے۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولا لیکن آواز میں رونے لگا۔ اس کی آواز میں جو نوحہ تھا اس نے خوش نصیب کو مزید وہاں رکنے نہیں دیا۔ وہ بھاگتے ہوئے واپس کمرے میں آگئی۔ ماہ نور اس کے پیچھے تھی۔ اسے اپنی سانسیں معمول پر لانے میں کچھ وقت لگا تھا۔

"سنو ماہ نور! میں انسان ہوں۔ کسی کہانی کا کردار نہیں۔ جو ترس کھا کر معاف کر سکے۔ میرے ساتھ جو ہوا اسے بھولنا میرے لیے آسان نہیں ہے۔ اس انسان کی وجہ سے میں نے اپنی ماں کھوئی۔ اپنی بہن گھر بدر ہوئی...... میں کوشش کروں گی کہ زندگی کے کسی موڑ پر اسے معاف کر سکوں۔ مگر ابھی نہیں۔ ابھی نہیں۔"

وہ اپنی بات کہہ کر کمرے سے نکلتی چلی گئی تھی۔

اور اس رات کی سیاہی نے ایک کمزور لنگڑاتے ہوئے وجود کو، جو بیساکھی کے سہارے چل رہا تھا، منزل سے نکل کر اپنے اندر گم ہوتے دیکھا۔

☆☆☆

تین سال بعد......

"خلیل جبران کہتا ہے کہ زندگی کی حقیقت سے بہت زیادہ سنجیدہ یا رنجیدہ نہ ہوں کیوں کہ ایک بات تو طے ہے کہ آپ اس سے بھاگ نہیں سکتے۔ جو ہونا ہے وہ ہو کر رہنا ہے چاہے آپ جتنی مرضی پلاننگ کر لیں اور وہ اسی وقت پر ہوگا جب اس کا ہونا طے پایا گیا ہے۔ مگر وقت کی ایک اچھی بات یہ بھی ہے کہ وہ جیسا بھی ہو، گزر ہی جاتا ہے۔

میں منفرا شیرازی، جسے تین سال پہلے اپنی زندگی رکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی، آج اس بات کے حق میں گواہی دے سکتی ہوں کہ زندگی کبھی نہیں رکتی۔ وہ چلتی ہی رہتی ہے اور انسان کو اپنے ساتھ گھسٹنے پر مجبور کرتی ہے۔ آپ چاہیں یہ کام خوشی سے کریں، خفگی سے کریں یا سمجھوتہ کر کے آگے بڑھیں۔ آپ کو وہ کام کرنا ہی پڑے گا جو آپ کی قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔"

منفرا نے لکھتے لکھتے لمحہ بھر کے لیے ہاتھ روک کر ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے وسامہ کا بلینکٹ درست کیا تھا۔ وہ نیویارک سے اپنے بچوں کے ساتھ پاکستان جا رہی تھی۔ اس نے دوبارہ سے لکھنا شروع کیا۔

"تین سال پہلے میں جب بھی سوچنے بیٹھتی تو سمجھ نہیں پاتی تھی کہ فلک بوس کی کہانی میں بھلا میرا کردار کیا تھا اور پھر میں ہی کیوں؟ مگر آج میں یہ بات سمجھتی ہوں کہ جب کچھ ہماری قسمت میں لکھ دیا جاتا ہے تو اسے ایسے ہی اختتام تک پہنچنا ہوتا ہے۔

وہ مشکل وقت تھا۔ شکر ہے کہ گزر گیا۔ میں نے تب معاویہ کو بہت بری حالت میں دیکھا تھا۔ وہ ڈپریس رہنے لگا تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ انسان جب اندر سے ٹوٹ جائے تو وہ کسی بھی ماحول میں خوش نہیں رہتا۔ چاہے اس کے نزدیک کتنے ہی محبت کرنے والے اور خیال کرنے والے لوگ کیوں نہ ہوں۔ کچھ ایسا ہی معاویہ کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ معاویہ۔ میرا شوہر۔ مجھ سے نہایت محبت کرنے والا انسان جو اپنے بچوں پر جان چھڑکتا تھا، پہلی بار تھا کہ مجھ سے اور میرے بچوں سے لاتعلق ہو گیا تھا۔

شاید ہدیٰ اور وسامہ ہماری زندگی میں نہ ہوتے تو میں کبھی بھی معاویہ کو واپس حاصل نہ کر پاتی۔ عین ممکن تھا کہ ہمارا رشتہ ہی باقی نہ رہتا۔ میرے دل میں معاویہ کی محبت جیسے کہیں کھو سی گئی تھی۔ میرے لیے یہ برداشت کرنا مشکل تھا کہ معاویہ مجھ سے پہلے بھی کسی عورت کی محبت میں مبتلا رہ چکا ہے۔ چاہے وہ عورت اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ اس دنیا سے بھی جا چکی ہو۔ معاویہ کا ڈپریشن اس احساس کو مزید پختہ کرتا تھا کہ وہ اب بھی آئے کت کی محبت میں مبتلا ہے۔

یہ ہمارے بچے تھے جن کی خاطر جہاں میں نے معاویہ کے ساتھ اپنا رشتہ نبھانے کا فیصلہ کیا وہاں معاویہ نے بھی اس ڈپریشن سے نکلنے کے لیے اپنا علاج شروع کروایا۔ وہ خود بھی اس احساسِ جرم سے چھٹکارا چاہتا تھا کہ کسی حد تک اس کی اپنی ذات ہی آئے کت کی موت کا سبب بنی تھی۔

پورا ایک سال معاویہ کو اپنا علاج کروانا پڑا۔ وہ ہماری اب تک کی ریلیشن شپ کا سب سے مشکل وقت تھا۔ معاویہ کا غصہ بہت بڑھ گیا تھا۔ اس کا موڈ لمحوں میں بدلتا تھا۔ وہ کئی کئی دن تک چپ رہتا، مجھے نظر انداز کرتا لیکن میں نے ہار نہیں مانی۔ میری مستقل مزاجی کا یہ فائدہ ہوا کہ آج معاویہ پہلے سے بھی زیادہ میری قدر کرتا ہے اور جہاں تک میری بات ہے تو اس وقت سو جانے والی محبت جانے کب میرے دل میں اپنا مقام پھر حاصل کر بیٹھی، میں نہیں جانتی۔ ہاں مشکل تھا خود کو سمجھانا کہ معاویہ اور معاویہ کی محبت بٹی ہوئی ہے لیکن جب ایک بار دل کو سمجھا لیا کہ وہ معاویہ کا ماضی ہے جس کا حال پر اثر وقت کے ساتھ ختم ہو جائے گا تو زندگی خود ہی پرسکون ہو گئی اور اس وقت ہم ایک پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔

آج مجھے وہ تمام واقعات بہت تفصیل سے یاد آرہے ہیں۔ شاید اس کی وجہ وہ دو لوگ ہیں جن کے لیے ہم پاکستان جارہے ہیں اور جو اس واقعے کے دو اہم گواہ بھی تھے۔ کیف اور خوش نصیب۔ جو کچھ دن میں شادی کر رہے ہیں۔ یہ ان دونوں کا ہی بلاوا تھا کہ ہم اتنے عرصے بعد ایک بار پھر پاکستان جارہے ہیں۔"

منفرا نے ڈائری کا صفحہ پلٹا۔

"ان تین سالوں میں، میں ہمیشہ خوش نصیب سے کانٹیکٹ میں رہی۔ وہ لڑکی جو سالوں پہلے اس گھر میں بد نصیب اور منحوس مانی جاتی تھی اب اسی گھر میں اپنی بہن کے ساتھ ایک باعزت زندگی گزار رہی ہے۔ وہ بے وقوف سی لڑکی زندگی کی ٹھوکریں کھا کر بہت سمجھ دار ہوگئی ہے اور وہ جو اس کے دل میں یہ یقین پختہ تھا کہ وہ منحوس ہے، کیف کے ساتھ نے خود یہ خود اس احساس کو اپنی موت آپ ماردیا۔ کیف کو پورا سال لگ گیا خوش نصیب کو اپنی محبت کا یقین دلانے میں لیکن وہ کامیاب ضرور ہوگیا۔

فلک بوس سے نکلنے کے ایک سال بعد کیف اور خوش نصیب کی منگنی ہوگئی تھی لیکن خوش نصیب خود سے پہلے اپنی ماہ نور کی خوشیاں حاصل کرنا چاہتی تھی۔ شامیر اگرچہ ماہ نور کی زندگی سے خود ہی نکل گیا تھا لیکن ماہ نور خود کو کبھی اپنے کیے پر معاف نہیں کر پائی۔ شامیر بچپن میں ہمارا پڑوسی رہ چکا تھا۔ ہم اچھے دوست تھے مگر صرف تب تک جب تک ہمیں اس کی ایکٹیوٹیز کے بارے میں معلوم نہیں ہوا۔ اس کے عجیب و غریب شوق دیکھتے ہوئے ڈیڈ کے حکم پر میں اور ایڈم دونوں ہی اس کے معاملے میں محتاط ہوگئے اور صرف ہم ہی نہیں معاویہ بھی شامیر کو جانتا تھا اور یہ تب کی بات ہے جب معاویہ، کسی بھی طرح وسامہ کی روح سے بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے دل میں پیدا ہونے والی آئے کت کی محبت کے لیے اپنے بھائی کی روح کے سامنے شرمندہ تھا۔ آٹھ سال تک وہ ہر اس بندہ کے پاس گیا، جس کے بارے میں اسے امید ہوئی کہ وہ ایک بار وسامہ کی روح سے اس کی بات کرواسکتا ہے۔ یہ سب مجھ سے ملنے کے بعد ختم ہوگیا۔ مگر جن لوگوں سے وہ اس سلسلے میں ملا تھا، ان تمام لوگوں میں شامیر بھی شامل تھا۔ لیکن خوش نصیب کو اس کے چنگل سے نکالنے کے بعد وہ شامیر سے دور ہوگیا تھا۔

خوش نصیب کی واپسی کے بعد شامیر خود ہی ایک رات فضل منزل سے چلا گیا۔ کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ کالا جادو کرنے والے کبھی اس کے اثر سے نہیں نکل پاتے۔ وہ پلٹنا چاہیں تو بھی پلٹنا ان کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایسا ہی کچھ شامیر کے ساتھ بھی ہوا۔ اس کے بارے میں بس یہی معلوم ہوسکا تھا کہ وہ کچھ لوگوں کو مردہ حالت میں کوڑے کے ڈھیر سے ملا جسے لاوارث قرار دے کر دفنا دیا گیا۔

ماہ نور کو شامیر سے نجات تو مل گئی لیکن اس کا احساس جرم کم نہیں ہوا۔ وہ اپنی ساری زندگی اپنے معذور بیٹے کے ساتھ گزار دینا چاہتی تھی اور شاید وہ ایسا ہی کرتی اگر اس کی بہن اور ہونے والا بہنوئی اور بہنوئی کا ایک عدد دوست اس کے پیچھے نہ پڑ جاتے۔ زرگل دو سال تک ماہ نور کی آس میں بیٹھا رہا یہاں تک کہ ماہ نور ہار مان کر اس سے شادی پر راضی ہوگئی اور اب اگلے ہفتے دونوں بہنوں کی شادی ہے۔"

خوش نصیب اور کیف کے ذکر پر اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ معاویہ نے لمحہ بھر کے لیے اسے مسکراتے دیکھا اور پھر خود بھی پرسکون ہو کر مسکراتا ہوا ہدیٰ کی جانب متوجہ ہوگیا جو اسے اپنی فیورٹ اینی میٹڈ مووی کی ہزار بار کی سنائی ہوئی کہانی دوبارہ پہلی بار والے جوش و خروش سے سنا رہی تھی اور باپ سے بھی ایسے ہی جوش کے مظاہرے کی متمنی تھی۔

"فلک بوس آج بھی اپنی جگہ قائم ہے۔ اردشیر ازی نے کتنی ہی بار اسے ہوٹل میں بدلنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔ اول تو وہاں کام شروع ہی نہ ہو پاتا تھا اور جب ایک بار وہ وہاں تعمیراتی کام شروع کروانے میں

کامیاب ہو بھی گئے تو اس کا نتیجہ ایک مزدور کی موت کی شکل میں سامنے آیا۔ باقی مزدوروں نے خوف کے مارے وہاں کام کرنے سے ہی منع کردیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان لوگوں نے وہاں ایک عورت کو گھومتے دیکھا ہے۔ اصل حقیقت تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن شاید وہاں کچھ اثرات حقیقت میں موجود ہیں۔ ویسے بھی ایسی عمارتیں جو عرصہ دراز تک بند رہتی ہوں اور جن دیواروں نے اپنے سامنے بہت سے مظالم کی داستانوں کو پروان چڑھتے دیکھا ہو وہاں ایسے اثرات کا موجود ہونا کوئی انہونی بات نہیں اور یہ کوششیں تب تک جاری رہیں جب تک معاویہ کے بابا فالج کا شکار نہ ہوگئے۔ انہیں مکمل بیڈ ریسٹ کی ضرورت تھی سو چاروناچار انہیں فلک بوس کو ہی نہیں بلکہ اپنے تمام پلانز کو ادھورا چھوڑنا پڑا۔ معاویہ نے انہیں مایوس نہیں کیا۔ ان کے تمام نامکمل پلانز کو مکمل کیا بس فلک بوس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ معاویہ کے والد کو فلک بوس کو ہوٹل بنانے کے خواب سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہونا پڑا۔ فلک بوس اپنی جگہ موجود ہے لیکن ہم اب وہاں نہیں جاتے۔ وہاں جا کر پرانی یادوں کو دہرانے کا فائدہ بھی کیا ہے بھلا۔

کبیر بابا اور پاشا اب فلک بوس میں موجود نہیں ہیں۔ جس دن آئے کت اس دنیا سے گئی، پاشا بشام چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلا گیا اور کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ زندہ ہی نہیں ہے اور کچھ کا کہنا ہے کہ پاشا ملک چھوڑ کر چلا گیا۔ بابا کبیر کے لیے یہ غم بہت بڑا تھا۔ وہ برداشت نہیں کرسکے۔ وہ اب بھی بشام میں ہی رہتے ہیں لیکن ذہنی طور پر معذور ہوچکے ہیں۔ وہ اب بشام کی گلیوں میں بس اپنے بیٹے کو آوازیں دیتے پھرتے ہیں۔ معاویہ نے انہیں کئی بار اپنے ساتھ لانے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہیں ہوسکا۔ حتیٰ کہ معاویہ نے پاشا کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی لیکن اس میں بھی ناکامی ہوئی۔

بابا کبیر اور پاشا۔ جو بے خبری میں مارے گئے۔ میں فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں سو قدرت پر چھوڑتی ہوں کہ وہ انہیں مجرم سمجھتی بھی ہے یا نہیں۔ مگر سزا بہرحال انہیں سخت ملی تھی۔

اور میری کہانی کا آخری کردار۔ آئے کت یا آیوشمتی

ہم اسے کوشش کے باوجود یقین نہیں دلا پائے تھے کہ آیوشمتی کسی بدروح کا نہیں بلکہ اس خوف کا نام ہے جو آج تک بشام پر اپنی دہشت کے پنجے گاڑے ہوئے ہے۔ وہ لڑکی جس نے اپنی ساری زندگی خوب صورتی اور دولت کے پیچھے بھاگنے میں ضائع کردی اور آخر میں منوں مٹی تلے جا سوئی۔ میں اتنے عرصے بعد بھی اس کے بارے میں سوچوں تو مجھے اس پر ترس آتا ہے۔ ہم لوگ کبھی بھی صحیح طرح سے نہیں جان سکے کہ اسے کیا مسئلہ تھا جو وہ خود کو آیوشمتی ماننے لگی تھی۔

اگر وہ زندہ ہوتی تو یقیناً ہم لوگ اس کی بیماری کو پتا لگا پاتے۔ لیکن افسوس کہ اب اندازے لگانے کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ جہاں تک میں سمجھتی ہو ڈپریشن کا شکار ہونے کے باعث وہ اس کہانی پر یقین کرتی ہی چلی گئی جو وہ وسامہ کو سناتی تھی۔ وہ اس دنیا میں ہی کہیں اٹک گئی تھی جو اس کی اپنی ذہن کی اختراع تھی اور پھر کبھی اس دنیا سے باہر نہیں نکل سکی۔"

جہاز میں لینڈنگ کا اعلان ہو رہا تھا جب معاویہ نے اسے پکارا۔ وہ ڈائری لکھنے میں اس حد تک مصروف تھی کہ ارد گرد کی دنیا سے بالکل ہی کٹ گئی تھی۔

"اب اسے بند کردو یا آج ہی ڈائری کو ختم کر کے چھوڑنے کا ارادہ ہے۔" وہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔

منفرا جھینپ کر مسکرا دی۔ ڈائری بند کرنے سے پہلے وہ اپنا تجربے کا نچوڑ لکھنا نہیں بھولی تھی جو بس یہی تھا کہ......

"ہم جن بھوت اور آسیب سے ڈرتے ہیں ڈرنا بھی چاہیے لیکن محتاط صرف انسانوں سے رہنا چاہیے کیوں کہ انسانی شر کا بھوت کسی بھی دوسرے بھوت سے زیادہ خوفناک ہوتا ہے اور خطرناک بھی۔"



سمیرا حمید

محبِ رب

بصرہ شہر میں قندیلوں کی روشنی حاکم شہر کے اس باغ کو رات کا وہ آسمان بنا رہی تھی۔ جسے روشنی کے لیے چودھویں کے چاند کی ضرورت نہیں رہتی۔ طلحہ بن مراد کے یہاں دعوتِ عام کا اہتمام تھا۔ سارا شہر موجود تھا' کیا امیر کیا غریب۔ اگر کوئی موجود نہیں تھا تو وہ یقیناً بدنصیب تھا۔ بن مراد کی دریا دلی کے سب گن گا رہے تھے۔ وہ سال میں ایک بار ایسی دعوتِ عام کا اہتمام ضرور کرتا تھا جہاں سب خاص عام ہو جاتے تھے اور عام خاص......

اسی دعوت میں وہ چاروں باغ میں کھڑے دنیا جہاں کی باتیں نپٹا رہے تھے۔

حاکم شہر' جس کی انصاف پسندی کی بہت دھوم تھی۔ جس نے شہر کا انتظام ایسے سنبھالا ہوا تھا کہ دریا کنارے کتا بھی بھوک سے نہیں مرتا تھا۔ کوئی گھر ایسا نہیں رہا تھا جہاں خوش حالی کا راج نہیں تھا۔ کوئی ایسا جاہل نہیں بچا تھا جسے علم کے لیے مدرسہ میسّر نہیں تھا۔ شہر میں پانی کا ایسا انتظام تھا کہ گیا نیل کے کنارے ہوگا۔ اس کی سخاوت اور سمجھ بوجھ نے اسے لوگوں کا محبوب بنا دیا تھا کہ وہ اسے ہر چیز اور ہر انسان سے زیادہ محبوب رکھنے لگے تھے۔

محمد صالح نوجوان تاجر جو ابھی کچھ دن پہلے بصرہ واپس آیا تھا۔ وہ شہر کے لوگوں میں کچھ اس لیے بھی زیادہ مقبول تھا کہ وہ اپنے ساتھ ایسے ایسے دلچسپ قصے کہانیاں لایا کرتا تھا کہ دل موہ لیا کرتا تھا۔ لوگ اس کی حس مزاح کے مدّاح تھے۔ اس کی معصوم صورت پر پیار آتا تھا اور نیک طبیعت پر رشک۔ بن مراد اس کا بہترین دوست تھا، اسی لیے اس کی واپسی پر دعوت کا انتظام کر دیا تھا۔

مشہور و معروف عالم...... یہ علم کا ایسا گہرا سمندر تھے جس میں عقل و شعور کو حیران کر دینے والے خزانے سیپیوں میں موتیوں کی صورت مقید تھے۔ ان کے علم کے ستون انسانوں کی نجات پر کھڑے تھے۔ اس برگزیدہ ہستی نے اپنی زندگی اللہ کی راہ میں تبلیغ کے لیے وقف کر دی تھی۔

شہر کے معزز حکیم صاحب...... ان کی رحم دلی اور شفقت کی تو کوئی مثال ہی نہیں تھی۔ ان کے چہرے پر روشنی کی طرح پھیلی ہوئی مسکراہٹ' موت کی راہ پر تکتی سانسوں کو "زندگی" کی تھپکی دیتی تھی۔ ان کا حکمت بھرا علم، بیماروں کو نئی امید دیتا تھا۔ وہ بیمار کو کچھ ایسے ٹھیک کر دیتے تھے جیسے کوئی جادوگر ہوں کہ ہاتھ لگایا اور مرض، شفاء میں بدل گیا۔

تاجر محمد صالح کامل نے اپنا قصہ ختم کیا اور مشروب کی طلب پر آواز دینے کے لیے گردن پیچھے خم دیا تو اسے ذرا دُور ایک بدحال فقیر کھانا کھاتا ہوا نظر آیا۔ فقیر شاید کہیں بہت دُور سے آیا تھا۔ اس کا حلیہ ایسا بدحال ہو چکا تھا کہ دیکھ کر ترس آتا تھا۔ اس کے شانے پر کپڑے کا تھیلا ٹکا تھا، جسے اس نے کھانا کھاتے ہوئے بھی خود سے الگ کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ محمد صالح کو اس کے تھیلے میں دلچسپی ہوئی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ فقیر کے قریب جائے اور جھانک کر اس تھیلے میں دیکھے۔ وہ تاجر تھا اور تاجروں کی یہی فطرت ہوتی ہے۔

"تم تو فقیر ہو' بھلا تمہارا دنیا کے سامان سے کیا لینا دینا۔" فقیر کے قریب کھڑا آدمی پوچھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر مذاقاً فقیر کے شانے سے تھیلا بھی اُتار لیا تھا۔

اپنی انگلیاں چاٹ کر فقیر اٹھ کر کھڑا ہوا اور تھیلا آدمی کے ہاتھ سے واپس لینا چاہا۔ "دنیا کا سامان نہیں ہے اس میں۔"

"اچھا...... چلو پھر دیکھتے ہیں کہ کیا ہے اس میں......" آدمی نے تھیلے میں ہاتھ ڈالنا چاہا تو فقیر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک دیا۔

"تم رہنے دو۔ میں نکال دیتا ہوں۔ تم نے دیکھ لیا تو شرمندہ ہو جاؤ گے۔" تھیلے میں ہاتھ ڈال کر فقیر نے ایک آئینہ نکال لیا۔

"فقیر کے پاس آئینے کا کیا کام؟" آدمی ہنس دیا۔ تو فقیر بھی ہنس دیا۔

"بس بھائی! میرا تو یہی کام ہے اب دینے والا جانے کہ یہی کام کیوں دیا۔" نرمی سے کہہ کر فقیر نے آئینے کو واپس تھیلے میں رکھنا چاہا تو آگے بڑھ کر محمد صالح نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آئینے بیچتے ہو۔ لاؤ دکھاؤ کیا خاص بات ہے اس میں۔"

"بیچتا نہیں ہوں جوان! بس دکھاتا ہوں خاص بس اتنا ہی ہے کہ یہ اصل دکھاتا ہے۔"

فقیر کے انداز میں کچھ ایسی سچائی اور جلال تھا کہ جہاں تک اس کی آواز گئی وہاں تک سناٹا پھیل گیا۔ سب اس کی طرف بہت فرمانبرداری سے متوجہ ہوئے۔

"سیدھی طرح سے کہو کہ شکل دکھاتا ہے۔" کسی نے اس کے قریب آ کر اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"شکل نہیں محترم! اصل...... انسان کا اصل"

عالم، حاکم اور حکیم پوری طرح سے فقیر کی سمت متوجہ ہو گئے۔ محمد صالح کی طرح وہ بھی چل کر اس کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔

"لگتا ہے یہ پاگل ہے۔ دیکھو کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ اصل سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ بھلا بتاؤ تو سہی۔"

"وہی جو انسان کا اصل ہوتا ہے وہ سونا ہو یا چاندی' سیاہ ہو یا خاک۔"

سننے والوں کو دلچسپی تو ہوئی لیکن وہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہو رہے تھے۔ جو دیکھا سنا نہ ہو اس پر یقین آتا بھی نہیں ہے۔

"چھوڑیں! بے چارا پاگل لگتا ہے۔" اپنے دل کی تسلی کے لیے کسی نے کہہ دیا۔

"پاگل تو وہ ہے جو اپنے اصل سے نظریں چراتا ہے۔ جو جانتے بوجھتے گھاٹے کا سودا کرتا ہے۔" فقیر نے ہنس کر کہا لیکن اس کی ہنسی نے سب کو سہما دیا۔ اس کی ایک سوالیہ نظر نے انہیں جلا سا دیا۔ اس کے لفظوں کی تیزی انہیں کاٹ گئی۔

"کیوں کیا اس شہر میں کوئی ایسا جرات مند نہیں ہے جو اس آئینے میں اپنا کھرا کھوٹا دیکھنا چاہے؟؟ کوئی ایسا سچا جو اپنا جھوٹ سننا چاہے؟ کوئی ایسا مومن جو کافر کو روبرو پائے؟ کیا یہاں کوئی ایسا "محبِ رب" نہیں جو مجازی اور حقیقی میں فرق دیکھنا چاہے؟ آپ میں سے کوئی اس آئینے میں دیکھنا نہیں چاہے گا کیا؟"

سب کو چپ لگ گئی۔ فقیر زیرِ لب ہنس دیا۔ اس کی ہنسی حاکم شہر کو بہت کھلی۔ عالم، حکیم اور نوجوان تاجر کو بھی۔

"میں دیکھنا چاہوں گا۔" حاکم شہر نے بلند آواز

سے کہا۔ وہ ایسا ہی جرأت مند تھا اسی لیے سارا شہر اس پر اپنی جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔

"میں بھی۔" عالم نے کہا۔ وہ ایسے شفاف دل تھے کہ آئینہ ان پر فخر کرتا۔

"میں بھی دیکھنا چاہوں گا......" حکیم کے چہرے پر روشنی کی چمک پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔ نوجوان تاجر نے تینوں کی طرف دیکھا اور پھر فقیر کو......

"اور میں بھی۔"

☆☆☆

آئینہ کیا بولتا، سارا شہر بولنے کے لیے تیار تھا کہ وہ چاروں کیسے عظیم اور نیک فطرت انسان ہیں۔ ان کے کردار، اعمال اور افکار باوضو نمازی کی طرح پاک صاف تھے۔ ان کا ظاہر و باطن آئینے کی طرح شفاف تھا۔

چاروں ایک جگہ ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے حاکم شہر نے اپنے سامنے آئینے کو رکھا اور پھر اس کا رخ ہجوم کی طرف موڑ دیا۔

"میں اس شہر کا حاکم طلحہ بن مراد ہوں۔ میں ایک غریب لوہار کا بیٹا ہوں۔ مجھے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا اور میں اس میں طاق بھی تھا۔ میرے استاد میری سمجھ بوجھ کے قائل تھے۔ لوگ میری علمی قابلیت کے مداح تھے۔ اپنی محنت اور لگن سے میں چھوٹے سرکاری عہدوں سے ترقی کرتا ہوا شہر کا حکمران بن گیا۔

میں نے شہر کے حالات بدلنے شروع کر دیے۔ مجھے غربت اور مصیبتوں سے نفرت تھی۔ اسی لیے سب سے پہلے میں نے شہر کی غربت مٹانی شروع کر دی۔ لوگوں کی آسانی کے لیے کنوئیں کھدوانے شروع کر دیے۔ مسافروں کے لیے مسافر خانے، کسانوں کے لیے زرعی ساز و سامان کی فراہمی اور تاجروں کے لیے سرکاری کارواں کی سرپرستی شروع کر دی تھی۔ کھانے پینے اور عام استعمال کی چیزوں کی قیمتیں کم کر دی گئیں۔ شہر میں مدرسوں اور مسجدوں کی تعداد شہریوں کی تعداد سے کچھ ہی کم ہو گی۔ کوئی صاحب علم ایسا نہیں تھا جسے کتابیں اور کتب خانے میسر نہ ہوں۔ میں نے دنیا بھر کی نایاب کتابوں سے کتب خانے بھر دیے تھے۔ علاج معالجے کی ایسی صورت حال تھی کہ پچھلے سات سالوں سے شہر میں کوئی وبا نہیں پھوٹی تھی۔ غرض کوئی ایسا کام نہیں تھا جو میں نے شہر اور شہریوں کی فلاح و بہبود کے لیے نہ کیا ہو۔

ایک دن میں شہر کے دورے پر نکلا تو کئی لوگوں نے میرے ہاتھ پکڑ پکڑ کر چومنے شروع کر دیے۔ وہ میرے آگے جھکے جاتے تھے۔ اس منظر نے مجھے دیوانہ کر دیا۔ لوگوں کے تعریف و توصیف سے بھرے جملے میرے کانوں میں گونجتے رہے۔ میں رات بھر سو نہیں سکا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں شہر کا حاکم نہیں ان سب کا حاکم ہوں۔ ان کے چہروں پر جو خوشی تھی وہ میرے ہی دم قدم سے تھی۔ بھلا میں نہ ہوتا تو وہ اتنے خوش حال ہوتے؟ نہیں وہ تو غربت زدہ اور پریشانیوں کے مارے ہوتے جاہل اور بیمار صورت۔

میں اگلے دن پھر دورے پر نکلا۔ شہری دیوانے ہوئے جاتے تھے۔ وہ میرے نام کے نعرے لگا رہے تھے۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ مجھے اپنے سر کا تاج بنا لیں۔ میرے لیے اپنی گردنیں کٹوا دیں۔ مجھے اس منظر نے اتنا محظوظ کیا کہ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے ہفتے میں ایک دن شہر کے دورے پر ضرور نکلنا چاہیے۔ میں نے اس شہر کے لیے خود کو ہلکان کیا ہے۔ میرا حق بنتا ہے کہ میں خود کو خوشی سے معمور کروں۔ اور جان لوں کہ میں کون ہوں۔ میری حیثیت اور مقام کیا ہے۔

ایک دن سر راہ مجھے ایک بزرگ ملے۔ وہ کچھ غصے میں تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں ایک ایسا فرعون ہوں جو لوگوں کا پیٹ بھر رہا ہے اور اپنا نفس۔ مجھے اس بزرگ کی بات پر غصہ آیا۔

"کیا میں رعایا کے حق میں کام نہیں کر رہا؟" ان کی حقارت بھری نظروں کو نظر انداز کرنا مشکل

تھا۔

"کیسا کام؟؟ تم تو اپنے نفس کی اطاعت کر رہے ہو۔ جو کام اللہ کی خوشنودی کے علاوہ کیا جائے وہ نفس کی اطاعت ہوتا ہے۔ جو عمل، جو عزت، جو مرتبہ تمہیں خدا بنا دے، وہ تو لعنت ہوتا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے لعنت کا طوق بنا کر تم نے اپنے نفس کے گلے میں لٹکا دیا ہے اور کیسے خوش باش ہو۔

"بھوکوں کو کھانا مل رہا ہے، جاہلوں کو علم۔ گھروں میں رزق کی زیادتی ہے۔ ظلم، ناانصافی کا بازار ٹھنڈا ہے۔ چور اچکے میرے نام سے ہی خوف کھاتے ہیں۔ کسی کی جرأت نہیں کہ شہر کا امن و امان تباہ کر سکے۔"

"نیت کا کھوٹ، سمندر سیاہ کر دیتا ہے۔ سنا نہیں تم نے کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ تمہارے کھرے عمل، تمہاری نیت کے کھوٹ میں بہہ گئے۔ اللہ کے محبوب ﷺ نے دولت اور شہرت کی محبت کو دو بھیڑیے قرار دیا ہے۔ تم یہ سب لوگوں کی فلاح کے لیے نہیں اپنی تعریف و توصیف کے لیے کر رہے ہو۔ شیطان تم پر نقب لگا چکا ہے۔ وہ تمہیں اچھی طرح سے بہلا چکا ہے۔ تمہارا نفس شیطان کے ساتھ مل کر سازشیں کر رہا ہے۔ شہر اور شہریوں کی فلاح کے جھانسے میں وہ تمہیں اندھا کر چکا ہے۔ تم شہر کے حکمران نہیں رہے۔ تم نے خود کو انسانوں کا حکمران سمجھ لیا ہے توبہ کر لو۔"

"کیسی توبہ جب کچھ کیا ہی نہیں۔" میں نے قہقہہ لگایا۔

"یہی تو اصل گناہ ہے۔ جو خود کو معصوم سمجھتا ہے، وہی اصل گناہ گار ہے۔ جو خود کو نیک سمجھتا ہے، وہی تو بدبخت ہے۔ تو جانتا ہی نہیں کہ فرعون کیوں غرق ہوا؟؟ اس نے خدا کو ایک خدا کیوں نہیں مانا؟ کیونکہ وہ خود کو خدا مانتا تھا۔"

"توبہ استغفار بزرگوار! میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا ایسا گناہ گار نہیں ہوں میں۔"

"تو خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرا رہا کیونکہ تو خود کو خدا کے ساتھ شریک کر چکا ہے۔ تجھے نظر کیوں نہیں آ رہا۔"

مجھے نظر آ رہا تھا کہ بزرگوار کا دماغ چل پڑا ہے۔ عمر کی زیادتی نے انہیں دیوانہ کر دیا تھا۔

مجھے دوسرے شہر کے حاکم نے اپنے شہر کے دورے کی دعوت دی تھی۔ اس شہر میں پہلے ہی میرے نام اور کام کی شہرت پہنچ چکی تھی۔ جس وقت میں شہر میں داخل ہوا، اس وقت سارا شہر میرے نام کی پکار سے گونج اٹھا۔ مجھے دیکھنے کے لیے لوگ دیوانہ وار میرے گھوڑے کے ساتھ ساتھ بھاگ رہے تھے۔ خلق خدا مجھے دیکھنے کے لیے مری جاتی تھی۔

شہر کے حاکم دین دار انسان تھے۔ انہوں نے بہت عاجزی سے میرا استقبال کیا تھا۔ وہ وہاں میری آمد پر بہت خوش تھے۔ لیکن میں شہر کے انتظامات اور صورت حال سے خوش نہیں تھا۔ جس کا اظہار میں نے شہریوں کے سامنے کرنا شروع کر دیا تھا۔ شہری اسی انتظار میں تھے کہ کوئی مجھ جیسا عقل مند آئے اور ان کے شہر کے حالات بھی بدل کر رکھ دے۔ انہیں تحریک چاہیے تھی جو میں نے انہیں دے دی اور وہ اپنے بوڑھے حاکم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کے خلاف "کھلم کھلا" نفرت کا اظہار کرنے لگے۔

شہریوں کی نفرت دیکھ کر حاکم شہر خاموشی سے اپنے عہدے سے دست بردار ہو گئے۔ اور ان کی جگہ مجھ جیسا جرأت مند جوان، حاکم بن کر آ گیا۔ وہ مجھے اپنا مرشد مانتا تھا اور میری بہت عزت کرتا تھا۔ میرے مشوروں پر اس نے شہر کے حالات بدلنے شروع کر دیے۔

"اپنے ساتھ ساتھ تم اسے بھی جہنم میں گھسیٹ رہے ہو۔" بزرگوار پھر مجھ سے ملنے آئے۔

"اگر زمین کو جنت بنانا گناہ ہے تو ہاں میں یہ گناہ کر رہا ہوں۔ اور خوشی سے کر رہا ہوں۔"

"تم زمین والوں کے لیے جنت نہیں، اپنے

لیے جہنم بنا رہے ہو۔"

"آپ کی باتیں عجیب ہیں۔ بہتر ہے کہ آپ مجھ سے دُور رہیں، ورنہ آپ کی عزت پر حرف آتے دیر نہیں لگے گی۔"

"دیر نہیں لگے گی حاکم شہر! زیادہ دیر نہیں لگے گی اور سوال جواب کا دن آجائے گا۔"

مجھے بزرگ کی بات پر ہنسی آئی۔ میرے عمل میں کہیں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ میں پوری ایمان داری سے لوگوں کی فلاح کے لیے کام کر رہا تھا۔ میرا مقصد نیک تھا۔ میرا عمل بے داغ تھا۔ میری نیت سونا تھی۔ میری محنت، میری عقل با مقصد تھی۔ میں تو ایک مثالی حاکم تھا جس نے شہر کو ترقی کے عروج پر پہنچا دیا تھا۔

جمعے کے دن میں شہر کے دورے پر نکلا اور پھر جمعے کی نماز کے لیے مسجد چلا گیا۔ لوگ جو خطبہ سن رہے تھے وہ میری تعظیم میں اٹھ کر کھڑے ہوئے اور انہوں نے صفوں کی صورت' رکوع کی حالت میں جھک کر مجھے سلام کیا۔ مجھے اس منظر نے بے خود کر دیا تھا۔ البتہ خطیب کے چہرے پر برہمی پھیل گئی۔ اس نے قہر برساتی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"تم نے تو خود کو خدا بنا لیا ہے۔ نماز پڑھ لو تو اپنے لیے دعا کرنا کہ اے اللہ مجھے ہدایت دے۔"

میرے لب طنز سے وا ہو گئے۔ "مجھ سے حسد تمہیں زیب نہیں دیتا......"

"بھلا نالائقوں سے کیسا حسد......"

نماز کے بعد میں مسجد سے باہر نکلا تو مسجد کے دروازے پر بیٹھے فقیروں نے مجھے غصے سے دیکھا۔ ایک فقیر اُٹھ کر میرے پاس آیا اور کہا۔ "لعنت ہو تم پر۔"

لوگوں نے اس فقیر کو پکڑ کر خوب مارا۔ وہ پٹتا رہا اور میں دل ہی دل میں ہنستا رہا اور کہتا رہا "لعنت ہو تم پر ہو......لعنت ہو تم پر۔"

پہلا سبق:

"جب میں نے غور کیا تو میں نے اپنے نفس کو شیطان کے ساتھ اپنے خلاف سازش کرتا ہوا پایا۔" (شیخ قادر جیلانی)

"انسان کو انسان بننے کی اتنی جلدی نہیں رہتی، جتنی خدا بننے کی رہتی ہے۔"

☆☆☆

سارے شہر کو سکتہ ہو چکا تھا۔ آئینہ بے رنگ ہو چکا تھا۔ وہاں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ حاکم طلحہ بن مراد نے آئینے کو فقیر کی طرف اچھال دیا۔

"اچھا جادو ہے...... کیسے کیسے جھوٹ بول گیا۔"

یہ کہہ کر اس نے شہر کے لوگوں کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں کے رنگ کو بدلا ہوا پایا۔ وہ اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"لعنت ہو تم پر......" ایک نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

فقیر نے آئینے کو عالم کی طرف بڑھا دیا۔ عالم کی گہری نظر نے فقیر کی آنکھوں میں جھانکنا چاہا۔ پھر اس نے سامنے کھڑے لوگوں کو دیکھا۔ یہ وہی سب لوگ تھے جن کی زندگیاں اس کی تبلیغ نے بدل دی تھیں۔ ورنہ وہ سب تو بھولے بھٹکے، جھوٹے، مکار اور بے ہدایتے لوگ تھے۔ وہ نہ ہوتا تو وہ سب کیسے جان پاتے کہ اللہ کو کون کون سا عمل ناپسند ہے......

"اللہ کو انصاف پسند، رحم دل، اور معصوم دل پسند ہیں۔ اللہ کو معصومیت پسند ہے۔ ایسی معصومیت کہ کوئی نیکی کرے اور وہ اسے اللہ کا احسان سمجھے۔ اللہ کی دی توفیق۔ اس کی عطا کردہ ہدایت۔ اپنا کمال، اپنا ظرف، اپنی طاقت نہ سمجھے۔

ایسی معصومیت کہ اگر وہ گناہ کرلے تو فوراً توبہ کی طرف متوجہ ہو جائے۔ اللہ سے معافی مانگے 'ٹوٹی پھوٹی' اچھی بری' کچی پکی' بس وہ معافی مانگے......اللہ کو گناہوں کی نشاندہی پسند ہے کہ بندہ اپنے گناہوں پر نظر رکھے۔ اللہ کو وہ دل پسند ہے جو اس کی محبت سے لبریز رہتا ہے۔ اللہ کو بندگی پسند ہے۔ اس کی محبت سے بندھی ہوئی، اس کے خوف سے سہمی ہوئی نہیں۔ اللہ محبت ہے اور وہ محبت کو ہی محبوب رکھتا ہے۔"

فقیر نے عالم کی گہری نظر کا جواب سوال سے پہلے دے دیا تھا۔ وہ لوگوں کی طرف رخ کر کے کہہ رہا تھا۔ عالم نے اپنا ہاتھ پیچھے نہیں کھینچا اور آئینے کو اپنے سامنے کرلیا۔

"میں اس شہر، اس ملک، اس دنیا کا معتبر، باعلم، عالم فاضل انسان ہوں۔ میں انصار بن جنید ہوں۔ جس نے علم کی تلاش میں تیس سال دنیا کی خاک چھانی ہے۔ عقل و شعور کے سمندر پیئے، پہاڑ سر کیے، ویرانے پار کیے۔ آگ میں جلا، پیاس سے مرا، بھوک سے تڑپا لیکن علم کی تلاش کو مؤخر نہیں کیا۔ میں علم کا ایسا سرچشمہ بنا چکا ہوں کہ ساری دنیا اس سے اپنی پیاس بجھاتی ہے لیکن میں ہوں کہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ میری لکھی چودہ کتابیں دنیا بھر کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ لوگ ان کتابوں کو پڑھتے ہیں اور عالم فاضل بنتے ہیں۔ میں شہر شہر، کوچے کوچے جا کر لوگوں کو اللہ کی باتیں بتاتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ اچھی طرح سے جان لیں اور سن لیں کہ اللہ ان سے کیا کہتا ہے۔"

"وہ کہتا ہے کہ میں رحمٰن ہوں......" ایک غیر معروف عالم مجھے سرِ راہ روک کر کہنے لگے۔

"میں نے کب کہا کہ وہ رحمٰن نہیں ہے۔" میں سمجھ سکتا تھا کہ یہ عالم میری شہرت سے حاسد ہے۔

"پھر تم اللہ کو بس قہار ثابت کرنے پر کیوں بضد ہو؟"

"کیا وہ قہار نہیں ہے......؟؟"

"قہار رب کی صفت ہے...... پورا رب نہیں۔" "پورا رب کون ہے؟"

"الرحمٰن......الرحیم......الکریم......"

"تو تم چاہتے ہو کہ میں شہر کے چوروں، ڈاکوؤں، قاتلوں کو اللہ کے رحم کے قصے سناؤں۔ تاکہ وہ پہلے سے زیادہ گناہ کریں کہ اللہ تو معاف کر دے گا۔ چلو پہلے قتل کرتے ہیں، سود خوری سے پیٹ بھر لیتے ہیں پھر معافی مانگ لیں گے۔"

"یہ فیصلہ تمہیں نہیں کرنا کہ وہ کیا کریں گے۔ تم بس اللہ کی ہر صفت کو بیان کرو۔ اور یاد رکھو اللہ کا رحم اور محبت افضل ہے۔ تمہیں کچھ چھپا کر نہیں رکھنا۔ تم مخلوق خدا کو صرف عذابوں اور سزاؤں سے نہیں ڈرا سکتے۔ تمہیں اللہ کے رحم، توبہ اور معافی کے بارے میں بھی بتانا ہے۔"

"ان بدبختوں کا اللہ کی محبت سے کیا لینا دینا۔"

"بندگی کا ہر سبق محبِّ رب (محبت کرنے والا) سے شروع ہوتا ہے۔ تم بندوں میں اللہ کی محبت جگائے بغیر انہیں بندگی نہیں سکھا سکتے......"

"دنیا میں گناہوں کا بازار گرم ہے محترم! میرے کام میں مداخلت نہ کریں۔"

"شہر میں چوروں، قاتلوں، لٹیروں، بے ایمانوں اور سود خوروں کی تعداد ہی کتنی ہے؟ دو سو؟ تین سو؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے......دو ہوں یا دو سو......"

"فرق پڑتا ہے...... کیونکہ دو، تین سو برے لوگوں کے لیے تم نے باقی کی مخلوق کو اللہ سے ڈرا دیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا سخت عذاب میں مبتلا کرنے والا، قہر نازل کرنے والا رب ہے۔ تم نے مخلوق سے اللہ کا رحم چھپا کر بڑا گناہ کیا۔"

"تو کیا وہ ہر گناہ پر سوال نہیں کرے گا۔" میں نے اطمینان سے پوچھا۔

"وہ ہر گناہ پر سوال کرے گا لیکن وہ ہر گناہ کو معاف بھی تو کرتا ہے۔ تم نے لوگوں کو توبہ کا نہیں بتایا۔ یہی کیوں بتایا کہ وہ جہنم کی آگ میں جھونک دیے جائیں گے۔ وہ ان کے لیے جہنم کے سات درجے دہکا رہا ہے۔"

"تو کیا جہنم دہکائی نہیں جا رہی؟ اس کے سات درجے نہیں ہیں؟"

"جہنم سے پہلے...... جنت سے بھی پہلے۔ اس سے بھی پہلے کہ انسان پیدا ہوتا اور اس سے بھی پہلے کہ یہ کائنات بنتی، رحم موجود رہا پھر کائنات بنی۔ انسان وجود میں آیا، پھر اس کے اعمال ہوئے، پھر ان کی سزا مقرر ہوئی پھر اس سزا پر جہنم بنا۔ تم نے

آخرین کو اولین کیسے بنا دیا۔ تم کیسے عالم ہو، تم اپنے رب کا ڈر لوگوں کے دلوں میں بٹھا رہے ہو۔

تم لوگوں کو خوف سے، آگ سے، سزا سے، موت سے ڈرا رہے ہو۔ تم لوگوں کو اللہ کی محبت میں مبتلا کیوں نہیں کرتے۔ تم انہیں اللہ کے رحم، کرم، فضل، اس کی معافی، اس کی محبت کی طرف کیوں نہیں بلاتے۔ تم انہیں یہ کیوں نہیں بتاتے کہ جب زمین و آسمان بنے تو رحم سو حصے بنا۔ ایک حصہ رحم اللہ نے مخلوق میں رکھا اور باقی کا رحم اپنے پاس۔ کل مخلوق کے اس ایک حصے رحم میں سے تمہاری ماں کے حصے کتنا آیا ہوگا؟؟ اس پر بھی تمہاری ماں نے تمہیں اپنی پیٹھ پر لاد کر گرم، تپتا ہوا صحرا تن تنہا پار کیا۔ صحرا کے کنارے وہ پیاس سے مر گئی، لیکن پانی کی آخری بوند وہ تمہارے حلق میں اُتار گئی...... ابھی بھی تمہیں اللہ کے رحم کا اندازہ کرنے میں مشکل پیش ہے ابھی بھی تم اللہ کا رحم چھپا کر رکھنے کے درپے ہو۔"

"کیا اللہ کے رحم اور اس کی محبت کا سن کر لوگ بدل جائیں گے۔"

"اللہ کی محبت سے ہی تو دل بدلتے ہیں۔ چور بھی قاتل بھی۔ زانی بھی اور جاہل بھی۔ کبھی لوگوں کو خوف سے بدلتے ہوئے دیکھا ہے؟ خوف سے جسم بدلتے ہیں۔ سہم کر سکڑ جاتے ہیں۔ اپنی جگہ اور حیثیت بدل لیتے ہیں۔ دل نہیں بدلتے۔ اگر میں تمہاری گردن پر تلوار رکھ دوں تو کیا تم خدا کو چھوڑ کر مجھے اپنا خدا مان لو گے؟ اچھا چلو خوف سے مان بھی لو گے تو کیا دل سے مجھے اپنا خدا تسلیم کرو گے۔ محبت کرو گے مجھ سے؟

اگر خوف سے سب کچھ ہونا منظور ہوتا تو اللہ نبیوں کو کیوں بھیجتا؟ پھر اللہ جنگجو بھیجتا۔ جو تلوار کے زور پر، جاہ و جلال، رعب اور طاقت سے لوگوں کو ایک اللہ پر ایمان لانے کے لیے کہتے۔ پھر نبی بادشاہ اور شہنشاہ ہوتے جن کے نام سے ہی رعایا کا دم نکلتا۔ پھر وہ ریوڑ چرانے والے، مزدوری کرنے والے، ترکھان، لوہار یا تاجر نہ ہوتے۔

پھر نبیوں کے پاس ہتھیار ہوتے، فوج ہوتی، دولت کے انبار ہوتے، خوں خوار درندے اور بڑے بڑے قید خانے ہوتے۔ ایمان نہ لانے والے درندوں کے آگے ڈال دیے جاتے، قید خانوں میں قید کر لیے جاتے۔ جنگیں ہوتیں، لوگ زیر کر لیے جاتے۔ ہر طرف خون ریزی، خوف اور طاقت کا بازار گرم رہتا۔ پھر ایک جہنم زمین پر بھی بنا دی جاتی۔

تم اتنی سی بات نہیں سمجھ سکے کہ اللہ نے اپنے نبیوں کو عام لوگوں جیسا کیوں بنایا۔ تاکہ لوگ ان سے خوف زدہ نہ ہوں۔ ان کی عزت کریں لیکن ان کے رعب سے خائف نہ ہوں۔ وہ ان کی باتوں کو عقل پر پرکھیں، سمجھ بوجھ سے جانیں۔ نہ کہ ان کے جاہ و جلال سے سہم کر ایمان لائیں۔

اللہ کو ایسے ایمان والے نہیں چاہئیں۔ ورنہ اسلام تلوار کے زور پر قائم کیا جاتا۔ تم شہر شہر، گاؤں گاؤں، دیس دیس جاتے ہو اور بندوں کو جہنم کے عذابوں سے لرزا کر رکھ دیتے ہو۔ تم نے کبھی انہیں یہ نہیں بتایا کہ......

لوگوں نے گناہ کرنے چھوڑ دیے ہیں۔" میں نے اس بحث کو ختم کرنا چاہا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ان سے ایسی بے کار کی تکرار میں الجھا رہتا۔

"شاید...... لوگوں نے اللہ سے محبت کرنی بھی چھوڑ دی ہے۔ بچے اللہ کے خوف سے جھوٹ بولنا چھوڑ چکے ہیں۔ اب کوئی بچہ اللہ سے باتیں بھی نہیں کرتا کیونکہ وہ اللہ کے نام سے ہی سہم جاتا ہے۔ کوئی عورت اللہ سے چپکے چپکے اپنے دل کا حال نہیں کہتی کیونکہ اسے لگتا ہے کہ اللہ کو بس نمازوں سے مطلب ہے اس کے دل کی باتوں سے نہیں...... کوئی مزدور سوکھی روٹی کھاتے ہوئے اللہ سے میٹھی روٹی کی فرمائش نہیں کرتا کیونکہ اسے یقین ہے کہ میٹھی روٹی کی فرمائش اس کی لالچ ہے۔ اور لالچی انسان جہنم میں جائے گا۔ تم نے انہیں اتنا زیادہ ڈرا دیا ہے کہ اللہ کے نام پر انہیں بس عذاب ہی عذاب دکھائی دیتا

ہے۔ اس کا رحم، اس کی محبت نہیں۔"

"یہ سب اللہ کے اطاعت گزار بن چکے ہیں۔" میں اس سے بے زار ہو چکا تھا۔

"یہ سب بس اللہ کے غلام بن چکے ہیں۔ جو اپنے مالک کی سزا سے ڈرتا ہے، اس لیے کوئی گناہ نہیں کرتا۔ تم نے لوگوں کو بندگی نہیں، غلامی سکھائی ہے۔ جہنم سے ڈرے ہوئے غلام اللہ کو یہی پیارے ہوتے تو اللہ کُن کہتا اور سب کے دل اپنی طرف پھیر دیتا۔ اللہ نے نفس کیوں بنایا۔ اللہ نے انسان کو آزادی، سمجھ بوجھ، عقل شعور کیوں دیا؟؟ کیونکہ اللہ کو غلام نہیں چاہیے تھے۔ اللہ کو بندے چاہیے تھے' اللہ کو ایسے اطاعت گزار نہیں چاہئیں جو اس کی محبت کی طلب نہ رکھیں۔ ایسے بندے نہیں چاہئیں جو بندگی کی چاہ نہ رکھیں۔"

میرے لیے یہ باتیں بے معنی تھیں۔ میں تو بس یہ جانتا تھا کہ خون کا بدلہ خون ہے۔ قاتل کا سر قلم ہو گا، چور کا ہاتھ کٹے گا، بے ایمان کو قید ہوگی، جھوٹے کی زبان جلے گی، ظالم، سود خور کی پکڑ ہوگی۔

ایک دن مجھے قید خانے میں بلایا گیا۔ موت کی سزا کا ایک قیدی مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ جس وقت میں وہاں پہنچا اس وقت اس کی سسکیوں سے قید خانے کی دیواریں لرز رہی تھیں۔ اس کے رونے نے دوسرے قیدیوں پر بھی رقت طاری کر دی تھی۔ روشنی کے ذرے تک آب دیدہ تھے۔ ہوا کی سانسیں اس کے آنسوؤں سے نم تھیں۔

"کیا اللہ مجھے معاف کر دے گا۔" اس نے لجاجت سے میرا ہاتھ تھام لیا اور روتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے ایک زندہ انسان کا قتل کیا ہے' وہ تمہیں کیوں معاف کرے گا؟"

"میں شیطان کے بہکاوے میں آ گیا تھا۔ کل میرا سر قلم ہونے جا رہا ہے۔ پھر کیا اللہ مجھ سے کلام کرے گا۔"

"وہ تم سے کلام کیوں کرے گا...... تم نے یہاں دنیا میں اپنے کیے کی سزا بھگت لی تو تمہیں اوپر کوئی سزا نہیں ملے گی۔"

"میں سزا اور جزا کا نہیں پوچھ رہا...... میں اللہ کا پوچھ رہا ہوں۔ کیا وہ میری طرف رخ کرے گا۔ کیا وہ مجھے دیکھے گا۔ کیا وہ مجھ سے محبت کرے گا۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میں اکیلا ہوں۔ کیا وہ میرا بنے گا؟ کیا وہ مجھے اپنا لے گا؟"

اسے کسی پل چین نہیں تھا۔ میں نے بے زاری سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم ایک قاتل ہو۔ اللہ کی محبت کی ایسی ہی فکر تھی تو قتل نہ کرتے۔ اب گڑگڑانے سے کیا حاصل۔"

وہ وہیں کا وہیں چپ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں صدمے سے سکڑ گئیں۔

"اللہ کی محبت پانے کے لیے میں نے خود کو کوتوال کے حوالے کر دیا۔ اپنے جرم کا اقرار کیا۔ میں نے توبہ کی۔ میں نے اللہ سے ہر طرح سے معافی مانگی۔ کیا اب بھی اللہ مجھ سے محبت نہیں کرے گا؟ کیوں؟ کس لیے؟ میرا اس کے سوا ہے ہی کون۔ اب وہ بھی مجھے نہیں اپنائے گا تو کون مجھے اپنائے گا؟ میں کہاں جاؤں گا۔" وہ زیر لب بڑبڑاتا رہا۔

"کیا مومن اور قاتل برابر ہو سکتے ہیں؟" میں اس کی بڑبڑاہٹ سے چڑ گیا۔

"میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔ معافی مانگ چکا ہوں۔"

"پھر بھی قاتل تو ہو نا' اللہ تمہاری طرف نظر کرے گا یا اس مومن کی طرف جو رات دن عبادت میں مصروف رہتا ہے اور ہر حال میں اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔ جو اللہ سے ڈرتا ہے، اور اپنی زندگی کو گناہوں کی سرحد سے بہت دُور رہ کر گزارتا ہے۔"

"اللہ کی محبت مقدار اور کمال میں کم تو نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ اس مومن سے محبت کرتا ہے تو کچھ مجھ سے بھی کرتا ہوگا۔"

میں نے دیکھا کہ قید خانے کے بہت سے قیدی ہماری بات چیت بہت دلچسپی سے سن رہے ہیں۔ اگر

میں اپنا رویہ نرم کرتا تو ان قیدیوں پر برا اثر پڑتا۔ پھر تو ہر انسان گناہ کیے جاتا اور توبہ کرتا رہتا۔ ایسے تو ہمیشہ گناہوں کا بازار ہی گرم رہتا۔

''تم نے اللہ سے اپنی محبت کھو دی ہے۔ بہتر ہے کہ سر قلم ہونے سے پہلے اچھی طرح سے توبہ کرلو۔ اور دعا مانگو کہ اللہ تمہیں جہنم کی آگ سے بچالے۔''

''جہنم سے مجھے ڈر نہیں لگتا۔ وہ بے شک مجھے اسی میں جھونک دے۔ لیکن۔''

''چپ کر اے بدبخت چپ ہوجا۔''

یہ کہہ کر میں اسے روتا ہوا چھوڑ کر قید خانے سے باہر آگیا۔ دو دن بعد خواب میں مجھے وہی نوجوان نظر آیا۔ وہ خوش باش دکھائی دیتا تھا۔ پہلے تو وہ زیر لب مسکراتا رہا پھر غصے سے مجھے گھورنے لگا اور انگلی اٹھا کر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اپنے انجام کے لیے تیار رہنا ـــــ اللہ ایسا رحمٰن ہوگا اور میرے ساتھ ایسا معاملہ کرے گا، دنیا میں مجھے اس کا اندازہ ہوتا تو میں بھوک کے خوف سے چوری نہ کرتا۔ چوری جیسے گناہ پر بھی وہ مجھ معاف کردے گا تو میں چوری کے ظاہر ہوجانے کے خوف سے قتل نہ کرتا۔ میرے قاتل بن جانے پر بھی وہ میری دعائیں سنے گا، میری توبہ قبول کرے گا تو میں ایک ایک سانس دعا کرتا، ایک ایک لمحہ توبہ کرتا جتنا میں کرسکا اتنے پر بھی اس نے مجھ پر ایسا رحم کیا کہ میں نے اسے پالیا لیکن تم اسے کیسے پاؤ گے؟؟ اصل بدبخت تو تم ہو......''

میں نے اس خواب کو اپنے ذہن کا فتور سمجھا۔ میں اپنی تبلیغ میں مصروف رہا اور بیرون شہر طوائفوں کے پاس گیا۔ انہوں نے اللہ کے عذاب سے ڈر کر چیخنا چلانا شروع کردیا۔ وہ رونے پیٹنے تو لگیں لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی توبہ نہیں کی۔ شہر واپسی پر سرائے میں مجھے ایک دوسری طوائف ملی۔ وہ سیاہ چادر میں چھپی ہوئی تھی اور اپنے شہر سے بھاگ آئی تھی۔

''میں نے اللہ کے لیے یہ پیشہ چھوڑ دیا ہے۔ میری راہنمائی کریں۔'' وہ میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''تم نے توبہ کی......؟''

''ہاں میں نے توبہ کی...... اب میرا رب مجھے ایسے اپنالے گا جیسے پھول خوشبو کو۔''

''توبہ توبہ ...... نانہجار...... کہاں تو کہاں ہمارا رب...... اپنی اوقات دیکھی ہے۔ تو ایک طوائف ہے۔ سمندر کے پانی سے بھی نہالے گی تو بھی اس لائق نہیں ہوسکے گی کہ رب العزت کی بارگاہ میں کھڑی ہونے کی جرأت کرسکے۔ یہی کیا کم ہوگا کہ اللہ تیرے گناہ معاف کرکے تجھے جہنم سے بچالے گا۔''

''پر مجھے تو جہنم سے خوف نہیں آتا۔ بھلا جو آگ میں پلا بڑھا ہو اسے آگ کیا ڈرائے گی۔''

''تو جنت میں جائے گی؟''

''جنت؟؟ جنت سے مجھے کیا لینا دینا! آپ ان دونوں کے مالک کی بات کریں۔ یہ پیشہ میں نے اس کے لیے چھوڑا۔ نہ جنت کے لالچ میں، نہ جہنم کے خوف سے۔''

میں نے ایک نفرت بھری نظر اس پر ڈالی۔ مجھے اس سے کراہیت آئی کہ ایک گناہ آلود جسم، ایک ناپاک زبان کیسے بار بار میرے رب کا نام لیتی ہے اور دعوا کرتی ہے کہ اس نے اللہ کے لیے سب کچھ چھوڑا ہے۔ اب میرا رب اسے اپنالے گا جیسے وہ کوئی معصوم دل، پاکیزہ روح ہی تو ہو۔ جیسے توبہ کرتے ہی اس کی حیثیت بدل گئی اور اس کے درجات بلند ہو گئے۔ ہونہہ۔

''کیا خدا بھی مجھے ایسے ہی دیکھتا ہو گا؟؟'' میری تحقیر بھری نظروں نے اسے افسردہ کر دیا۔

''ہاں بدبخت...... ہاں......''

وہ روتی ہوئی سرائے سے باہر بھاگ گئی۔ اس کی سیاہ چادر خاک آلود ہوگئی۔ ایسا لگا جیسے شدت غم سے وہ کسی کنوئیں میں چھلانگ لگانے جارہی ہو......

آئینہ دھواں دھواں ہوگیا۔ طوائف کی سسکیاں ان کے دل ڈسنے لگیں۔ ان کے کان اس کی توبہ سے دہکنے لگے۔ ان کی روحیں اس کی ''اللہ...... اللہ...... اللہ......'' کی پکار سے لرزنے لگیں۔ اللہ کے رحم اور اللہ کی محبت نے ان کے دلوں پر اپنا پہلا اثر چھوڑا اور وہ اس حقیقت کے گواہ ہوئے کہ......

''جو زبان، دل، قلم، کتاب، انسان اللہ کے رحم کو چھپائے گا وہ سزا کا مستحق ہوگا۔ جو اللہ کی محبت سے پہلے کوئی دوسرا راستہ دکھائے گا وہ گناہ گار ہوگا۔ جو ہدایت سے پہلے لعنت کا، علم سے پہلے جاہلیت کا، جزا سے پہلے سزا کا، رحم سے پہلے قہر کا، محبت سے پہلے بےزاری کا بتائے گا اللہ اس سے بےزار ہو گا۔''

دوسرا سبق:

قیامت کے دن اللہ فرمائیں گے کہ ''میری ذات سے محبت کرنے والے آج کہاں ہیں؟ آج میں انہیں عرش کے سائے میں رکھوں گا۔ آج میرے سایہ کے علاوہ کسی چیز کا سایہ نہیں ہو گا۔'' (الحدیث۔ مسلم)

☆☆☆

سب کی نظریں بار بار نوجوان تاجر کی طرف اٹھتی جاتی تھیں۔ وہ پسینہ پسینہ ہورہا تھا۔ بار بار اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔ اس کی گھبراہٹ کچھ ایسی دل دہلا دینے والی تھی کہ اسے دیکھ کر یقین ہوتا تھا کہ اس کی دال ضروری پوری ہی کالی ہے۔

آئینہ شہر کے حکیم کے سامنے آیا۔ حکیم چاہتا بھی تو اب انکار نہیں کرسکتا تھا۔ شہر کے لوگوں کی آنکھیں پوری طرح سے اپنا رنگ بدل چکی تھیں۔ اب وہ پیچھے ہٹتا تو لوگ اسے اس سے کہیں زیادہ گناہ گار مانتے جتنا وہ ہوتا۔

''پھر میں نے کیا ہی کیا ہے۔'' حکیم نے اطمینان بھری سانس لی۔

''نہ میں خدا بنا رہا اور نہ میں نے لوگوں کو رب کے قہر سے ڈرایا۔ میں نے تو لوگوں کو ان کی بیماریوں میں راحت دی۔ ان کی تکلیفیں کم کیں۔ انہیں شفا دی۔''

حکیم صاحب نے آئینے میں خود کو دیکھا پھر اس کا رخ سب کی طرح گھمادیا۔

''میں حکیم عقیل بن شیراز ہوں۔ اس شہر کا شاید ہی کوئی ایک ایسا انسان ہوگا جو مجھے نہیں جانتا ہوگا۔ کیا بادشاہ کیا فقیر، کیا مسافر کیا پردیسی۔ میرے ہاتھ سے جس نے شفاء نہیں پائی ہوگی۔ میں نے کچھ ایسی جڑیاں بوٹیاں دریافت کی ہیں کہ مجھ سے پہلے شاید ہی کوئی ان جڑی بوٹیوں اور ان کے خواص سے واقف رہا ہو۔ میں نے ان سے حکمت کا عرق نچوڑ لیا ہے۔ دور دیس میں ایک وبا پھوٹ نکلی تھی، لوگوں کی آنکھیں پھول جاتی تھیں، ان سے خون رسنے لگتا تھا، اور وہ اندھے ہوجاتے تھے۔ میری بنائی دوا وہاں معجزے کے نام سے مشہور ہوگئی تھی۔ انعام کے طور پر مجھے لوگوں نے کیا کچھ نہیں دیا۔ کن کن اعزازوں سے نہیں نوازا۔ میں نے حکمت کا کوئی ایسا در نہیں چھوڑا جس کی دہلیز کو پار نہ کیا ہو۔ کوئی ایسی بیماری نہیں جس کا میں علاج نہ کرسکتا ہوں۔ جو میرا ہاتھ لگنے سے شفایاب نہ ہوا ہو۔''

میں یہ...... میں وہ...... میں...... میں......

ایک بیمار کے علاج کے لیے میں شہر سے باہر گیا تھا۔ واپسی پر رات ہوگئی۔ ایک غریب کی جھونپڑی میں رات گزارنی پڑی۔ وہ ایک آنکھ سے اندھا، ایک کان سے بہرا، ایک ہاتھ، ایک پیر سے مفلوج تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کی بیماری پیدائشی ہے یا وہ کسی وبا کا شکار ہوا ہے، میں نے اسے ہاتھ لگایا تو اس نے میرا ہاتھ جھٹک کر پرے کردیا۔

''میں تمہیں ٹھیک کرسکتا ہوں۔ فکر نہ کرو۔'' مجھے اس کا ہاتھ جھٹکنا برا تو لگا لیکن میں ضبط کرگیا۔

''تم؟؟'' اس نے دانت پیسے۔ ''ہونہہ...... مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ رات گزارو اور صبح ہوتے ہی نکل جانا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں تمہیں......'' اس کی

نخوت نے میرے خون کو جوار بھاٹا بنا دیا تھا۔

''جس میں ''میں...... میں...... میں'' ہو وہ خود کو ٹھیک نہیں کر سکتا، مجھے کیا کرے گا۔''

''کیسی میں؟''

''میں'' بیماروں کو ٹھیک کرتا ہوں۔ ''میں'' دوا بناتا ہوں۔ ''میں'' جڑی بوٹیاں کھوج نکالتا ہوں۔ ''میں'' شفاء دیتا ہوں...... میں...... میں...... میں......'' نفرت سے اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔

''میں یہ سب کرتا ہوں تو ''میں'' کہتا ہوں۔''

''تو پھر خدا کیا کرتا ہے......؟؟''

''خدا بیماروں کے علاج کے لیے زمین پر نہیں آتا۔''

''وہ آئے گا کیوں؟ جب وہ یہیں موجود ہے۔ آتا تو وہ ہے جو جاتا ہے...... جو ہمیشہ موجود ہے، وہ غیر موجود کیسے ہوگا؟''

''وہ خود تو آکر علاج نہیں کرتا نا میرے بھائی......''

''وہی علاج کرتا ہے...... وہی شفا دیتا ہے......''

''اللہ نے ہی کہا ہے کہ دعا اور دوا کرو۔ دوا بنی تو حکمت بنی اور مجھ جیسا ناچیز حکیم......''

''دوا بنی، حکمت اور حکیم بھی...... لیکن تکبّر کیسے بنا؟؟؟''

مجھے اس ایک آنکھ کے اندھے سے بہت بے زاری ہوئی۔

''ہاں میرے بھائی! میں جانتا ہوں کہ بے شک اللہ ہی سب کو شفا دینے والا ہے۔ ہم سب تو بس ذریعہ ہیں۔''

''تم خود کو ذریعہ نہیں سمجھتے...... کل سمجھتے ہو...... اگر تم ایسے ہی کامل ہو تو بتاؤ تکبّر کا کیا علاج ہے؟''

میں تمسخر سے ہنس دیا۔

''اس کا تو پتا نہیں لیکن پاگل پن کا علاج ہے...... شہر پہنچتے ہی تمہیں دوا بھجواتا ہوں۔'' میں نے اس پاگل کو دوا تو نہیں بھجوائی لیکن اپنی وہ دوائیاں جن کی شہرت چار عالم میں تھیں، بنانے میں مصروف رہا۔ میں بیماروں کو یہ دوا دیتا جاتا اور عاجزی سے کہتا جاتا ''بے شک اللہ ہی سب کو شفا دینے والا ہے۔''

لیکن میں تو یہ مانتا تھا کہ یہ میں ہوں جو اتنا لائق فائق ہوں۔ یہ میں ہوں کہ حکمت نے اپنے سارے راز مجھ پر کھول دیے ہیں۔ کون ہے جو میری طرح بیمار کو ہاتھ لگائے اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو جائے۔ کون ہے جو قریب المرگ کو زندگی کی سانس دے دے۔ کون ہے جو کئی ملکوں اور شہروں کو وبائی امراض سے چھٹکارا دلا چکا ہو۔

یہ میں ہوں کہ جنگل جنگل گھومتا ہوں اور جڑی بوٹیاں اکٹھی کرتا ہوں۔ لوگ میری تعریف میں رطب اللسان ہوتے تھے۔ شاعر میرے شان میں قصیدے لکھتے تھے۔ وزیر، مشیر، بادشاہ مجھے انعام و اکرام دیتے تھے۔ میرے کئی باعزت نام تھے۔

''بے شک اللہ ہی ہے......''

میری زبان سے عجز و انکسار کے اظہار کی کوئی حد نہیں تھی۔ میں نے قرآن کی آیات یاد کرلی تھیں۔ علاج کے دوران میں دکھاوے کے لیے ان کا ورد بھی کرتا جاتا تھا تاکہ لوگوں پر میری بزرگی کا رعب پڑے۔ میں نے دیکھا کہ لوگوں نے میری بزرگی سے متاثر ہونا شروع کر دیا ہے تو میں نے اپنا لباس بدل لیا۔ میں ایک درویش ایک برگزیدہ بندہ بن گیا، جس کے ہاتھ میں اللہ نے خاص شفا دی ہے۔ جو جس بیمار کو ہاتھ لگاتا ہے وہ صحت یاب ہو جاتا ہے......

''پہلے تو تم صرف متکبّر تھے اب منافق بھی ہو گئے ہو۔ یاد رکھنا اللہ نے جن لوگوں پر لعنت بھیجی ہے ان میں سے ایک منافق بھی ہے۔''

''کیسی منافقت؟''

''تم زبان سے عجز و انکسار ظاہر کرتے ہو، اصل میں تم متکبر ہو۔ تمہارے غرور کے ہزاروں فرشتے گواہ بن چکے ہیں۔ کئی درویش اور صوفی۔ بزرگ اور

مجذوب تمہارے غرور کی حدّت سے پناہ مانگتے ہیں۔

رائی کے دانے کے برابر جس میں غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا (الحدیث)۔ تم نے تو اپنی ذات میں غرور کے پہاڑ اکٹھے کر لیے ہیں۔ حکیم ہو، یہ نہیں جانتے کہ اس کا علاج کیا ہے۔ توبہ ہے اس کا علاج۔ اللہ کی پناہ مانگو......''

''مجھ جیسے مشہور اور باعزت انسان پر لوگ کیچڑ اچھالتے ہی رہتے ہیں۔ میری عاجزی میں تمہیں غرور دکھائی دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے میرے بھائی کہ میں تو اللہ سے ڈرنے والا بندہ ہوں۔ میں اور میری اوقات ہی کیا ہے جو غرور کروں۔ نہ جانے تم مجھ سے بدگمان کیوں ہو۔ مجھے تو اپنی ذات میں ایسا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔''

''وہ تمہیں دکھائی بھی نہیں دے گا۔ کیونکہ جو غرور کرتا ہے، اس کی سب سے پہلے اندر کی آنکھ ہی بند ہوتی ہے۔ پھر اندر کی آواز۔ پھر آسمانی الہام پھر عقل سلب ہوتی ہے۔ پھر دل پر مہر لگتی ہے پھر توبہ کا وقت بھی نکل جاتا ہے۔''

''میں نے کبھی کسی کے ساتھ کچھ برا نہیں کیا، نہ ہی کسی کا برا چاہا ہے۔ پھر تمہارا میرے ساتھ ایسا رویّہ غیر مناسب ہے۔''

''تم اپنے ساتھ برا کر رہے ہو۔ کیا یہ برا نہیں؟ تم وہ گناہ کر رہے ہو جو گناہوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے۔''

''اگر ایسا ہی ہوتا تو اللہ میرے ہاتھ سے شفا چھین لیتا۔ کوئی بیمار مجھ سے شفایاب نہ ہوتا۔ میں ذلیل و خوار ہوتا۔''

''تم اس حد سے بھی آگے نکل چکے ہو جہاں دراز رسی کھینچ کر متوجہ کیا جاتا ہے۔ تم ہدایت کی وہ سرحد بھی پار کر چکے ہو اب بس توبہ کا دروازہ بچا ہے اس کے بند ہونے سے پہلے، اس میں داخل ہو جاؤ۔ اللہ کی پناہ مانگ لو۔ شیطان خود جس گناہ کا مرتکب ہوا اس نے تمہیں بھی اسی گناہ میں شریک کر لیا۔''

''یہ کیا بات ہوئی کیسی حد؟''

''تم مانتے ہی نہیں کہ تم تکبّر کر رہے ہو۔ تو اب بھلا بتاؤ یہ حد کیا ہوئی؟''

''میں نے ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کیا ہے میرے بھائی۔ میں کیا میری اوقات کیا۔ نا معلوم تم کہنا کیا چاہتے ہو۔''

''اچھا تو پھر سنو...... انسانوں میں ایک تکبّر کرنے والا ایسا بد نصیب انسان ہوتا ہے جسے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ متکبّر ہو چکا ہے۔ تکبّر ایک چھپا ہوا گناہ ہے۔ یہ کئی بہانوں اور دلیلوں کے ڈھیر میں دبا پڑا ہوتا ہے۔ اس کا بیج بہت نیچے، بہت گہرائی میں بویا جاتا ہے۔ جب متکبّر کو الہام کیا جاتا ہے کہ تو غرور کر رہا ہے تو وہ اس الہام کو ''نہیں میں تو بڑا عاجز ترین بندہ ہوں'' کہہ کر رد کر دیتا ہے۔

پہلے اس کے تکبّر کا معاملہ اور اس کے اور اللہ کے درمیان رہتا ہے۔ اللہ الہام کرتا ہے کہ اے بندے تو تکبّر کر رہا ہے، باز آ۔ توبہ کر۔ تو وہ اس الہام کو زبانی ''توبہ استغفار'' کہہ کر، ''میں تو بڑا عاجز بندہ ہوں'' کہہ کہہ کر بہلاتا رہتا ہے۔ اس کا دل پھر بھی نہیں بدلتا۔ پھر اسے نشانیوں کی صورت نصیحتیں کی جاتی ہیں۔ کبھی کلام قرآن کے ذریعے، کبھی کسی عام کتاب کے ذریعے، کبھی کسی انسان کی زبانی، کبھی کسی اور کے انجام کی صورت، کبھی کوئی قصہ سنایا جاتا ہے، کبھی کوئی درویش لایا جاتا ہے۔ ساری کائنات اسے نشانیاں لا لا کر دکھاتی ہے کہ یہ ہے تیرا غرور۔ ایسا ہے تیرا تکبّر...... اللہ اسے بتاتا ہے کہ تیرا تکبّر تجھے لے ڈوبے گا باز آجا...... شیطان کے نقش قدم پر نہ چل۔

وہ باز نہیں آتا۔ اس کا گناہ اپنی حد پھلانگ جاتا ہے۔ وہ اس کے اور اللہ کے درمیان کے پردے سے نکل آتا ہے اور فرشتوں تک جا پہنچتا ہے۔ یہ دوسرا بدترین درجہ ہے۔ فرشتے جان جاتے ہیں کہ اللہ کا یہ بندہ تکبّر جیسا شیطانی گناہ کر رہا ہے۔ وہ کہتے پھرتے ہیں کہ اللہ کا یہ بندہ تکبّر کرتا ہے۔ یہ تکبّر اسے

لے ڈوبے گا اس بندے کو توبہ کر لینی چاہیے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔

وہ توبہ نہیں کرتا۔ پھر فرشتوں سے اس کا یہ گناہ مخلوق تک جا پہنچتا ہے۔ یہ آخری اور بدترین درجہ ہے۔ جو گناہ صرف رب اور بندے کے درمیان تھا، اب مخلوق اس کی گواہ بننے لگتی ہے۔ مخلوق متکبّر کو متکبّر کہتی ہے تو وہ مانتا نہیں۔ عجز و انکسار ظاہر کرتا ہے۔ مخلوق کہتی ہے تو وہ کہتا ہے۔

"بے شک یہ سب اللہ ہی کی وجہ سے ہے۔ میں اللہ کا بندہ ہوں اور مجھے اللہ سے بہت پیار ہے۔ بھلا میں کیا اور میری اوقات کیا۔"

مخلوق طنز کرتی ہے تو وہ کہتا ہے، "لوگ مجھ سے حسد کرتے ہیں۔ میرے خلاف افواہیں پھیلاتے ہیں۔ بھلا میرا غرور و تکبّر سے کیا لینا دینا۔ اللہ گواہ ہے کہ میرا دل صاف ہے۔ میں تو توبہ استغفار کرنے والا ہوں۔" وہ ایسی عاجزی دکھاتا ہے کہ مخلوق خدا کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ لیکن دراصل وہ تو خود کو دھوکا دے رہا ہوتا ہے۔ وہ تو خود کو بہلا رہا ہوتا ہے۔

حکیم ہنس دیا۔

"آپ نے تو مجھے جہنمی ہی ثابت کر دیا۔ ایسا بھی کیا گناہ کر دیا میں نے۔ اللہ کا کمزور سا بندہ ہوں۔ بھلا میری اوقات ہی کیا ہے۔"

"ہاں یہی عاجزی یہی انکسار۔ یہ تمہیں لے ڈوبے گا۔ اس نے تمہارے غرور پر پردے ڈال دیے ہیں۔ شیطان تمہیں ایسے ہی مطمئن کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے "استغفار کہہ لو۔" تم زبانی کلامی استغفار کر لیتے ہو اور تکبر کی اصل جڑ کو روح میں پھلنے پھولنے دیتے ہو۔ ہفتے میں دو دن تم غریبوں میں کھانا تقسیم کرتے ہو۔ ایک دن مفت علاج کرتے ہو۔ نمازیں پڑھتے ہو، روزے رکھتے ہو۔ یتیموں، مسکینوں کی مدد امداد کرتے ہو۔ ضرورت مندوں کی ضرورتوں کا خیال رکھتے ہو۔ شیطان تمہیں تھپکتا رہتا ہے کہ اگر تم تھوڑا بہت تکبر کر بھی رہے ہو تو یہ ایسی کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ تمہاری پہاڑ جتنی نیکیاں، اور سمندر رحم دلی تمہیں جنت تک لے جائیں گی۔

لیکن تم جانتے ہی نہیں کہ ان بڑی بڑی نیکیوں کے پہاڑ، تمہارے غرور کی دلدل نگل لے گی۔ خود کو برتر سمجھتے ہو۔ تمہارے تکبّر کی کنکریاں تمہاری نیکیوں کے سمندروں کو پی جائیں گی۔ خاک کر دیں گی۔ پھر کیا ہاتھ آئے گا؟"

"آپ اپنے اعمال کی بھی ایسے ہی فکر کرتے ہیں جیسے میرے اعمال کی فکر میں پریشان ہیں؟" میں نے طنزیہ پوچھا

انہوں نے افسوس سے مجھے دیکھا۔

"افسوس! تیرے تکبّر کی جڑ تیری روح میں پختہ ہو چکی ہے۔ اب تجھے ہدایت کی باتیں مذاق لگتی ہیں۔ تو اتنا گمراہ ہو چکا ہے کہ سب نیک وکار، اللہ سے ڈرنے والے، صادق اور امین، مومن اور اہل دین تیرے انجام پر افسوس کرنے لگے ہیں۔"

آئینہ سیاہ ہو چکا تھا۔ سننے والوں کی سماعتیں دہک اٹھی تھیں۔ تکبر کی حدت نے انہیں جلانا شروع کر دیا تھا۔ رات کی سیاہی اور قندیلوں کی روشنی آپس میں مدغم ہوتی سب کے دلوں پر الہام کر رہی تھیں کہ......

تیسرا سبق:

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "کبریائی (بڑائی، عظمت، فخر، تکبر) میری ردا (چادر) اور عظمت میرا ازار ہے (یعنی صرف میرا حق ہے) جو کوئی اس وصف میں میرے ساتھ مقابلہ کرے گا میں اس کو جہنم میں ڈال دوں گا اور مجھے اس کی کوئی پرواہ نہ ہو گی۔ جہنم متکبروں کا ٹھکانہ ہے۔" (حدیث قدسی۔ ابوداؤد۔ مسلم)

☆☆☆

ہر طرف خاموشی تھی۔ سب کی نظریں نوجوان تا[...] کا طواف کر رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی بے چینی سب[...] کا دل دھڑکا رہی تھی۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ سامنے ہی اس کا باپ کھڑا تھا اور اس کے ساتھ اس کا ہونے والا سسر۔ اب تک اس کی نظریں بار بار بس آسمان کی طرف ہی اٹھتی جاتی تھیں۔

وہ اتنا خوبصورت اور معصوم تھا کہ، اس کی یہ حالت دیکھ کر رو دینے کو دل چاہتا تھا۔ وہ ایسا بہادر اور زندہ دل تھا کہ آئینہ اس سے چھین کر توڑ دینے کو دل چاہتا تھا۔ بھلا اس جیسا معصوم صورت' بھلا اس جیسا جوان' وہ ایسا کیا کر بیٹھا ہے کہ ایسے کانپ رہا ہے اس کی دودھیا پیشانی پر ہولناک لکیریں کھنچنے لگیں اس کی چاند روشن آنکھوں میں سیاہی اترنے لگی۔

"میں اس شہر کا تاجر محمد صالح کامل ہوں"

اس نے آئینہ پکڑ کر اپنے سامنے کر کے ہجوم کی طرف پھیر دے دیا۔

"میں......مم......میں......"

آئینے میں دکھائی دینے والا محمد صالح اور آئینے کے پیچھے بیٹھا صالح سسکنے لگے......پھر دونوں رونے لگے...... صالح کے باپ نے اپنی نم آنکھوں کو پونچھا۔ شہر والوں کا دل بھی بھر آیا۔ اس کا رونا ایسا تھا کہ انہیں اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

"یا اللہ......یا اللہ......اے میرے رب......"

آئینے میں محمد صالح کہہ رہا تھا......آئینے کے پیچھے بھی وہ یہی کہہ رہا تھا......

آئینہ سفید ہونے لگا۔ وہاں سے اس کی صورت مٹنے لگی۔ اس کی سسکیاں سب سن سکتے تھے لیکن اس کے علاوہ آئینہ کچھ سنانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کچھ بتانے کے لیے، کچھ دکھانے کے لیے۔

"میرے صالح تم نے تم نے بروقت توبہ کی۔" آنکھیں پونچھتے ہوئے صالح کے باپ نے بیٹے سے کہا۔ اس نے نم آنکھوں سے باپ کو دیکھا اور آنسو پونچھتے ہوئے، یا اللہ، یا اللہ کہتے ہوئے ہجوم کو چیرتا ہوا بھاگ گیا۔ سارا شہر جیسے جان گیا کہ وہ کہاں گیا ہوگا۔ بندہ اپنے رب کی بندگی پانے۔

اسباق القدر......آخری سبق......

"تم میں سب سے برا یہ ہے" فقیر نے آئینے کو ہتھیلی میں رکھتے ہوئے عالم کی طرف اشارہ کیا۔ "جس نے حاکم شہر کا انجام دیکھ لینے پر بھی اپنے اعمال پر نظر ثانی نہیں کی۔ اور توبہ نہیں کی۔"

"تم میں سے بدترین یہ ہے" اس نے حکیم کی طرف اشارہ کیا۔

"جس نے دو کا انجام دیکھ لینے پر بھی یہی سوچا۔ "میں......میں......میں......"

"اور تم میں سے سب سے بہترین یہ نوجوان ہے جس نے ان تینوں کے انجام پر اپنے اعمال پر نظر کی۔ اس نے اپنے ایک ایک عمل کو ٹٹولا اور دل ہی دل میں اللہ سے توبہ کی۔ اللہ نے اس کے لیے اس آئینے کو ہی اندھا اور گونگا کر دیا۔ یہ ہے تمہارا رب تمہارے پہاڑ گناہ، اور سمندر خطائیں معاف کر دینے والا پہچانوں اپنے رب کو جو جو اپنے گناہ پہچان لے گا، توبہ کر لے گا اللہ اس کے گناہ پر پردہ ڈال دے گا۔ وہ اسے ایسے اپنا لے گا جیسے پھول خوشبو کو۔

ایسے رب کو بھول کر تم کہاں گمراہ ہو؟؟ تمہاری زندگی اس کی بندگی، اس کی محبت کے لیے کتنی تھوڑی ہے۔ پھر تم کہاں گناہوں کی زیادتی میں بھٹکتے ہو۔

انسانوں میں بہترین انسان وہی ہے جو اپنے اعمال پر نظر رکھتا ہے۔ تم میں سے سب سے برا وہ ہے جو خود کو اچھا سمجھتا ہے۔ سب سے بڑا جھوٹا وہ ہے جو خود کو سچا سمجھتا ہے۔ بدترین متکبّر وہ ہے جو خود کو عاجز سمجھتا ہے۔ جو خود کو مومن سمجھتا ہے وہی تو اصل بد بخت ہے۔ جو اپنی بڑائی میں مبتلا ہے وہ شرک کے راستے پر ہے۔ جو گردن کو اکڑا کر رکھتا ہے، وہی تو اصل فرعون ہے۔ جو انسان بننے سے چوک گیا ہے، وہ خدا بننے کی گمراہی میں بھٹک رہا ہے۔

جو حقیقی مومن ہے وہ اپنے گناہوں کی توبہ میں مصروف ہے۔ جو سچا ہے وہ اپنے جھوٹ پکڑ رہا ہے۔ جو اللہ والا ہے، وہ اللہ سے ڈرنے والا ہے۔ وہ اپنا دل شیطان کے سپرد کر کے، اس کے نقش قدم پر چلنے والا نہیں ہے......

تم میں سے جو حقیقی "محبّ رب" (اللہ سے محبت کرنے والا) ہے، وہ صرف وہی ہے جو ہر سبق یاد رکھنے والا ہے۔

☆

ناولٹ

بے اماں مسافتیں

قرۃ العین سکندر

راہ داری میں سامان بکھرا ہوا تھا۔ کھڑکیوں پر جمی گرد شاید رشتوں میں پڑنے والی دراڑ کی مرہون منت تھی۔ یہ جو اذیت اور درد ہوتا ہے ناں یہ انسان کو قطرہ قطرہ اندر ہی اندر پل پل مارتا رہتا ہے۔ خوش رنگ دروازوں کی تمام تر رنگین درزوں میں بھی ماضی کی کرب ناکیاں جھلکتی ہوئی کس قدر اذیت ناک ہوتی ہیں۔ بعض کرب کاندھوں پر لادے ہوئے انسان جھکے کندھے لیے ناتوانی کا شکار ہونے لگتا ہے۔

راشدہ چچی اس وقت سخت تناؤ کی کیفیت میں مبتلا تھیں اور ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس کا سارا سامان اٹھا کر باہر پٹخ دیں۔ ابھی تو اس کے بابا کو منوں مٹی تلے دفن ہوئے بہت عرصہ بھی نہیں گزرا تھا اور ان کے یہ رنگ ڈھنگ دل میں دکھ کا بیج بو رہے تھے۔

''میں کہتی ہوں چپ کیوں کھڑے ہیں۔ یہ سامان اٹھائیں اور باہر کریں، ان کو۔ ہر وقت ہمدردی کا بخار چڑھا رہتا ہے آپ کو۔ اب مزید بوجھ نہیں اٹھا سکتی میں۔ ہر وقت کی چخ چخ سے اچھا ہے کہ ایک مرتبہ ہی فیصلہ ہوجائے۔'' راشدہ چچی اس وقت اپنا رخ زوہیب چچا کی طرف کرچکی تھیں۔ چچا تو بوکھلا سے گئے، ساری عمر بیگم کے مردانہ جلال سے دبتے چلے آرہے تھے۔ آج بھی وہ اتنا نہ کہہ سکے کہ وہ کس طرح بیوہ بھاوج اور یتیم بھتیجی کو در بدر کردیں۔ اس گھر میں ان کے بھائی کا بھی خون پسینہ شامل ہے۔ اس گھر کی بنیادوں میں ان کی محنت کی بھی اینٹ رکھی گئی ہے۔

علینا نے دیکھا کہ عمارہ بیگم سر جھکائے مجرموں کی طرح، ساری باتیں سن رہی تھیں۔ بنا ماتھے پر شکن لائے حالانکہ وہ رتبے اور مرتبے دونوں میں بڑی تھیں، قابل عزت تھیں مگر آج بیوگی اور بدقسمتی نے ان کو قابل نفرین بنا ڈالا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ آج بھی وہ کچھ نہ کر پائیں گی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی جامد چپ ان کے لبوں کی باڑ نہ توڑ سکے گی۔

اس نے آزردگی سے سوچا کہ کاش وہ اس لمحے سے پہلے ہی اٹھالی جاتی، مگر وہ اس سے زیادہ سوچ ہی سکت نہ پا کر اپنی آنکھوں کے نم گوشے محسوس کرکے رہ گئی تھی۔

''اماں بس کردیں یہ سب تماشا، ایسا کیا ہوا ہے۔ ایک دودھ کے گلاس کے لیے اتنا واویلا کیا



مچار کھا ہے۔ رہی بات اخراجات کی تو میں ادا کر دوں گا۔'' ارمان نے کہا تو راشدہ چچی کا غصہ بجائے کم ہونے کے مزید بڑھ گیا۔

''واہ آج تم کو بھی ان ماں بیٹیوں کی وکالت کرنا یاد آ گیا۔ یہ بھی خوب رہی، میرا بیٹا آج میرے مقابل آن کھڑا ہوا ہے ان ماں بیٹی کی وجہ سے۔'' وہ بے حد زہر خند لہجے میں بولی تھیں تب ہی ارمان نے اپنے ہاتھوں سے ماں کا کندھا تھاما۔ پھر ماں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ایک طرف لے جا کر کرسی پر بٹھا دیا اور خود بھی دوزانو ان کے سامنے ٹک گیا۔

''اماں! میں کبھی بھی آپ کے مقابل کھڑا ہونے کی جسارت نہیں کر سکتا اور رہی بات وکالت کی تو کیا یہ درست ہو گا کہ ہم اللہ کے سامنے گناہ گار بنیں اور پھر یہ بھی تو سوچیں کہ اس طرح سارا خاندان ہم پر تھو تھو کرے گا۔ ابا اور آپ کس کس کے سوالوں کا جواب دیں گے۔ تائی جان کو بخار اور نقاہت تھی اور جس وقت علینا دودھ کا پوچھنے آئی تھی۔ میں ادھر لیپ ٹاپ پر کام کر رہا تھا، میں نے ہی کہا تھا کہ اماں سو رہی ہیں۔ تم کچن میں جا کر دودھ کا گلاس لے لو۔ ایسا نہ ہو تائی اماں کی طبیعت بھوک کی شدت سے زیادہ ہی ناساز ہو جائے۔''

ارمان کی بات پر علینا نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ کس خوب صورتی سے سارا الزام اپنے سر لے رہا تھا، وہ کتنا نرم دل، حساس طبیعت رکھتا تھا۔ اس کے برعکس راشدہ چچی اپنی تیز دھار زبان کے تیروں سے شب و روز ان ماں بیٹی کا سینہ چھلنی کرتی رہتی تھیں اور اس پر شرمندہ ہونا تو درکنار انہیں احساس بھی نہ ہوتا تھا کہ ان کی زبان نے ان کے دل کے اندر کتنے چھید کر ڈالے ہیں۔ اس وقت بھی وہ صرف ارمان کے نرم لفظوں میں پنہاں حساسیت کو خراج تحسین پیش کرتی ہوئی فقط سوچ کر رہ گئی۔ وہ واقعی مہربان تھا، ہر کسی کے لیے اچھا مثبت رائے رکھنے والا تھا۔

''دراصل ڈاکٹر نے کہا تھا کہ دوا کے ساتھ دودھ لازمی ہے اور پھر تائی جان کی کراہیں یہاں تک سنائی دے رہی تھیں۔'' وہ مزید گل فشانی کرنے لگا۔ وہ حیران تھی کیونکہ یہ بات بالکل سچ پر مبنی تھی۔ اماں واقعی ساری رات کراہتی تھیں۔ ان کا جوڑ جوڑ بخار کی شدت سے درد کر رہا تھا۔ موسم کی تبدیلی ان پر اثر انداز ہو رہی تھی، کچھ تو مسلسل مشین کے آگے بیٹھ کر کام کرنے کی وجہ سے انہوں نے اپنی آنکھوں کا ستیاناس کر لیا تھا۔

ارمان کے ہاتھوں کے لمس اور آنکھوں میں پنہاں التجا نے ماں کا دل موم کر دیا۔ جیسے سخت غصے پر کسی نے ٹھنڈا ٹھار پانی ڈال کر اسے ختم کر دیا ہو۔ اس وقت وہ بھی بالکل ہی خاموش ہو چکی تھیں۔ بات یوں بھی ان کی سمجھ میں آ چکی تھی، اگر وہ ایسا کرتیں تو پھر واقعی خاندان بھر میں ان کے لیے زہر اگلا جاتا۔ ان کی زبان کی تندی و تیزی کی تو ویسے ہی دھوم تھی پھر آج کل فروا کے لیے رشتوں کی جولائن لگی تھی، اس میں بھی یہ مناسب نہ ہوتا کہ وہ ایسا قدم اٹھاتیں۔ یہ الگ بات کہ وہ ان ماں بیٹی کا چہرہ تک دیکھنے کی روادار نہ تھیں۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، اب تم کھڑی کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو۔ جاؤ، جا کر ناشتا بناؤ اور ہاں، میں نے انڈے گنے ہوئے ہیں، ایسا نہ ہو ان پر ہاتھ صاف کرو اور آئل انڈیلتے ہوئے دھیان رکھنا کہ یہ حرام کی کمائی نہیں ہے۔ میرے شوہر اور بیٹے کی خون پسینے کی کمائی ہے، جسے تم لوگ یوں اڑانے میں لمحہ ضائع نہیں کرتے ہو۔''

راشدہ چچی دوبارہ شروع ہو چکی تھیں مگر وہ معاملہ ٹل چکا تھا۔ ارمان نے خاموشی سے راہ داری میں پڑا ہوا سامان اٹھا اٹھا کر تائی اماں کے کمرے میں رکھنا شروع کر دیا۔

وہ اس انسان کی دل سے مشکور تھی، وہ ان

لوگوں کے لیے فرشتہ ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے کچن میں جا کر سب سے پہلے چچی جان کے لیے ہی ناشتے کی ٹرے تیار کی تھی۔ خستہ پراٹھے، آملیٹ اور چائے لیے وہ ان کے کمرے کی طرف آئی۔ اس کے بعد سب کا ناشتا ٹیبل پر لگایا۔ چچی جان کو گھٹنوں کا درد رہتا تھا اور وہ ناشتا آرام سے کمرے میں کیا کرتی تھیں۔ یہ الگ بات تھی کہ اس درد کے باوجود بھی وہ سارا دن گھن چکر بنی ہوئی، ان کی ہر طرح کی سرگرمی پر گہری نگاہ رکھا کرتی تھیں اور وہ اب ان سب کی عادی ہوتی چلی گئی تھی۔ چچا زوہیب اور ارمان ناشتے سے فراغت کے بعد آفس کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ جبکہ وہ کچن میں برتنوں کے انبار سے نبرد آزما تھی۔

رات کو اماں کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے اس نے برتن بھی نہ دھوئے تھے۔ فروا اور تائی اماں تو اس طرح کے بلکہ ہر طرح کے کاموں سے قطعی طور پر لاتعلقی اختیار کیے رہتی تھیں۔ اس صفائی کے بعد اس نے جلدی سے اماں کے لیے دو توس سینکے، اس کے بعد چائے لیے وہ اماں کے کمرے میں آ گئی۔

اماں بستر پر چت لیٹے ہوئے چھت کو مسلسل خلاؤں میں تکے جا رہی تھیں، کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔

''اماں! ناشتا کر لیں۔''

اماں نے اسے دیکھا تو بنا کسی احتجاج کے بالکل خاموشی سے اٹھ بیٹھی تھیں۔

''تم نے کر لیا ناشتا؟''

''اماں! میں بھی کر لوں گی۔ ایک انڈہ پراٹھا رکھا ہوا ہے۔'' وہ اماں کی تشفی کے لیے وضاحتی انداز میں بولی تھی۔ جانتی تھی جب تک وہ اماں کو یہ سب نہیں بتائے گی، تب تک وہ ناشتا نہیں کریں گی۔

''یہ سب کچھ اچھا نہیں ہوا۔'' وہ آزردگی سے بولیں۔ وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

''اماں! یہ آج کل کی بات تو نہیں ہے۔ ایک عرصہ ہو چکا ہے، اب تو عادت ہو چکی ہے ان باتوں کی۔ ابا کی موت تو ایک بہانہ ہے اور یہ سب ابا کی تو دی گئی ڈھیل تھی اور آج دیکھ لیا آپ نے، ہمیں ہمارے ہی آشیانے سے پرائے لوگوں کی طرح اٹھا کر پھینک دینے کی نوبت آ گئی ہے۔ یہ سب ابا کا قصور ہے۔'' وہ سخت خفگی سے بولتی چلی گئی تھی۔

اس کا دل ابا سے بدظن ہو رہا تھا۔ اماں ناشتا کر چکی تھیں، اس کے بعد انہوں نے ایک گہری نگاہ علینا پر ڈالی۔

''بیٹا! وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے، تم ان کو برا بھلا کہنا چھوڑ دو۔''

اماں ایک مشرقی عورت کی طرح آج بھی ان کی حمایت میں بولنے سے خود کو باز نہیں رکھ سکی تھیں۔

وہ محض ان کی دل شکنی کے خیال سے مزید بحث سے خود کو باز رکھتی باہر آ گئی تھی۔ برتن دھونے کے بعد اس نے ہاٹ پاٹ سے ٹھنڈا پراٹھا اور آملیٹ کے ساتھ ہی ناشتا کرنا شروع کیا تھا۔ جب چچی جان کا وہاں سے گزر ہوا تھا۔

''اب ٹھونسنے ہی نہ لگ جانا۔ کچھ کام پر بھی توجہ دو، کپڑوں کا انبار، دھونے کے لیے رکھا ہے اور میرے کمرے میں برتن وہیں پڑے ہوئے ہیں، اٹھا لینا۔''

وہ حکم جاری کرنے کے بعد فروا کے کمرے کی طرف گئی تھیں یقیناً اسے جگانے کے لیے۔ فروا من موجی تھی اور اب تک وہ ماں کے نقش قدم پر چل رہی تھی۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی قائل تھی۔ اس کا موڈ ہوتا تو بات کر لیتی تھی اور اگر موڈ نہ ہوتا تو نہیں کرتی تھی۔ وہ اور فروا ہم عمر تھے جبکہ ارمان ان دونوں سے دو سال بڑا تھا۔

اسی وقت اس نے فروا کو آتے دیکھا تھا، بکھرے بالوں میں ہاتھ گھماتی دوسرے ہاتھ میں موبائل تھامے وہ بے فکری سے اس تک آ گئی۔

''جلدی سے ناشتا دو، بھوک لگی ہے زوروں

کی۔‘‘اس نے ایسے آرڈر دیا تھا۔ جیسے کسی ملازمہ کو دیا جاتا ہے، وہ بھی تندہی سے اپنا آخری لقمہ منہ میں ڈالتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے برتن سنک میں رکھتے ہوئے پلٹ کر فوراً سے پوچھا تھا۔

’’کیا کھاؤ گی؟‘‘ اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

’’پراٹھے کا موڈ ہے، وہ بنادو اور ہاں ساتھ میں رات کا قیمہ کریلے کا سالن بھی دے دو۔‘‘

وہ من موجی سی لڑکی تھی۔ کبھی ڈائٹنگ شروع کرتی تو کئی دن تک خالی چائے پر ہی اکتفا کیا کرتی اور کبھی من میں آتا تو ساری ڈائٹنگ بھلا کر ڈٹ کر کھاتی تھی۔ آج بھی بھوک نے ہی اسے اس طرح کی فرمائش پر آمادہ کیا تھا۔ خستہ پراٹھا اس نے اس کے سامنے رکھا۔ ساتھ میں سالن بھی تھا، چائے کا پانی اس نے چولہے پر چڑھا دیا تھا۔

کپڑوں کا ڈھیر اٹھا کر وہ مشین لگا چکی تھی۔ کپڑے الگ الگ کر کے رکھتی ہوئی وہ چائے کو بھی بھول چکی، جو اس نے ایک جانب میز پر رکھی تھی۔ یاد آنے پر بوکھلا کر کپ اٹھایا اس نے وہ ٹھنڈی کسی ہو رہی تھی جبکہ اسے گرما گرم چائے کا بھاپ اڑاتا کپ پسند تھا۔ مگر یہ ساری عیاشی باپ کے ساتھ ہی ختم ہو چکی تھی۔ اس کے والد نے بھی کون سا اس کے خوب لاڈ اٹھائے تھے، اس کو اپنے ابا سے ڈھیروں شکایتیں تھیں اماں ۔ اکثر کہا کرتیں۔

’’تم کیا ہر وقت شکایات کا دفتر کھول کر بیٹھ جاتی ہو۔ ابا ہیں تو سہی، ان کا نام، ان کا آسرا ہے تو زندگی سہل ہے اور جب یہ نام اور یہ آسرا بھی نہ رہا تو خدانخواستہ تب معلوم ہوگا کہ زندگی اپنی تمام تر بدصورتیوں کے ساتھ کس طرح پیش آتی ہے۔‘‘ اور واقعی ابا کے جانے کے بعد اسے اب معلوم ہو رہا تھا کہ زندگی کتنی تلخ تھی۔ یہ ساری گھر گرہستی کے کام تو وہ ابا کی زندگی میں بھی پوری جانفشانی اور تندہی سے کیا کرتی تھی۔ مگر ابا جب آتے تو اس کی فرمائش پر جلیبی، سموسے لاتے تھے۔ اس کی پڑھائی لکھائی کے معاملے میں بھی ابا سخت گیر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر سال اول آتی رہی۔ ہر انسان کی طرح ان میں بھی کچھ اچھائیاں اور برائیاں تھیں۔

وہ ہر معاملے میں راشدہ چچی کو زیادہ فوقیت دیتے۔ ان کی ہر بات کو حرفِ آخر سمجھتے۔ راشدہ چچی تعلیم یافتہ تھیں، جبکہ ان کے مقابلے میں اماں کی بالکل واجبی سی تعلیم تھی۔ اس لیے ابا ہر وقت انہیں ان پڑھ اور گنوار ہونے کے طعنے دیا کرتے تھے۔ وہ ان کے ہر طرح کے طنز کو ہنس کر سہہ لیتی تھیں۔

عمارہ بیگم نے کبھی ابا کے سامنے چرب زبانی سے کام نہ لیا تھا بلکہ ابا کی تند و تیز باتوں کو بھی امرت سمجھ کر پی جایا کرتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ابا شیر ہوتے گئے۔ انہیں عادت ہو چکی تھی، دانستہ و نادانستہ دونوں طرح سے چچی اور اماں کا موازنہ اور تقابل کرنے کی۔

اماں کی بات کو وہ رد کرتے تھے تو ایک تواتر سے رد کرتے ہی چلے جایا کرتے۔ اس کے برعکس راشدہ چچی کی ہر غلط بات بھی درست ہو جاتی تھی۔ بات کرنے کا انداز اور ڈھنگ ہوا کرتا تھا اور راشدہ چچی کو اپنی بات منوانا اور اس کو ثابت کرنا خوب آتا تھا۔

اس طرح ہر بار مات اماں کے حصے میں ہی آیا کرتی اور ابا کے جانے کے بعد تو وہ بالکل ہی جیسے اس گھر کی راجدھانی کی بلاشرکت غیرے مالک بن بیٹھی تھیں۔ اس کی ایک وجہ ان کے شوہر کا اپنی بیوی کو چھوٹ دینا تھا۔ ان کی غلط سلط باتوں میں بھی ان کی خاموشی سے بہت سے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ رشتے اپنی مسلسل حالت میں ہوتے ہوئے بھی ان کی مٹھاس اور لذت سے عاری ہو چکے تھے۔

چچی صرف اپنا ہی سوچتی تھیں، ہر معاملے میں اپنے بچوں کو اولیت دیتی تھیں اور انہیں کسی طرح علینا کا خیال نہ آتا تھا۔ جیسے اس وقت وہ ناشتے کے فوراً بعد ہی مشین لگائے کاموں میں جتی ہوئی تھی۔ ابھی

اسے اماں کو دوا بھی کھلانی تھی سو وہ بالکل خاموشی سے دبے قدموں اماں کے کمرے کا رخ کر چکی تھی۔

اماں گہری سوچ میں گم تھیں۔ اس نے لپک کر اماں کو گلاس میں پانی تھمایا، ساتھ دوا کھلائی تھی۔ اماں اسے دعائیں دینے لگیں اور وہ سوچ کر رہ گئی کہ یہ ڈھیروں ڈھیر دعائیں جو شب و روز اماں کے لبوں پر ورد بن کر جاری رہتی ہیں ان کا نتیجہ کہاں چلا جاتا ہے۔ ان دعاؤں کا ثمر کہاں کھو گیا ہے۔

وہ دیکھ رہی تھی کہ ابھی بھی اماں کو بخار تھا۔

’’اماں! آپ نے بالکل کچھ نہیں کرنا، بس آرام سے لیٹی رہیں۔ میری فیس جمع ہو جائے گی۔ اللہ کوئی نہ کوئی سبب بنا ہی دے گا۔‘‘

وہ اماں کی جانب سے سخت تشویش کا شکار ہو رہی تھی۔ ابا کو تو کھو ہی چکی تھی، اب اماں کو کھونے کا حوصلہ نہ تھا اس میں، اماں اس کی بات پر اثبات میں سر ہلا کر آنکھیں موندے سونے کی کوشش کرنے لگیں۔ دراصل ساری رات کی بے آرامی اور پریشانی کے بعد اب ان میں تھکن سی اترنے لگی تھی۔ یہ تھکن اور مایوسی تو اب ان کی ہڈیوں میں گھس آئی تھی مگر وہ پھر بھی اپنا اور اپنی بیٹی کا بوجھ بانٹنے کے لیے محلے کے بچوں اور بڑوں کے کپڑے سلائی کر کے کچھ گزارا کرنے کی کوشش میں جتی رہتی تھیں۔ اگرچہ اس پر بھی راشدہ نے بہت باتیں بنائیں۔

’’لو جی، اب بتاؤ سارے محلے کو کہ ہم دو وقت کی دال روٹی بھی نہیں کھلا سکتے۔ اتنی تنگی ترشی میں رکھا ہوا ہے ماں بیٹی کو کہ اب ان کو سلائی کڑھائی کی ضرورت پیش آ گئی ہے۔‘‘ وہ اپنا غصہ دباتی پہلی مرتبہ بولی تھیں۔

’’چچی جان! اماں کی پریشانی بجا ہے، میری ایڈمیشن فیس جانی ہے۔ اس کے لیے ہم نہیں چاہتے کہ کسی کے دستِ نگر بنیں۔‘‘ وہ مضبوط لہجے میں جتا گئی۔ وہ جانتی تھی یہاں تو گن گن کر ہر شے دی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ اس سے قورمہ بنانے کا کہہ کر آخری جملہ چچی جان کا یہی ہوا کرتا تھا۔

’’دھیان سے، پکاتے پکاتے کھاتی نہ رہنا۔ میں نے پوری تیں بوٹیاں گن کر دی تھیں تمہیں، بھونتے بھونتے ہاتھ نہ صاف کر لینا۔‘‘ وہ ضبط کی انتہاؤں پر تھی، مگر کہا کچھ نہیں۔ ہمیشہ یہی ہوا کرتا۔ وہ ہر مرتبہ اسی طرح ہر شے کا طعنہ دیئے بنا نہ رہا کرتیں اور وہ بھی سن کر چپ رہتی۔ مگر پہلی مرتبہ اس نے بھی لب کشائی کی اور یوں اماں کپڑوں کی سلائی میں لگ گئی تھیں۔

وہ آخری سال میں تھی کالج کے جب اس سانحے کے بعد اس نے کالج جانا ترک کر دیا تھا کہ گھر کے سارے کام اس کے کاندھوں پر اس خوب صورتی سے لادے گئے۔ وہ اف بھی نہ کر سکی، اب تو ایسا لگتا تھا کہ ان لگاتار کاموں کے عوض ہی اسے اور اماں کو دو وقت کی روٹی میسر ہوتی ہے۔ وہ باہر نکلی تو اسے راہ داری کے اختتام پر راشدہ چچی دکھائی دے گئیں، جو یقیناً اس وقت کچن کا جائزہ لے کر ہی پلٹی تھیں۔ صاف ستھرا چمکتا ہوا کچن دیکھ کر ان کی تسلی ہو گئی، اب وہ اس کی تلاش میں ادھر اُدھر نگاہیں دوڑا رہی تھیں۔

’’کپڑے دھل گئے ہیں کیا؟‘‘

ان کا لہجہ کبھی بھی نرم نہیں ہوا تھا۔ کٹیلا لہجہ، آر پار اترتا ہوا۔ وہ انہیں دیکھ کر رہ گئی، نفی میں سر ہلایا۔

’’تو ادھر اُدھر کیا گھوم رہی ہو، کچھ نہیں ہوتا تمہاری اماں کو۔ بڑی سخت جان، ڈھیٹ عورت ہے۔ توبہ لوگ تو شوہر کے ساتھ ہی چل بستے ہیں، اس کی صحت تو دن بہ دن اچھی ہوتی جا رہی ہے۔ یہ بھی آرام کرنے کے بہانے ہیں، آئے دن بخار چڑھائے رکھنے کے ڈرامے۔‘‘ طنز راشدہ چچی کی فطرت میں تھا۔

وہ ان کی بات سن کر چہرے پر امڈتی ہوئی بے زاری اور نفرت کو چاہ کر بھی چھپا نہ سکی۔ یہ اور کسی کے لیے نہیں بلکہ اس کی اپنی اماں کے بارے میں ان کے فرمودات تھے۔ پھر کپڑوں کی دھلائی اور صفائی ستھرائی کے بعد اس نے کچن کا دوبارہ رخ کیا

☆☆☆

''علینا تمہیں امی بلا رہی ہیں۔'' فروا نے کمرے میں جھانکتے ہوئے اسے اطلاع دی۔ علینا ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی، اس بلاوے کا مطلب یہ تھا کہ آج پھر چچی جان کو اس کی خدمت کی اشد ضرورت پیش آ گئی اور علینا جو بے حد مصروف انداز میں تیزی سے سلائی مشین پر کپڑے سینے میں محو تھی، اس اچانک بلاوے پر دل مسوس کر رہ گئی تھی۔

''فروا بیٹا! سب خیریت تو ہے ناں؟'' عمارہ بیگم نے پوچھا۔ وہ قریب ہی چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ بیماری نے ان کو بے حد کمزور کر دیا تھا، نقاہت ان کے چہرے سے ہویدا تھی۔

''جی تائی جان! سب خیریت ہی ہے۔ دراصل آج آسیہ خالہ آ رہی ہیں ناں۔'' فروا نے کمرے کے ایک جانب رکھے ہوئے موڑھے پر بیٹھتے ہوئے اطلاع دی تھی۔

''اور آپ کو معلوم ہے کہ مجھے تو کچھ اچھا پکانا آتا نہیں ہے اور نہ ہی میرا دل ان کچن کے لمبے چوڑے کاموں میں لگتا ہے۔ اس لیے میں نے تو بھئی اماں کو صاف انکار کر دیا، آپ کی بہن اور اس کا بیٹا آ رہے ہیں، مجھ سے تو نہیں بنتا یہ پرتکلف کھانا، تو انہوں نے فوراً کہا، جا کر علینا کو بلا لاؤ۔''

فروا نے وضاحتی انداز میں اپنے پھوہڑ پن کو چھپانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اچھی طرح سے سمجھ چکی تھیں کہ حسب معمول ایک پرتکلف دعوت کے لیے اب دیورانی کو ذائقہ دار ہاتھوں کی ضرورت تھی اور اللہ تعالیٰ نے علینا کے ہاتھوں میں بہت لذت رکھی تھی کہ کھانے والا کھاتا ہی چلا جاتا تھا، تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

''جاؤ بیٹا! چچی جان انتظار کر رہی ہوں گی۔ باقی کپڑے میں خود سلائی کر لوں گی۔'' عمارہ بیگم نے علینا کو قطعیت بھرے انداز میں کہا۔

''مگر اماں! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، آپ نے بالکل بھی سلائی مشین کو ہاتھ نہیں لگانا ہے۔ میں خود ہی آ کر سارا کام نبٹا لوں گی اور گا ہے بگا ہے آ کر آپ کی طبیعت بھی پوچھتی رہوں گی۔ آپ بالکل پرسکون ہو کر لیٹی رہیے۔ یہ کل تک ہی تو دینے ہیں وسائی کو۔ میں رات بھر میں مکمل کر لوں گی۔'' اس نے فکرمندی سے کہا تھا۔

''اچھا اچھا بیٹی! میں نہیں کرتی یہ کام، تم خود ہی آ کر کر لینا مگر اب جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ وہ غصہ ہوں دیر سے آنے پر۔'' عمارہ بیگم اس کے انداز محبت پر مسکرائیں۔ چچی جان تیز لہجہ میں صفائی ستھرائی کے لیے آنے والی ملازمہ کو ڈانٹ رہی تھیں۔

''اس قدر سست روی سے کیوں ہاتھ چلا رہی ہو۔ جیسے ہاتھوں میں جان ہی نہ ہو۔ تنخواہ کس بات کی لیتی ہو تم اور تنخواہ لینے تو تم یکم سے ہی سر پر مسلط ہو جاتی ہو اور آئے دن کے تقاضے الگ۔'' ملازمہ تنخواہ کا سن کر مزید چابک دستی سے صفائی میں جت گئی تھی۔ ہر انسان کو پیٹ کی مجبوری نے باندھ رکھا تھا۔

''السلام علیکم چچی!'' وہ سلام کرتی ہوئی آگے بڑھی۔ جس کا جواب شاہدہ چچی نے سر کی جنبش سے دیا اور اسی پر اکتفا کیا تھا۔

''اب آ ہی گئی ہو تو ذرا کچن کو دیکھ لو۔ ناشتے کے بعد یوں گم ہو کر بند ہو جاتی ہو کمرے میں۔ تمہیں بلاوے دینے نہ جاؤ تو تم کمرے سے نکلتی ہی نہیں ہو۔''

وہ بالکل چپ تھی۔ جانتی تھی کہ چچی جان احسان جتانے والوں میں سے تو تھیں مگر احسان ماننا ان کی سرشت میں نہ تھا۔

''بریانی بنا لو، رضوان کو بے حد پسند ہے۔ ساتھ میں کوفتے اور کڑاہی۔ دو طرح کے سلاد اور فیرنی میٹھے میں بنا لینا۔''

راشدہ بیگم پرسوچ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگیں۔

''ہاں یاد آیا۔ رضوان کو تمہارے ہاتھوں کے کباب بے حد پسند ہیں، وہ تو لازمی بنانا۔ بچہ اتنے دنوں بعد گھر آ رہا ہے، جب سے گیا ہے اب مہینہ

بعد آ کر ملے گا۔ دیکھو اب ان سارے کاموں میں شام نہ کر دینا۔''

وہ شاہدہ بیگم کو محض دیکھ کر رہ گئی تھی۔ فروا اسے حکم نامہ پہنچا کر نجانے کہاں گم تھی۔ علینا اتنا کچھ بنانے کے تصور سے ہی ہلکان ہو رہی تھی۔ ہر نیا طلوع ہونے والا دن ایک نئی اذیت کا جہان لیے ہوتا تھا۔ وہ سوچوں کے بھنور میں الجھتی تیزی سے ہاتھ چلا رہی تھی۔ کبھی ایک اور کبھی دوسری دیگچی میں چمچہ چلا رہی تھی۔

''ارے واہ، بڑی زبردست خوشبوئیں آ رہی ہیں۔'' فروا نے لمبی سانس کھینچتے ہوئے خوشبو کے احساس کو محسوس کیا۔ علینا فروا کے انداز پر ہولے سے مسکرا دی۔ علینا کے عقب میں ارمان بھی تھا۔

''بھئی ایک کباب تو کھانا بنتا ہی ہے، جلدی سے فرائی کر دو۔'' ارمان نے فرمائش کی، فروا باہر نکل گئی۔ یہ اطلاع دینے کہ ارمان کچن میں ہے کیونکہ ارمان کے اکثر انداز نہ صرف اسے بلکہ اہل خانہ کو بھی چونکا دیا کرتے تھے۔ ارمان کا سامنا اس کے لیے تکلیف دہ ہوتا تھا۔ وہ ایک بے بس لڑکی ان اچھوتے رنگوں کی طلب گار کیسے ہو سکتی تھی، شاید ان خوب صورت رشتوں میں اس کا نام نہیں رقم تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ارمان ایک سراب سے زیادہ کچھ نہیں تب ہی راشدہ بیگم بذات خود کچن میں آ گئیں۔

''ارمان تمہارا یہاں کیا کام۔ باہر بیٹھو، کھانا یوں بھی لگنے والا ہے اور یہ تم آج جلدی کیسے آ گئے؟'' ان کا لہجہ بے حد سنجیدہ اور تلخ سا تھا۔

''اماں آپ نے ہی تو کہا تھا، جلدی آ جانا۔ مہمان آ رہے ہیں۔ بھول گئی ہیں آپ؟'' ارمان نے تحیر سے ماں سے پوچھا تھا اور واقعی راشدہ بیگم کو یاد آ گیا کہ آسیہ بیگم کی آمد کے حوالے سے انہوں نے اسے کہا تھا کہ وہ جلدی آ جائے گھر۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' وہ سر ہلا کر رہ گئیں۔ علینا کباب تل چکی تھی اور پلیٹ میں نکال رہی تھی۔

''مجھے یہیں دے دو بس۔'' وہ وہیں کرسی پر ٹک گیا اور راشدہ بیگم کلس کر باہر نکل گئی تھیں۔

''تمہارے ہاتھ کے بنے کباب مجھے بے حد پسند ہیں۔ بعد میں بھی بنا دیا کرو گی ناں۔'' ارمان کی بات پر اس نے چونک کر دیکھا۔ ارمان کی سرمئی نگاہوں میں کوئی شعلہ سا کوندا تھا۔ محبت کا شعلہ۔

نگاہیں علینا کے بے حد دل کش چہرے پر ٹک سی گئی تھیں۔ علینا کی گہری آنکھوں میں حزن و ملال کی کیفیت رقم تھی جو اس کی تھکان کی مرہون منت تھی۔

ارمان نے تشویش سے اس کا چہرہ دیکھا۔ ارمان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ علینا کے تمام آنسو چن لے اور مسرتوں کے انمول پھول اس پر نچھاور کر دیتا۔ مگر علینا کو اس کا انداز اور وارفتگی پسند نہ آئی تب ہی رخ موڑ کر تیزی سے سلاد تیار کرنے میں منہمک تھی۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ اسے علینا سے محبت تھی، شاید تب سے جب اس نے محبت کا اصل مفہوم جانا تھا۔

مگر وہ جانتا تھا کہ اس کے اور علینا کے درمیان بہت سے فاصلے حائل ہیں اور ان فاصلوں میں سب سے اونچی فصیل اس کی یعنی ماں کی انا کی فصیل جسے عبور کرنا بہ ظاہر ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔

تب ہی باہر شور کی آواز آنے لگی شاید مہمان آ گئے تھے۔ وہ کام نبٹا چکی تھی اور وہ جانتی تھی کہ اب چچی ملازمہ سے ہی کھانا لگوائیں گی۔ ان کو پسند نہ تھا کہ کوئی بھی ان کے کھانے پر نظر رکھے، سامنے لاؤنج کا منظر بے حد واضح تھا۔ بتول اپنی پوری آب و تاب اور حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ اس کے ساتھ ہی رضوان اپنی تمام تر خباثت لیے اسے ہی دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ رضوان کی نگاہوں میں حرص تھی۔

''کام ختم ہو گیا ہے کیا؟'' اس نے آہستہ سے خالہ کو سلام کیا۔ چچی نے اس سے پوچھا تھا۔

''جی۔'' وہ سعادت مندی سے بولی تھی۔

''ہونہہ، ٹھیک ہے پھر تم جاؤ اپنی اماں کو دیکھو

اور ہاں کھانے کے لیے چکر مت لگاتی رہنا۔ میں ملازمہ کے ہاتھوں کچھ بھجوادوں گی۔" علینا کو اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا — اسے مزید وہاں کھڑے ہونا دشوار ترین لگنے لگا تھا۔ ایک پل کو تو اس کا بھی جی چاہا کہ چچی جان کو کوئی سخت کرارا جواب دے مگر اگلے ہی پل وہ چچی جان کی نگاہوں میں پنہاں تضحیک دیکھ کر ہراساں سی اپنے کمرے میں آئی اور بستر پر ڈھے سی گئی تھی۔

"ہونہہ، پہلے تو ہم جیسے ان کا دیا ہوا کھاتے ہیں۔ صبر بسا اوقات اس قدر اذیت ناک ہوا کرتا ہے، مگر صبر کا پھل ہر اذیت کو مٹا دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو ودیعت کرتا ہے مگر ہم جیسوں کو یہ پھل ملا ہے۔"

دو گرم آنسو اس کے گالوں کو نم کر گئے۔ وہ کافی دیر تک اپنی قسمت پر ماتم کناں رہی تھی اور نیچے سے گاہے بہ گاہے قہقہوں کی آواز گونجتی رہی تھی۔ تب ہی عمارہ بیگم نے کروٹ بدل کر اسے دیکھا تو وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے چپ ہوگئی۔ مبادا اس کی ماں پریشان نہ ہو جائیں۔

"ہو گیا سارا کام علینا!" انہوں نے پوچھا۔

"جی اماں۔" تب ہی دروازے پر ہولے سے دستک ہوئی اور ارمان داخل ہوا تھا۔

"السلام علیکم تائی اماں! کیسی طبیعت ہے اب؟" وہ شائستگی سے ان کا احوال پوچھ رہا تھا۔

"وعلیکم السلام! جیتے رہو۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے دعا دینے لگیں۔ عمارہ بیگم کو ارمان کی آمد سے بے انتہا خوشی محسوس ہوتی تھی، وہ اکثر ان کا احوال پوچھنے آجایا کرتا تھا۔

"علینا بیٹا! کیا بات ہے بہت چپ ہو۔" عمارہ بیگم نے دیکھا کہ علینا اپنے ہاتھوں کے ناخنوں سے کھیل رہی تھی۔ دراصل وہ اپنی خفت چھپانے کی سعی میں ہلکان ہو رہی تھی کیونکہ اس کے سامنے ہی تو عزت افزائی ہوئی تھی۔ بتول کے چہرے پر اس وقت شدید تمسخر تھا۔

بتول کے لیے اس کے دل میں کوئی احساس نہ تھا، مگر بتول نجانے کیوں اس سے رکھتی تھی۔ اس کو دیکھ کر اکثر ذومعنی جملے بولتی۔ اس دلچسپی جو ارمان کی ذات سے منسوب تھی، اب سے بھی مخفی نہیں رہی تھی۔ سب جانتے تھے کہ ارمان پر بہت ہی حق جتاتی۔ بعض اوقات وہ حد کر دیتی تھی۔

"تائی اماں! میں آپ کی دواؤں کا یہ نسخہ کر مزید دوا لایا ہوں۔"

اس نے لپک کر جیب سے دوا نکالی اور اماں ایک بار پھر اشک بار سی اسے دعائیں دی میں منہمک ہو گئیں۔ تب ہی عقب سے ملازمہ آ گئی۔

"تائی اماں! کھانا وقت پر کھایا کریں اور بھر کر کھایا کریں۔ کسی پر بوجھ نہیں ہیں آپ بلکہ آپ کا بھی اتنا ہی ہے، جتنا ہمارا ہے بلکہ یہ ہے آپ کا بیٹا! آپ کے لیے کمانے والا۔ کسی بات فکر نہ کریں۔"

وہ فرضی کالر جھاڑتا ہوا بولا اور اس کی اس عمارہ بیگم نہال ہی تو ہو گئی تھیں۔ کس قدر اچھا ہے، وہ سوچ کر رہ گئی تھیں جبکہ اس کی اماں کے کڑواہٹ سے تو سب ہی بخوبی واقف تھے۔

تب ہی دروازہ کھول کر بتول اندر آ گئی تھی

"کیا بات ہے، ہم مہمانوں کو چھوڑ کر تم بیٹھے ہوئے ہو۔" بتول نے کمرے کا جائزہ ہوئے کہا تھا۔

"آ ہی رہا ہوں، تم جاؤ باہر۔ بیٹھو۔" ار انداز سراسر ٹالنے والا تھا۔ بتول نے ایک تر چھی علینا کے دل کش چہرے پر ڈالی۔ سفید رنگت اور بڑی سی آنکھیں اس سادگی میں بھی وہ پیاری رہی تھی۔

"باہر ڈیڈ بھی آ گئے ہیں، پوچھ ر تمہارا۔" اس نے ارمان کو اٹھا کر ہی دم لیا تھا

"او کے بابا، چلو۔" وہ زچ سا ہو کر اٹھ

ارمان کو جاتا دیکھ کر نجانے کیوں علینا کے اندر بے حد تلخی گھل گئی تھی۔ نظروں سے محبت کرنے والوں کے دعوے اکثر بودے ثابت ہوتے ہیں۔ وہ اماں کے ساتھ خاموشی سے سارے خیالات جھٹک کر کھانا کھانے لگی۔ یوں بھی اسے زوروں کی بھوک لگی تھی۔

☆☆☆

انصار صاحب گروپ آف کمپنیز کے مالک تھے۔ ارمان ان کے ساتھ ہی کام کرتا تھا۔ دراصل ان کا بیٹا رضوان ان کا ہاتھ نہیں بٹاتا تھا اور ساری ذمہ داری ان کے کندھوں پر آن پڑی تھی۔ اس لیے انہوں نے ارمان کو اس بزنس میں شامل کر لیا تھا۔ ایم بی اے کے بعد یوں بھی وہ فارغ ہی تھا۔

وہ حتی الوسع کوشش کرتے تھے کہ وہ حقوق کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہ کریں۔ وہ رزق حلال کمانے کے قائل تھے وہ نہایت عبادت گزار نمازی اور پرہیز گار تھے۔ اس قدر مال و دولت کے باوجود ان کی خواہشات نے ان کو کبھی اپنا غلام نہیں بنایا تھا۔ مگر ان کا اکلوتا بیٹا رضوان ایک سطحی ذہن کا مالک انسان تھا جو نہ صرف مطلب پرست اور کینہ پرور تھا بلکہ اعلا درجے کا دھوکے باز انسان تھا۔ آسیہ بیگم بھی ایک نیک خاتون تھیں۔ بتول خود سر تھی۔ رضوان باپ کی جائیداد اپنے نام کر لینا چاہتا تھا۔

"یہ سارا کاروبار تمہارا ہی ہے۔ اس لیے تمہیں ہی اس کاروبار کی دیکھ بھال کرنا ہوگی۔" رضوان آرام طلب تھا۔ آئے دن لڑکیوں سے دوستی کر کے ان کو چھوڑ دینے کا قائل تھا۔ باپ کی کوئی بھی نصیحت اس پر اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ دو مرتبہ حوالات کی سیر بھی کر چکا تھا۔ ایک دن انصار بزمی صاحب نے رضوان کو رنگے ہاتھوں ان کے لاکر سے نوٹوں کے بنڈل نکالتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

اگرچہ وہ ہر ماہ ایک معقول رقم رضوان کو دیا کرتے تھے اور یہی نہیں اس کی ہر جائز خواہش پوری کرتے تھے۔

"یہ کیا کر رہے ہو رضوان! اپنے ہی گھر میں نقب زنی کر رہے ہو۔" انصار بزمی صاحب کا لہجہ بے حد گرج دار تھا۔

"کیا کر رہا ہوں ڈیڈ! اپنا حق ہی تو لے رہا ہوں اور یوں بھی ڈیڈ! یہ سب آپ کے بعد میرا ہی تو ہے۔ اب اگر آپ تمام پراپرٹی اور شیئرز میرے نام کر دیں تو مجھے کیا ضرورت ہے یوں رقم لینے کی۔ آپ تمام جائیداد میرے نام منتقل کر دیں اور اللہ اللہ کریں۔"

رضوان کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔ شرمندگی کا کوئی شائبہ تک اس کے لب و لہجہ میں نہ تھا۔ وہ نخوت سے اکڑا کھڑا تھا۔

"شرم کرو رضوان! کچھ تو پاس ادب رکھا ہوتا کہ تم اپنے باپ سے مخاطب ہو اور کیا کہا تم نے۔ تمہارے نام کر دوں یہ ساری پراپرٹی اور تمام شیئرز تاکہ تم یہ سب جوئے میں اڑا دو۔ یہ سب میری محنت کی کمائی کا ثمر ہے، تمہاری عیاشیوں پر اڑانے کے لیے نہیں ہے یہ سب اور عبادت الٰہی کا لطف بھلا تم کیا جانو کیونکہ تمہاری راتیں تو کلبوں میں بسر ہوتی ہیں۔ مجھے تو شرم محسوس ہوتی ہے، یہ کہتے ہوئے بھی کہ تم میرے بیٹے ہو۔

ابھی بھی وقت ہے رضوان! توبہ کا دروازہ کھلا ہے، وہ دروازہ میرا رب ہر انسان کے لیے ہمیشہ کھلا رکھتا ہے۔ تم بھی توبہ کرو۔" رضوان نے یہ سارا لیکچر بے زاری سے سنا تھا اور نوٹوں کی گڈیاں اٹھاتے ہوئے — بولا تھا۔

"ڈیڈ! میرا تو سب کچھ بس یہی ہے۔ روپیہ ہے تو سب کچھ اپنا ہے، مجھے کسی بھی شے کی طلب نہیں ہے۔" وہ بے حد ڈھٹائی سے بولا تو انصار بزمی صاحب سخت طیش کے عالم میں اس کو مارنے کے لیے بڑھے۔ تب ہی عین وقت پر آسیہ بیگم چیخ و پکار سن کر جاگ گئیں، انہوں نے باپ اور بیٹے کے درمیان بیچ بچاؤ کرایا تھا — اور موقع دیکھ کر رضوان بھاگ کھڑا ہوا، جبکہ انصار بزمی صاحب دکھ کے گہرے پاتال میں ڈھے سے گئے تھے۔

''یہ سب تمہاری ہی بے جا ڈھیل کا نتیجہ ہے۔ اگر ارمان نے سارا کاروبار سنبھال نہ لیا ہوتا تو سارا کاروبار ٹھپ ہو جاتا۔ میری طبیعت کی خرابی کے باوجود وہ تندہی سے سارے معاملات سنبھال رہا ہے۔ جبکہ یہ میرا خون ہے آہ......'' وہ دکھ سے بولے تھے۔

واقعی یہ سچ تھا کہ ارمان ان کے وسیع و عریض کاروبار میں ان کے لیے بے حد معاون و مددگار ثابت ہو رہا تھا۔ وہ اس کی دور اندیشی اور معاملہ فہمی کے قائل تھے اور — اس کے احسان مند بھی تھے۔

آسیہ بیگم اسے گھر داماد بنانے کے خواب دیکھتی رہتی تھیں۔ کئی مرتبہ اشارے میں وہ اس کا ذکر اپنی بہن شاہدہ سے بھی کر چکی تھیں مگر انتظار میں تھیں کہ وہ اب دوٹوک انداز میں خود پوچھے مگر نجانے کیوں شاہدہ بیگم خاموش تھیں۔

یہ تو سچ تھا کہ وہ بتول سے بے پناہ پیار کرتی اور اس کے ناز بھی اٹھاتی تھیں مگر اس میں خالہ والی چاہت کا عمل دخل تھا۔

☆☆☆

''کیا بنا رہی ہو بھئی علینا ڈیئر!'' رضوان دندناتا ہوا کچن میں داخل ہوا تھا۔ علینا نے گھبرا کر پلٹ کر دیکھا اور جلدی جلدی کام کی طرف اپنا دھیان لگا کر اسے نبٹانے میں جت گئی۔

''چلو بھئی اب اپنے مرمریں ہاتھوں سے ایک کپ چائے ہی بنا دو، سر میں شدید درد ہے اور سر بھاری سا ہے۔'' وہ لوگ ابھی — ادھر ہی رہنے والے تھے اور وہ دن علینا کے لیے سخت اذیت ناک ہوا کرتے تھے۔

''ویسے کیا بات ہے ایک گھر میں رہ کر بھی دکھائی نہیں دیتی۔ کچن میں ہی گم کھا مڑ بنی رہتی ہو۔'' اس نے علینا کے عین سامنے رکھا ہوا کھیرا اٹھا کر منہ میں رکھا۔ کچھ اس طرح سے کہ علینا کے کندھے سے اس کا کندھا ٹکرایا۔ علینا نے وحشت سی محسوس کی تھی۔

''جی، چائے بناتی ہوں، آپ آرام سے باہر جا کر بیٹھیں۔'' وہ شدید الجھن زدہ لہجہ میں بولی۔

''میں نے پوچھا، گم کہاں رہتی ہو؟'' اس کی نگاہیں اس کے سراپے کا طواف کر رہی تھیں تب ہی علینا جو چائے کے لیے کپ نکال رہی تھی اس کے جملے پر گڑبڑا کر کپ گرا بیٹھی تھی۔

''کیا فائدہ اتنا پڑھنے کا، میرے پاس ہی آ گئی ہے تم نے۔'' اس کی نگاہیں اس کے آر پار اتر رہی تھیں۔ کانچ کے ٹوٹنے کی آواز پر راشدہ بیگم سخت اشتعال میں تنتاتی ہوئی کچن میں داخل ہوئیں اور اسے صلواتیں سنا رہی تھیں۔ اسے چچی جان کی آمد کبھی اچھی نہ لگی تھی مگر اس وقت ان کا کچن میں آنا اس کے لیے بے حد تقویت کا باعث بن گیا تھا۔

''ارے بیٹا! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' وہ متعجب تھیں۔

''جی خالہ! چائے کا کہنے آیا تھا۔'' اس نے اپنے بالوں میں انگلیاں گھماتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو باہر بیٹھو ناں، یہاں تو گرمی ہے میں کہتی ہوں چائے ہی کیوں ساتھ کچھ اور بھی کھا لینا۔''

وہ باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد راشدہ بیگم نے اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورا تھا۔

''کام کرتے وقت دھیان کہاں رہتا ہے تمہارا۔'' وہ کینہ توز نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ وہ سمیٹنے لگی تھی۔ اس نے سینڈوچ بنایا اور چائے ٹرے میں رکھ کر۔ فارغ ہوئی تھی کہ ملازمہ آتی دکھائی دی۔

''جاؤ یہ باہر رضوان صاحب کو دے آؤ۔'' ملازمہ سر ہلاتی ہوئی ٹرے لے گئی۔ اس کے اندر خوف تھا۔ اف یہ رضوان بھائی کیا کہہ رہے تھے۔ خدا نہ کرے کبھی ایسی نوبت آئے۔

☆☆☆

وہ بے حد گھبراہٹ میں خالق حقیقی سے دعا گو تھی۔ اس کے آنسو ایک تواتر سے اس کا

بھگو رہے تھے۔ مجبوری نے اسے آج کس مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔ جہاں زبان پر بھی بندش تھی۔

''علینا چلو آج آرٹ فیسٹیول ہے ساتھ ہی چلتے ہیں۔ اب چوبیس گھنٹے کیا کچن میں ہی گھسی رہتی ہو۔ کسی وقت میرے لیے بھی وقت نکالو۔ آدھے گھنٹے میں تیار ہو کر آ جاؤ میں منتظر ہوں۔ ارمان بھائی ہمیں ڈراپ کر دیں گے۔'' فروا نے علینا کو کندھے سے تھاما تھا۔

''مگر میں کیسے جا سکتی ہوں۔'' وہ پریشان ہو اٹھی۔

''ارے کیا تم ملازمہ ہو۔ مانا کام کرتی ہو۔ مگر میں نے بھی تائی اماں سے اجازت لے لی ہے۔ رہی بات امی کی۔ ان سے بھی پوچھ لیتی ہوں تم جاؤ اب''

وہ شاید اکیلے جانا نہیں چاہتی تھی۔ یوں بھی چچی جان اسے اکیلا کہیں بھی بھیجنے کی اجازت کم ہی دیا کرتی تھیں۔

''اف یہ فروا بھی پوچھتی نہیں ہے۔ صرف اپنے فیصلے مجھ پر مسلط کر دیتی ہے۔ بالکل اپنی اماں کی طرح'' وہ بے دلی سے سوچتی ہوئی کمرے میں الماری میں سر دیے سوچ کر رہ گئی تھی۔

''اب کیا پہنوں؟'' تب ہی اس کی نگاہ پرپل کلر کی لانگ فراک پر ٹک سی گئی۔ یہ وہ آخری لباس تھا۔ جو بابا اس کے لیے لائے تھے۔ اور وہ بعد میں پہنوں کی سوچ کر آج تک نہیں پہن پائی تھی۔ اس نے اسے نکالا اور جلدی سے شاور لینے گھس گئی تھی۔ تب فروا نے اندر جھانک کر دیکھا۔ ایک مدت کے بعد وہ تیار ہوئی تھی۔ ورنہ گھر میں اس کا اجاڑ حلیہ اور پرانا سا لباس ہی اس کا ترجمان بن چکا تھا۔

''ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی ہو۔'' امی نے اس کا ماتھا چوم کر کہا۔ وہ جیسے ہی فروا کے ساتھ نکلی لاؤنج میں آسیہ بیگم اور شاہدہ بیگم باتوں میں مصروف تھیں۔ اسے آتا دیکھ کر شاہدہ بیگم کے ماتھے پر شکنوں کا جال سا بن گیا تھا۔

''تم بھی ساتھ جاؤ گی کیا؟''

ان کا لہجہ بے حد سرد تھا۔ فروا جھٹ بولی تھی۔

''جی امی، میں نے ہی کہا تھا علینا سے ہر وقت کام میں کولہو کے بیل کی طرح جتی رہتی ہے کسی وقت اسے بھی تفریح کرنا چاہیے ناں۔''

فروا نے ہنس کر کہا۔ مگر شاہدہ بیگم کا اطمینان تو اس کے بے حد خوب صورت چہرے کو دیکھ کر رخصت ہو چکا تھا۔ وہ ماں کے تاثرات نہ بھانپ سکی۔ جو علینا کا طائرانہ جائزہ لینے کے بعد سخت آف موڈ میں تھیں ارمان کی نگاہوں میں علینا کے لیے پنہاں ستائش کے گہرے رنگ شاہدہ بیگم سے مخفی نہ رہ سکے تھے۔

دل تو چاہ رہا تھا کہ وہ اسے جانے سے روک دیں۔ مگر وہ بہن کے سامنے بری نہیں بننا چاہتی تھیں۔ اس لیے موقع کی نزاکت کو دیکھ کر چپ تھیں۔

ارمان علینا کو بیک ویو مرر سے دیکھ رہا تھا۔ علینا اپنے نازک سراپے سمیت اس کے دل پر دستک دیے جا رہی تھی۔ علینا نے بھی ارمان کی نگاہوں میں چھپی محبت کو بھانپ لیا تھا۔

محبت کے انوکھے جذبے اس کے در دل پر بھی دستک دینے لگے تھے جنہیں وہ تھپک تھپک کر سلا رہی تھی۔

''لیتے آؤں تو ڈنر ساتھ ہی کریں۔'' اس نے مخاطب تو فروا کو کیا تھا مگر سوالیہ نگاہیں علینا کے چہرے پر بھٹک رہی تھیں۔ اس کا لہجہ بے حد خوشگوار سا تھا۔

''اوہ سو نائس آف یو ارمان بھائی! بہت ہی مزہ آئے گا پھر تو یہ ایک یادگار سہانی شام بن جائے گی۔'' وہ خوشی سے بولی تھی۔

''ہاں بالکل، ایک یادگار سہانی شام'' ارمان کا لہجہ خاصا بھاری اور جذبات کی شدت سے مغلوب تھا۔ فروا نے تو محسوس بھی نہ کیا۔ مگر علینا بے حد نروس ہو گئی تھی۔ باقی کا رستہ خاموشی سے کٹا تھا۔ اترتے

وقت نجانے کیا کہہ کر علینا کی طرح فروانے ارمان کو بھی اندر جانے پر آمادہ کرلیا اور وہ مان بھی گیا تھا۔

☆☆☆

رنگ و بو کا جیسے سیلاب امڈ آیا ہو۔ لوگوں کا ایک جوم بکیران تھا۔ نامی گرامی شخصیات بھی مدعو تھیں۔ ان کی لازوال پرفارمنس نے ان کے دل و دماغ پر بھی ایک گہری چھاپ چھوڑی تھی۔ خاص کر جب اداکاری کرتی ایک بچی بھوک کی شدت سے تڑپتے ہوئے وہیں اسٹیج پر ڈھیر ہوگئی۔ تو علینا اپنی نگاہوں میں امڈ آنے والے آنسوؤں کو روک نہ پائی تھی۔

''ارے بھئی ڈیئر کزن! مانا کہ تم روتے ہوئے بے حد حسین لگتی ہو مگر یہ کیا ہر وقت کا رونا دھونا۔''

ارمان نے اس کے کان کے پاس منہ لا کر کہا۔ وہ خجل سی ہوگئی اور اپنی چھوٹی سی سرخ ہوتی ناک کو ٹشو پیپر سے رگڑ ڈالا تھا۔

وہ ایسی ہی تھی حساس دل کی مالک، سب کے دکھ درد محسوس کرنے والی۔

واپسی پر علینا بالکل خاموش تھی۔ دل خوش فہم کو سمجھانے میں ہلکان پھر انہوں نے بے حد اچھے سے ریسٹورنٹ میں ڈنر کیا۔

جب وہ لوگ واپس گھر لوٹے تو رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ سب ابھی جاگ ہی رہے تھے لاؤنج میں داخل ہوئے تو سامنے ہی شاہدہ بیگم زوہیب صاحب کے ساتھ بیٹھی تھیں۔

''بیٹا بہت دیر کردی تم لوگوں نے، شہر کے حالات کا علم ہے ناں۔''

زوہیب صاحب کے لہجے میں فکر مندی گھلی تھی۔

''بتول بے حد خفا ہوگئی ہے۔'' یہ ایک نئی خبر تھی۔ ''اس کو ساتھ کیوں نہیں لے گئے تم لوگ۔ وہ یہاں مہمان تھی اور تم اس مہارانی کو ساتھ لے گئیں۔ بتول بور ہوکر انتظار کرکر کے چلی گئی ہے۔'' شاہدہ بیگم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ علینا کا منہ تھپڑوں سے لال کردیں۔

''امی میں شدید تھک چکا ہوں اور بحث نہیں چاہتا۔ بتول کل ہی تو لنچ پر گئی تھی۔ کیا ہر دفعہ اس کا جانا ضروری ہے۔'' وہ لمبے ڈگ بھرتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بھی اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ اماں سو چکی تھیں۔ وہ بھی کپڑے تبدیل کرکے سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔

اس نے آنکھیں بند کیں۔ دو سرمئی نگاہیں اس سے شکوہ کناں تھیں وہ نگاہیں کسی اور کی نہیں ارمان کی تھیں۔

''آہ تو کیا میں بھی اس راہ کی مسافر بن گئی ہوں جہاں دکھ کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ جہاں خاردار راستے پاؤں کو لہولہان کرڈالتے ہیں اور آبلہ پائی کا یہ سفر اسے اذیت کی انتہاؤں پر پہنچا گیا۔

وہ صرف آزردگی سے سوچ کر رہ گئی۔ محبت نے اسے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور اس محبت کو چاہ کر بھی اپنے دل کے نہاں خانوں سے نکالنے میں ناکام رہی۔ پھر نہ جانے کب وہ نیند کی وادیوں میں اترتی چلی گئی۔

☆☆☆

مسلسل بیل بج رہی تھی۔ اور ارمان کال ریسیو کیے بنا ہی بار بار اسے کاٹ رہا تھا۔ وہ جتنا بتول سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ وہ اتنا ہی اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ جب بیسویں مرتبہ بھی گھنٹی بجی تو ارمان نے بے حد بے زاری اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں کال پک کی۔

''تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟'' وہ سخت لہجے میں بول رہا تھا۔

''کیا ہوا، ایسے کیوں بول رہے ہو۔ ایک تو میری کال کاٹتے رہے ہو۔'' وہ تیزی سے بولی۔

''میرے پاس تمہارے فضول سوالات کے جواب دینے کا وقت نہیں ہے۔ تم مجھے بتاؤ کیا کوئی اور کام نہیں ہے۔'' ارمان نے غصیلے انداز میں کہا تو دوسری طرف چند لمحات کے لیے بالکل خاموشی چھا گئی تھی۔

''تم آج کل گھر بھی نہیں آتے ہزار مرتبہ تب بھی کال اٹینڈ نہیں کرتے ہو۔ اس دن مجھے اگنور کرکے تم علینا کو لے گئے۔ کیا میں اتنی ہی غیر اہم ہوں کہ مجھے ساتھ لے جانا بھول گئے۔'' اس کا لہجہ جتاتا سا تھا۔

''تم کیا چاہتی ہو کہ میں ہر وقت تمہارے آگے پیچھے گھومتا رہوں۔ میری زندگی میں بہت سی ترجیحات ہیں۔ رہی بات تمہارے گھر آنے کی تو مجھے فرصت نہیں ہے۔ یہ بات۔ تم جتنی جلدی سمجھ لو تو اتنا ہی اچھا ہوگا کہ تم میرے لیے محض کزن ہو، اس سے بڑھ کر اور کچھ بھی نہیں، تمہارا یوں مجھ پر حق جتانا مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہے۔''

ارمان نے سخت لہجے میں باور کروایا تھا۔

''اوہ تو وہ کیا ہے تمہاری جو تمہارے حواسوں پر پوری طرح سے چھائی ہوئی ہے۔ وہ علینا، کیا وہ کزن نہیں ہے یا وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔'' بتول کا لہجہ خونخوار ہورہا تھا۔

''وہ میرا مکمل جہان ہے تسلی ہوگئی یا اور کچھ؟''

اس کے کہنے پر دوسری طرف خاموشی چھا گئی اور فون جھٹکے سے بند کردیا گیا تھا۔

☆☆☆

''کیا بات ہے کس سوچ میں گم ہو؟''

انصار بزمی صاحب نے ارمان کو آج بہت الجھا ہوا دیکھا تو ٹوکے بنا نہیں رہ سکے تھے۔ وہ لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نگاہیں جمائے بیٹھا نجانے کن سوچوں میں غلطاں تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ وہ بسا اوقات ان سے کچھ کہتے کہتے رک جاتا تھا۔

''دراصل بات یہ ہے کہ مجھے کوئی ایسا شخص نہیں مل رہا جو اس معاملے میں میرے لیے معاون ثابت ہو۔ امی کا رویہ جو علینا اور تائی اماں کے ساتھ ہے اسے دیکھ کر میرا دل کڑھتا ہے۔ مگر ماں سے بدتمیزی بھی نہیں کی جاسکتی۔ اگرچہ میں نے کئی مرتبہ ان کے تلخ رویے کا احساس دلانا چاہا۔ اور سب سے اہم بات میں علینا کے دکھ دور کرنا چاہتا ہوں۔ علینا کے پیپرز ہورہے ہیں اس کے بعد میں چاہتا ہوں کہ علینا کہیں اور گھر بسانے کے بجائے میرے ہی گھر کو بسائے، سنوارے، اپنائے۔''

وہ بولا تو بولتا ہی چلا گیا تھا۔ انصار بزمی صاحب کو حیرت ہورہی تھی کیونکہ گھر میں تو اس کے اور ان کی بیٹی کے حوالے سے اکثر بات ہوا کرتی تھی۔ مگر انہوں نے ایک فطری جھجک کے پیش نظر ابھی تک اس سے براہ راست بات نہیں کی تھی اور آج وہ ان کے سامنے علینا کے لیے سچے اور کھرے جذبوں کا اظہار کررہا تھا۔ وہ سوچ کر رہ گئے تھے کہ یہ سب کیا ہے۔ مگر انہوں نے اپنے جذبات پر بخوبی قابو پالیا تھا۔

''یہ تو خوشی کی بات ہے۔ میں خود باجی سے اس سلسلے میں بات کروں گا اور بھائی صاحب سے بھی۔ تم بالکل بھی پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ مجھے خوشی ہے کہ اس طرح ایک یتیم، بے سہارا بچی کے سر پر ایک مضبوط سائبان بھی میسر آسکے گا۔ وہ بھی تم جیسا ماشاءاللہ۔'' وہ واقعی خوشی سے بولے تھے۔ بتول خودسر اور ضدی تھی۔ مگر اس کے لیے تو کوئی بھی بہترین لڑکا مل سکتا تھا۔ یہاں تو معاملہ دل کا تھا۔ وہ دل سے علینا کا خواہش مند تھا تو ان کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔

وہ یہ سوچ کر بھی خوش تھے کہ علینا کے دکھوں کے دن اس طرح ختم ہوجائیں گے۔ اگرچہ ان کی بہن (یعنی سالی) نے کبھی ان کے سامنے علینا سے بدزبانی نہیں کی تھی۔ مگر وہ جانتے تھے کہ وہ ان سے ناروا سلوک روا رکھتی ہیں اور اکثر اسے زچ کیے رکھتی ہے اور اس لیے وہ ارمان کے حوالے سے یہ بات سن کر خوشی محسوس کررہے تھے۔ ایک گھر ایک آشیانہ بکھرنے سے بچ جائے گا۔ اور وہ آسیہ بیگم کی بات سے ویسے بھی متفق نہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ارمان ایک خودمختار اور اپنی انا کو لے کر چلنے والا لڑکا ہے۔ اور وہ گھر دامادی کسی صورت بھی قبول کرنے والا نہ تھا۔ وہ تو یہ جاب بھی چھوڑ دیتا اور وہ تنہا ہی رہ جاتے۔ وہ اس کی عادات واخلاق واطوار کے دل

سے معترف تھے۔

ارمان خوشی سے ان کو دیکھتا چلا گیا۔ وہ واقعی بے حد نیک انسان تھے۔ انہوں نے کسی طرح کی خفگی کا اظہار نہ بلکہ اس کی مدد کا وعدہ بھی کیا تھا۔

☆☆☆

وہ پیپر دے کر جیسے ہی کالج سے باہر نکلی۔ سامنے ہی ارمان کو سن گلاسز لگا کر گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑے دیکھ کر ٹھٹک سی گئی۔ وہ وجیہہ صورت تو تھا ہی ازل سے۔ مگر آج بہت خاص تیاری سے آیا تھا۔ علینا نے چاہا کہ کاش وہ اسے نظر انداز کر کے گزر جائے مگر ایسا ممکن ہی کہاں تھا۔ وہ شاید اسے ہی لینے کے لیے یہاں آیا تھا۔

”علینا میں آفس سے سیدھا تمہیں پک کرنے کے لیے آیا ہوں۔ ابا نے بھیجا ہے۔“ ارمان کی بات پر وہ ایک خاموش نگاہ اس پر ڈالتی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی۔

”مجھے دیکھ کر نظر انداز کیوں کیا تم نے۔“

ارمان کے لبوں سے شکوہ پھسلا تھا۔ ”یوں جیسے کسی بلا کو دیکھ لیا ہو۔“ وہ نروٹھے پن سے بولا تھا۔

”آپ کون سا کسی بلا سے کم ہیں۔“

بے ساختہ ہی علینا کے لبوں سے نکلا تھا۔ پھر وہ اچانک ہی چپ ہو گئی تھی۔

”اچھا تو آج تمہیں بھی زبان مل گئی ہے۔“ ارمان نے کچھ طنزیہ کہا۔

”ہاں جی مل گئی ہے کہتے ہیں تو نہیں بولتی۔“ وہ ناراض ہو گئی تھی۔

”اچھا یہ بتاؤ تمہارا موڈ کیوں اتنا آف ہے۔ ویسے تمہارا بولنا اچھا لگا۔“ ارمان مسکرایا تھا۔

”آپ کو کیسے معلوم ہوا میرا موڈ آف ہے۔“ وہ تحیر زدہ رہ گئی تھی۔ اس کا پیپر کچھ اچھا نہیں ہوا تھا اس لیے وہ کچھ دل گرفتہ سی تھی۔ گھر کے کام کاج میں اس کی پڑھائی کا حرج ہو رہا تھا۔

”تمہارے چہرے کی چمک ماند پڑ جاتی ہے۔ جب تمہارا موڈ خراب ہو۔“

ارمان نے جذب کے عالم میں اس کا چہرہ تکتے ہوئے کہا تو وہ اپنی جگہ پر جز بز سی ہو گئی تھی۔

”میں۔۔۔ آج بہت ضروری بات کرنے کے لیے یہاں آیا ہوں۔ میں نے آج امی سے بات کی ہے وہ کچھ دن غصہ کریں گی مگر تم ہمت نہ ہارنا، بالآخر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر ہم دونوں ہوں گے اور خوب صورت زندگی۔ تم بس اتنا کرنا جب تائی اماں پوچھیں تو میرا نام لینا۔“

”آپ کو تو اور بھی بہت اچھی اچھی لڑکیاں مل جائیں گی۔ پھر وہ بتول بھی تو ہے۔ کیا آپ کو نہیں معلوم وہ آپ کے معاملے میں کس قدر پوزیسو ہے۔“ علینا نے بھی آج صاف بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔

”اوہ تو تمہاری اس ناراضی کا سبب بتول ہے۔ مگر علینا جب میرے دل میں بتول کے لیے کوئی جذبہ ہی نہیں تو اس میں میرا کیا قصور؟ اس طرح نہ میں اس کو خوش رکھ پاؤں گا اور نہ ہی خود خوش رہوں گا۔ تم جانتی ہو کہ میرے دل پر صرف تمہارا نقش ہے۔“

ارمان نے سادگی سے اپنے صاف وشفاف جذبات کو عیاں کر دیا۔ اب علینا اس کو کیا بتاتی کہ وہ چچی جان کے طعنوں اور گز بھر لمبی زبان کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ اس دن کے بعد جب وہ فروا کے ساتھ گئی تھی۔ چچی جان کا رویہ بے حد برا ہو چکا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ ارمان کی نگاہوں کا خواب ہے۔ ارمان کی محبت بھی علینا کے لیے خاص الخاص تھی۔ وہ اس محبت کو اگر پا نہیں سکتی تھی تو کم از کم اس محبت کے احساس کو تو دل میں کسی خوش کن یاد کی مانند رکھ سکتی تھی۔

”ارمان میں کوشش کروں گی کہ آپ کو من چاہا جواب مل جائے۔“ گھر کے قریب اترتے وقت کئی دھنک رنگ علینا کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔

”تم جاؤ۔ میں شام کو گھر آتا ہوں آفس سے۔“ وہ اسے اتار کر گاڑی آگے بھگا لے گیا تھا۔

”کس کے ساتھ آئی ہو علینا۔“ چچی جان نے اسے گیٹ سے داخل ہوتے دیکھ کر پوچھا تھا کیونکہ زوہیب صاحب کی طبیعت ناساز تھی اور وہ تو گئے نہیں تھے اسے لانے کے لیے۔

”جی میں ارمان کے ساتھ آئی ہوں۔“ علینا نے بنا کسی جھجک کے جواب دیا۔

”اچھا اب تم چوری بھی کرو گی اور پھر سینہ زوری بھی کرو گی۔ کیا تربیت کی ہے تمہاری ماں نے۔ میرے بیٹے پر تم نے جو اپنے عشق کا جادو چلایا ہے نا۔ میں وہ دو دن میں اتار پھینکوں گی۔ وہ میرا بیٹا ہے کسی زعم میں مت رہنا کہ وہ تمہارے لیے مرا جا رہا ہے میں اس کی شادی کسی اعلا خاندان میں کروں گی۔“ چچی جان نے آج بدلحاظی کے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے تھے ــــــــ آج اس کے انداز میں اعتماد تھا۔ خوف نہیں۔ تب ہی بنا کسی اعتراض کے چپ چاپ اندر بڑھ گئی۔

☆☆☆

”یہ کیا کہہ رہی ہو، رضوان کی حرکتیں دیکھی ہیں تم نے اور مجھ سے پوچھے بنا تم نے کیسے علینا کا رشتہ مانگ لیا۔“ انصار بزمی صاحب پریشانی سے آسیہ بیگم کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

”تو اس میں حرج کیا ہے۔ علینا یوں بھی یتیم ہے۔ بے سہارا اور میرا بیٹا کروڑوں کی جائیداد کا وارث ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہاں سے مثبت جواب ہی آئے گا مجھے یقین ہے۔ میں تو بات کر آئی ہوں۔“

دراصل آسیہ بیگم نے یہ سب خود راشدہ کے بلاوے پر کیا تھا۔ ایک تو وہ خود بھی بتول اور ارمان کو یکجا کرنے کی خواہاں تھیں۔ دوسرا علینا نام کا کانٹا آسانی سے نکل رہا تھا۔

”اوہ اب میری سمجھ میں آیا کہ رضوان دو دن سے آفس آنا کیوں شروع ہو گیا ہے۔ میں سمجھتا رہا کہ شاید اسے عقل آ گئی ہو گی۔ بوڑھے باپ کو دیکھ کر شرم آ گئی ہو گی۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ رہی بات علینا کی تو اس کی خوشی ارمان کے ساتھ ہے۔ اس نے مجھ سے علینا کے سلسلے میں مدد مانگی تھی۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ اس کا ساتھ دوں گا۔“

”یہ کیا بات ہوئی اپنی بیٹی کی خوشیوں کی کوئی فکر نہیں ہے آپ کو۔“ وہ ناراض ہو گئی تھیں۔

”فکر ہے تب ہی کہہ رہا ہوں۔“ وہ زچ ہو گئے تھے۔

”امی ابو میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ میں ارمان کے لیے واقعی موزوں نہیں ہوں۔ ارمان مجھے نہیں علینا کو پسند کرتا ہے اور میں نے ارمان کے خواب دیکھنا چھوڑ دیے ہیں۔“

بتول اس وقت بے حد سنجیدہ لگ رہی تھی۔ وہ کمرے میں آ گئی انہیں پتا نہیں چلا۔ ”شاباش بیٹی میں خوش ہوں اور تم یقین نہیں کرو گی کہ میں نے تمہارے لیے ایک بے حد شاندار انسان کو منتخب کیا ہے جو واقعی دل سے چاہتا ہے میری بیٹی کو، انسان کو زندگی کا ساتھی اسے ہی منتخب کرنا چاہیے جو اسے خوش رکھنے کا ہنر جانتا ہو۔“

وہ نا سمجھی سے باپ کو دیکھ رہی تھی۔

”نہیں سمجھیں پاگل، اپنا خاور تمہاری پھوپھو کا بیٹا۔ انہوں نے مجھ سے تمہارے لیے بات کی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ تمہاری امی سے بات کر کے کوئی مناسب جواب دوں گا۔ مگر اتفاق سے تم بھی یہاں موجود ہو تو بہتر ہے کہ بات تمہارے سامنے ہی ہو جائے۔“ وہ وضاحتی انداز میں بولے تھے۔

خاور بے حد سلجھا ہوا انسان تھا۔ جو بتول کو اس کی خامی و خوبی سمیت اپنانے کے لیے تیار تھا۔ وہ سر جھکا گئی۔ یعنی اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ یوں بھی ارمان سے بے عزتی کے بعد وہ خود بھی کسی جگہ اپنا نام جڑا ہوا دیکھنے کی خواہش مند تھی۔ ورنہ منفی کی سوچیں اسے الجھائے رکھتی تھیں۔

”پھر ٹھیک ہے کل ہی آپا کو بلوا لیں۔ رشتہ کی بات آگے بڑھائی جا سکے۔“

بتول شرما کر وہاں سے اٹھ گئی۔

”علینا جوں ہی کالج کے گیٹ سے نکلی سامنے ہی رضوان کھڑا تھا۔

”میں تمہیں گھر ڈراپ کرنے آیا ہوں۔“

”نہیں، میں خود چلی جاؤں گی۔“ علینا اندر سے ڈر رہی تھی۔

”دیکھو شرافت سے گاڑی میں بیٹھ جاؤ ورنہ تمہیں اٹھا کر بھی بٹھا سکتا ہوں۔ میں کوئی غیر تو نہیں ہوں۔“ اس وقت رضوان کا پارہ ایک دم ہی ہائی ہو گیا۔ وہ گھبرائی کھڑی تھی۔

”ارے میں کوئی نقصان تھوڑا ہی پہنچانا چاہتا ہوں گھر تک چھوڑنے آیا ہوں۔“ وہ فکر مندی سے دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

دل ہی دل میں رب کو پکارتی وہ خاصی ڈری سہمی تھی۔

رضوان نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی اپنے راستے پر رواں دواں تھی۔

”تم جس طرح ـــ اپنے اس کزن کو لفٹ کراتی ہو مجھے بھی کرا دو تو کیا ہو؟“

رضوان نے خاصی واہیات انداز میں کہا۔ علینا کا جی چاہا۔ کہ وہ اس کے منہ پر ایک تھپڑ جڑ دے۔

”مجھے ابھی اور اسی وقت گاڑی سے نیچے اتارو ورنہ میں شور مچا دوں گی۔“

علینا کا حلق کانٹے کی طرح خشک ہو رہا تھا۔ رضوان اس کے ہاتھ کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام کر گاڑی ایک سنسان جگہ پر روک چکا تھا۔

”چلو پہلے میری حسرت پوری ہو جائے پھر تم اتر بھی جانا۔“

رضوان نے ایک قہقہہ بلند کیا اس کی بے حسی اپنی انتہا پر تھی۔ گاڑی رک چکی تھی۔ اس کا مقصد علینا کو ہراساں کرنا تھا۔ ورنہ یہ شاہراہ اگرچہ سنسان تھی مگر اس طرح کے مقاصد کے لیے ہرگز مناسب نہ تھی۔ اس نے پھر گاڑی اسٹارٹ کر لی۔

”مجھے کہاں لے جا رہے ہو خبیث انسان۔“

علینا نے روتے ہوئے نفرت سے پوچھا۔

”ارے بے بی! گھبرا کیوں رہی ہو۔ پہلے ہی اتنی سی جان ہے۔ ہم ایسی جگہ جا رہے ہیں جہاں کوئی بھی نہ ہو۔ ہم دونوں ہوں۔ شادی مجھ سے نہیں کرو گی تو کسی اور کے قابل بھی نہیں چھوڑوں گا تمہیں۔“

اس نے علینا کے شور مچانے پر پستول تان لی۔

اچانک ہی کسی نے عقب سے اپنی گاڑی سے اس کی گاڑی کو ٹکر ماری۔

وہ کوئی اور نہیں ارمان تھا جو اسے لینے کے لیے جب وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ علینا کسی اور گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ پھر اس پہچاننے میں ذرا دشواری نہیں ہوئی کہ یہ گاڑی رضوان کی ہے۔ اسے شبہ تو پہلے ہی سے تھا کہ وہ ایک غلط انسان ہے مگر اس کا یقین مزید پختہ ہو گیا جب اس نے دیکھا کہ وہ گاڑی انجان راستے پر چل رہی تھی۔

اس نے تب بھی تیزی سے تعاقب جاری رکھا حتیٰ کہ فاصلہ بہت کم رہ گیا اور اس نے اسے متنبہ کرنے کے لیے گاڑی سے ٹکر ماری تھی کیونکہ اسے علینا کی چیخ پکار سنائی دے رہی تھی۔

اچانک ہی ٹکر لگنے سے گاڑی ایک جانب لہرائی اور رضوان اس کی رفتار قابو میں نہ کر پایا تھا۔

ارمان جب اس تک پہنچا اس وقت تک علینا نیم غشی کی کیفیت سے دوچار تھی جبکہ گاڑی کی ٹکر کی وجہ سے رضوان بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس نے دیکھا ارمان اس پر جھکا اپنے مضبوط بازوؤں میں تھامے اسے گاڑی سے باہر نکال رہا تھا۔ اس کو لگ رہا تھا جیسے کسی نے تیز دھار خنجر اس کی پسلیوں میں چبھو دیا ہو۔ درد کا بے کراں احساس اس پر حاوی تھا اور وہ اس درد میں بھی ارمان کے چہرے پر بکھری ہوئی پریشانی کو باآسانی دیکھ سکتی تھی۔ پھر وہ تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو چکی تھی۔

شہر کے مضافاتی علاقے میں ایک طرف واقع پرائیویٹ روم میں اس وقت وہ نیم غشی کی کیفیت سے دوچار تھی۔ ڈاکٹرز اس کا تندہی سے علاج کر رہے تھے۔

امی اس کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھیں ان کے آلود چہرے پر تفکر تھا۔ جبکہ لرزتے ہوئے لبوں پر

کے سوا کچھ نہ تھا اور یہی نہیں ان کے ساتھ بیٹھی ہوئی شاہدہ بیگم پہلی مرتبہ پریشان تھیں۔ ان کے بیٹے نے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر علینا کو کچھ ہوا تو وہ ساری عمر اس گھر میں قدم نہ رکھے گا۔ جہاں کی سیاست اور سازشوں کی بھینٹ علینا چڑھی ہے۔ علینا کے دائیں جانب گولی لگی تھی۔ جس کی وجہ سے خاصا خون ضائع ہو گیا تھا۔ ڈاکٹرز نے گولی تو نکال دی تھی۔ مگر وہ پہلے ہی دھان پان اس حادثے کو برداشت نہ کر پا رہی تھی۔

ڈاکٹرز نے نوید دی کہ اب وہ خطرے سے باہر ہے۔ باہر پولیس بھی موجود تھی اور وہ انتظار کر رہی تھی جیسے ہی اسے ہوش آئے اس کا بیان لیا جائے۔ مگر ابھی وہ اس حالت میں نہ تھی کہ زیادہ بات کر پاتی۔ اس معاملے میں بھی شاہدہ بیگم کو بہت زیادہ تشویش تھی ان کا خیال تھا کہ وہ اگر ان کے بھانجے کا نام لے گی تو بہت زیادہ بدنامی ہو گی۔ مگر اب یہ بدنامی ان کے حصے میں لکھی جا چکی تھی۔ یہ سب ان کے اپنے اعمال کا مرہون منت تھا۔ جو بویا تھا وہی کاٹنے کا وقت تھا۔ مگر علینا سے پہلے ہی ارمان نے پولیس کو ساری روداد سنا دی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ علینا کو اس معاملے میں پریشان کیا جائے یا ذہنی اذیت سے دوچار کیا جائے۔ رضوان کو پولیس نے اسی وقت گرفتار کر لیا تھا۔ اس ساری کارروائی کے بعد جب انصار بزمی کو اطلاع ملی تو ان کا سر شرم سے جھک گیا۔ ان کا بیٹا اس حد تک گر سکتا ہے۔

”تم اس ناہنجار کا رشتہ طلب کرنے گئی تھیں۔ علینا اور اس کی ماں کا صبر ـــ پڑ گیا اس کو۔“ انصار بزمی صاحب سخت برہم تھے۔ جبکہ آسیہ بیگم ماں تھیں اس لیے وہ عمارہ بیگم کے سامنے کھڑی معافی مطلب کر رہی تھیں اور وہ سب سے زیادہ علینا کے ہوش میں آنے اور صحت یاب ہونے کے لیے دعا گو تھیں کہ وہ جانتی تھیں کہ اگر علینا کو کچھ ہوا تو ان کا بیٹا بھی تاعمر حوالات میں ہی رہے گا۔

علینا ہوش میں آ گئی اور اس کے بیان کے مطابق حادثے کے وقت کوئی بھی مسئلہ درپیش نہیں ہوا وہ رضوان کے ساتھ گھر جا رہی تھی۔ اس کے بعد رضوان نے اسے پستول دکھائی یہ کہ اس طرح سے چلتی ہے وہ اسے ٹٹول کر دیکھ رہی تھی جب اچانک باتوں میں گاڑی کا توازن برقرار نہ رہنے سے گاڑی درخت سے زور سے ٹکرا گئی اور گولی چل گئی۔ اس ریوالور کا لائسنس بھی تھا۔ اس لیے معاملہ بگڑا نہیں۔

کاغذی کارروائی کے بعد اور علینا کے بیان کے بعد رضوان کو رہا کر دیا گیا تھا مگر سب نے ہی علینا کے احسان کے سامنے خود کو بے حد ہلکا محسوس کیا۔ سب کو احساس تھا وہ چھوٹی سی لڑکی کتنا بڑا کام کر گئی تھی۔

شاہدہ بیگم کا رویہ بے حد اچھا ہو گیا۔ ارمان ہر روز اس کے لیے پھل لاتا۔ اس کے سرہانے بیٹھا رہتا اور سب سے یہ بات پوشیدہ نہ رہی تھی کہ وہ اس کو دیوانہ وار چاہتا ہے اور علینا صحت یابی کی جانب گامزن تھی۔ اب وہ چلنے پھرنے بھی لگی تھی۔ ایک شام وہ یوں ہی بیٹھی تھی جب اس نے شاہدہ بیگم کو آتے دیکھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے ارے بیٹھی رہو بیٹا۔“ ان کا لہجہ ہی نہیں ان کی نگاہیں بھی بدلی ہوئی تھیں۔

”بیٹا میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں۔ آج مجھے احساس ہوا ہے کہ اپنے اپنے ہی ہوتے ہیں۔ اگر میں باہر کی کوئی لڑکی لے بھی آتی تو کیا معلوم اس کو میرا احساس بھی ہوتا کہ نہیں۔ تم نے جس طرح میرا احساس کیا ہے میرے بھانجے کو بچایا ہے۔ میں تمہارے آگے سر نہیں اٹھا سکتی۔ تم ہی میری بہو بنو گی۔“

وہ تحیر زدہ رہ گئی۔ انہوں نے اس کا ماتھا چوم لیا اور کہا کہ شام کو اس کا اور ارمان کا نکاح ہے۔ زندگی ایک دم ہی سہل ہو گئی تھی۔

وہ خوشی سے گلنار ہو گئی تھی۔ زندگی کے سفر میں اس بے اماں کو اماں مل گئی تھی۔

نمرہ احمد

حالم

تالیہ خواب میں فاتح کے سن باؤ والے گھر میں، خود کو ایڈم کے ساتھ خزانہ تلاش کرتے ہوئے دیکھتی ہے۔ فا
تالیہ سے اپنی فائل کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے اور اسے اپنے گھر آنے سے منع کر دیتا ہے۔ تالیہ کو عصرہ سے پتا چلتا ہے کہ
سکہ ایڈم کے پاس ہے۔ ایڈم اسے ایک جیولر کو بیچ دیتا ہے۔ تالیہ اس کے حوالے سے اسے الجھا دیتی ہے اور جیولر کو بلیک میل
کر کے سکہ نکلوا لیتی ہے، مگر سکہ اس کے ہاتھ میں دینے کے بجائے ایڈم اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔

فارض صاحب کے ذریعے فاتح کو حالم کا پتا چلتا ہے۔ فائل کی واپسی کے لیے حالم صبح تک کا وقت مانگتا ہے اور ا
منصوبے میں فاتح کو بھی شامل کرتا ہے۔ فاتح اس کی باتوں سے متاثر ہو کر راضی ہو جاتا ہے۔ ایڈم پر سکے کا اسرار ک
ہے۔ حالم پتا چلا لیتا ہے کہ فائل اشعر کے آفس میں ہے۔

سمیع، تالیہ کو بلیک میل کرنے آتا ہے۔ بازار میں داتن، سمیع کو خوف زدہ کر دیتی ہے۔ حالم جان پہ کھیل کے ا
روز ہی فائل اشعر کے سیف سے چرا کر لا دیتا ہے۔ فاتح، حالم سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔

ایڈم کو تالیہ مشکوک لگتی ہے۔ وہ تالیہ کی گردن پہ نشان دیکھتا ہے تو اسے تاریخی کہانی یاد آ جاتی ہے اور وہ سمجھ جاتا ہے کہ تالیہ
سکے کے پیچھے ہے جو ایڈم کے پاس ہے۔ عصرہ سے فاتح جھوٹ بولتا ہے۔ عصرہ کو فاتح اور اشعر دونوں پہ غصہ آتا ہے۔ فاتح سن
کو بیچنے سے پہلے وہاں ایک دن گزارنے جاتا ہے۔ عصرہ، تالیہ کی فرمائش پہ اسے بھی بلا لیتی ہے۔ فاتح سن باؤ کے گھر کی کہانی س
ہے۔ تالیہ اس گھر کے کنویں کو دیکھ کر سمجھ جاتی ہے کہ خزانہ کہاں ہے۔ وہ فاتح سے اس گھر کو خریدنے کی خواہش کا اظہار کرتی ہ



مگر وہ اسے بیچنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فاتح کو یاد آتا ہے کہ وہ عصرہ اور بچوں کے ساتھ پہاڑوں کی سیر کو جاتا ہے، جہاں آریانہ کو اس کی آیا دھوکے سے اغوا کر لیتی ہے۔ فاتح، آریانہ کے گرائے ہوئے پاپ کارن کے ذریعے آریانہ کی لاش تک پہنچ جاتا ہے۔ آریانہ مزاحمت کے دوران پہاڑ سے گر کر ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس کے اغوا کار بھی کھائی میں گر کر مر جاتے ہیں۔ فاتح آریانہ کی مسخ شدہ لاش دفنا دیتا ہے۔ اور اس کی موت کا کسی کو نہیں بتاتا، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ آریانہ کو صوفیہ رحمن نے اغوا کرایا تھا۔

ایڈم ملاکہ پہنچ جاتا ہے۔ ایڈم کو یقین دلانے کے لیے تالیہ بریسلیٹ اس کو دے دیتی ہے۔ ایڈم شک میں پڑ کر راستے میں فاتح کو سچ بتاتا ہے۔

تالیہ فاتح کے گھر میں خزانے کا راستہ تلاش کر لیتی ہے۔ فاتح اور ایڈم بھی پہنچ جاتے ہیں۔ فاتح اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہے، مگر تالیہ خزانہ دیکھنے پر بضد ہوتی ہے۔ بالآخر تینوں بحث کے بعد ایک دروازے سے گزرتے ہیں۔ جہاں سے وہ ایک جنگل میں پہنچ جاتے ہیں۔ دروازہ غائب ہو جاتا ہے۔

راستے میں وہ ہی حالات پیش آتے ہیں جو تالیہ خواب میں دیکھ چکی ہے۔ اسے داتن کی باتوں میں سچائی نظر آنے لگتی ہے کہ وہ پندرہویں صدی کی لڑکی ہے جو وقت سے آگے نکل آئی تھی۔ خزانے کے لالچ میں، اور سچ کی تلاش میں تالیہ، فاتح اور ایڈم پرانے زمانے میں پہنچ جاتے ہیں۔

فاتح پر کھل جاتا ہے کہ تالیہ ہی حالم ہے۔ اب اس کا رویہ بدل جاتا ہے۔ وہ حالات سے گھبرانے کے بجائے جنگل سے نکلنے کا سوچتا ہے۔ اور از خود ان دونوں کا لیڈر بن جاتا ہے۔

جنگل میں تالیہ کو آگہی ملتی ہے۔ کہ شہزادی تاشہ اس کے گاؤں کے لوگوں پر ظلم ڈھا رہی ہے اور اس نے تالیہ کے بابا کو بھی قید کر لیا ہے۔ تالیہ کو شہزادی تاشہ سے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ مگر ایڈم اور وان فاتح تاریخی کتابوں کے حوالے سے تاشہ کو جانتے ہیں۔ وہ دونوں تاشہ کی تعریف کرتے ہیں اور وان فاتح تاشہ کا فین ہے۔

وان فاتح کو اپنے ملک میں ہونے والے انتخابات کی بھی فکر ہے اس کا خیال ہے کہ مراد دوبارہ چابی بنا دے گا تو وہ واپس اپنے ملک چلے جائیں گے اس مقصد کے لیے قدیم ملاکہ جانا ضروری ہے۔

یہ لوگ رین فاریسٹ میں سے راستہ تلاش کر کے جنگل میں جاتے ہیں۔ جہاں تالیہ ہرن کا شکار کر کے اسے آگ پر بھونتی ہے۔ کھانے کی یہ خوشبو قدیم ملاکہ کے لوگوں کو متوجہ کر لیتی ہے۔ اور تین قدیم باشندے وان فاتح، ایڈم اور تالیہ کو زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایسے میں تالیہ کو دوبارہ آگہی ملتی ہے جب وہ ملاکہ کے ایک یتیم خانے میں جانے کیسے پہنچ گئی تھی۔ وہاں کی انچارج مسز ماریہ نے اس کا بریسلیٹ اتار لیا تھا اور ایک سنار کو بیچ دیا تھا مگر وہ سنار کے لیے بدبختی لایا تھا۔ وہ پھل نہیں رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ دوسری مصیبتوں میں بھی مبتلا ہو گیا تھا۔ یتیم خانے کی میڈم ایگنیس تالیہ پر چوری کا غلط الزام لگاتی ہے۔ اور اسی ضد میں تالیہ چوری کرنا اور زبردستی اپنا حق چھیننا سیکھتی ہے۔

یتیم خانے میں مسٹر ذوالکفلی آتے ہیں جو تھوڑا وقت بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں تاکہ اپنا من پسند بچہ ایڈاپٹ کریں۔ ان کا زیادہ وقت تالیہ مراد کے ساتھ گزرتا ہے۔ جو ہمہ وقت کسی پہاڑی پر محل کا اسکیچ بناتی ہے۔ ذوالکفلی اسے پیلے گلاب اور سکے کا ایک شعبدہ دکھا کر متاثر کرتے ہیں۔

ذوالکفلی ایک کون آرٹسٹ اور اسکامر ہے۔ وہ یتیم خانے میں بچہ ایڈاپٹ کرنے نہیں آیا تھا، بلکہ کسی جگہ نظر رکھنے آیا تھا اور موقع ملتے ہی وہاں سے ہیرا لے اڑا۔ پولیس تالیہ سے اس کا اسکیچ بنواتی ہے۔ تو وہ غلط اسکیچ بنا کر اسے بچا لیتی ہے۔

تالیہ کو بار بار یتیم خانے میں اپنے ساتھ ہونے والا برا سلوک یاد آتا ہے۔ اسے لاہور کے ایک گھر میں لے جایا جاتا ہے، جہاں اس پر اس فیملی کے دادا جی کے قتل کا جھوٹا الزام لگایا جاتا ہے۔ وہ سچائی ثابت کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ وہ ملائیشیا کو یاد کرتی ہے۔ جہاں اس نے بالآخر ذوالکفلی کو ڈھونڈ نکالا تھا اور احسان مندی کے طور پر ذوالکفلی نے اسے اپنا سارا ہنر سکھا دیا تھا۔

تالیہ، ایڈم اور فاتح کو "ابوالخیر" نامی آدمی کے کارندے ایک پنجرے میں قید کر کے گھوڑا گاڑی کے ذریعے قدیم ملاکہ کے شہر لے جاتے ہیں۔ تالیہ خود کو اور ایڈم کو آزاد کرا لیتی ہے۔ مگر فاتح کو آزاد کرانے سے پہلے اغوا کاروں کو خبر ہو

جاتی ہے۔ وہ دونوں فاتح کو چھوڑ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ فاتح کو ایک قید خانے میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ جہاں ایک "البینو" قیدی کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہے۔

قید میں فاتح کو ادراک ہوتا ہے، وہ ماضی میں کسی خاص مقصد سے بھیجا گیا ہے۔ وہ خود کو حالات کے رحم و کرم پہ چھوڑنے کے بجائے ان کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ تالیہ کی ذہانت سے وہ دونوں اپنے اغوا کاروں کو جُل دے کر بھیس بدل کر شہر میں ہی پھرتے ہیں۔ جہاں تالیہ پہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ خود شہزادی تاشہ ہے اور بنداہارا کی بیٹی ہے۔ بنداہارا مراد اپنے ساتھیوں سے غداری کر کے انہیں پکڑوا دیتا ہے اور خود بادشاہ سے جو اس کا ماموں زاد ہے مل جاتا ہے۔ تالیہ صدمے سے چور ہو کر خزانے کی چابی حاصل کر لیتی ہے اور وقت کا دروازہ پار کر جاتی ہے۔ راجہ مراد، تالیہ کو اپنی بیٹی تاشہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیتا ہے۔

ایڈم، وان فاتح کو ابوالخیر کی غلامی میں کام کرتے ہوئے، موقع پا کر تالیہ کے بارے میں بتاتا ہے فاتح اسے تالیہ کی کہانی سمجھتا ہے تالیہ یہ جان کر غصے میں آ جاتی ہے اور طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تین بے گناہ افراد جن میں ایڈم بھی شامل ہے گرفتار کروا کے مختلف سزائیں دیتی ہے ایڈم کو شاہی کتب خانے میں کام کرنے کی سزا ملتی ہے۔

تالیہ کو اپنے باپ مراد کے خیالات جان کر دھچکا لگتا ہے۔ وہ ہر صورت چابی حاصل کر کے ملائشیا واپس آنا چاہتی ہے۔ مگر راجہ مراد بے جا طاقت کا اور ظلم کا مظاہرہ کر کے تالیہ کو خوفزدہ کر دیتا ہے۔ راجہ کی خاص کنیز شریفہ اس کی جاسوسی کرتی ہے۔ مگر تالیہ اس کی کمزوری پتا چلا کر اس کی وفاداری خرید لیتی ہے۔

ملکہ یان سوفو چینی بادشاہ کی بیٹی اور بادشاہ مرسل کی بیوی ہے مگر وہ ایک ظالم عورت ہے اور اس کے مقابل بنداہارا مراد ہے۔ جو بادشاہ کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

وان فاتح کو ابوالخیر اپنے باورچی خانے میں کام پر رکھ لیتا ہے۔ وہ اسے اچھی غذائیں کھانے کو دیتا ہے تاکہ نیلامی میں اس غلام کی اچھی قیمت ملے۔

تالیہ، فاتح سے ملاقات کا موقع نکال لیتی ہے۔ وہ جاننا چاہتی ہے کہ تاریخ میں اس نے کیا کارنامے انجام دیئے تھے مگر فاتح نہیں بتاتا۔ ایڈم "بنگارا یا ملایو" کے رائٹر کا تھیلا چرا لیتا ہے۔ جس نے ابھی کتاب لکھنی شروع نہیں کی۔ تالیہ وہ تھیلا لیتی ہے۔

ابوالخیر شاہی خزانچی بننا چاہتا ہے وہ بادشاہ کی دعوت کرتا ہے۔ جہاں ملکہ اور راجہ مراد بھی ہوتے ہیں۔ تالیہ بھی وہاں پہنچ جاتی ہے۔ بادشاہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔ ملکہ یان سوفو "وانگ لی" کو شاہی خزانچی بنانا چاہتی ہے۔ مراد، ابوالخیر کو۔ وان فاتح "سن باؤ" کے وانگ لی سے متاثر ہے دعوت میں سن باؤ وانگ لی بھی موجود ہوتا ہے۔ ابوالخیر اس سے خطرہ محسوس کر کے فاتح کے ہاتھوں اسے زہر دلواتا ہے مگر فاتح وانگ لی کو خبردار کر دیتا ہے۔

فاتح، وانگ لی سے بے حد متاثر ہے اور اسے خزانچی دیکھنا چاہتا ہے مگر تالیہ ابوالخیر کو خزانچی بنانے کی سفارش کرتی ہے۔ فاتح کو یہ بات ناگوار گزریت ہے، تالیہ، ایڈم کو شاہی مؤرخ تعینات کرتی ہے۔ فاتح تمام غلاموں میں آزادی کا جذبہ جگاتا ہے اور اپنے ساتھ کا یقین دلاتا ہے۔ راجہ مراد تمام اہم عہدوں پر بادشاہ کو قائل کر کے اپنے آدمی تعینات کر دیتا ہے اور ہر ادارے کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ تالیہ، شاہی مؤرخ سے اپنی جھوٹی تعریفیں لکھواتی ہے۔

تالیہ راجہ مراد کی غیر موجودگی میں اس کے خزانے کے کمرے کی تلاشی لیتی ہے تو اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ راجہ خفیہ طور پر کمائی گئی دولت، کسی خفیہ جگہ پر چھپا کر رکھتا ہے۔ تالیہ، مسجد کے نام پر پیسہ حاصل کرنے کے لیے ابوالخیر سے ساز باز کر لیتی ہے۔ فاتح کو پتا چل جاتا ہے، وہ ناراض ہوتا ہے اور نیلامی میں وانگ لی کا غلام بننے کو ترجیح دیتا ہے۔ فاتح مستقبل کی باتیں بتا کر وانگ لی کو متاثر کرتا ہے۔

یان سوفو کے والد کو بادشاہ مرسل کی نظر لگ جاتی ہے، وہ اس کے توڑ کے لیے بادشاہ کا مستعمل غسل کا پانی

چاہتی ہے مگر شاہی طبیب آنا کانی کرتا ہے۔ تالیہ مداخلت کر کے طبیب کو ملکہ کا حکم ماننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ملکہ، تالیہ کی جاسوسی کرواتی ہے مگر تالیہ باتوں باتوں میں اس کا دل اپنی طرف سے صاف کر دیتی ہے۔ بادشاہ کے حوالے سے اس کے خدشات بھی دور کر کے واضح کرتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کی خاطر ضرور واپس جائے گی۔

فاتح کے کہنے پر محمود مرفی، وانگ لی سے مدد چاہتا ہے مگر وہ انکار کر دیتا ہے۔ وانگ لی کے انکار سے اس کی شخصیت کا بت فاتح کے سامنے ٹوٹ جاتا ہے۔

راجہ مرسل تالیہ کے فن اور تالیہ سے متاثر ہو کر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ایڈم کی زبانی یہ بات سن کر فاتح کا دماغ گھوم جاتا ہے۔ راجہ میرا، کو شک ہو جاتا ہے کہ تالیہ اپنے ساتھ کسی مرد کو لائی ہے وہ اسے تلاش کرواتا ہے۔ تالیہ بھی یہ بات بھانپ لیتی ہے اور فاتح کو خبردار کرتی ہے۔ راجہ مرسل تالیہ کے باپ کو تالیہ کا رشتہ دیتا ہے۔

ملکہ یان سوفو کی کنیز یہ بات ملکہ کو بتاتی ہے۔

سترہویں قسط

"پھر یقین صدمے میں بدلتا ہے۔ یا تو وہ ملال بن کے ختم ہو جاتا ہے' یا غصے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔"

اس نے کار سڑک پہ ڈال دی۔ تالیہ بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ اداس سا ایڈم کہہ رہا تھا۔

"غصے کے بعد وہ انتقام کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ آپ کو خود کو اس فیز سے نکلنا ہو گا تاکہ یہ ملال بن کے ختم ہو جائے۔ میری طرح۔ جیسے میں ابھی صدمے میں ہوں اور اس صدمے کو غصہ نہیں بننا چاہیے۔"

"تمہیں یہ سب کیسے پتا؟" وہ دکھی لہجے میں بولی تو ایڈم اداسی سے مسکرایا۔

"آپ کتابیں نہیں پڑھتیں کیا؟" اور ایکسیلیٹر پہ پیر کا دباؤ بڑھا دیا۔

تالیہ کے آنسو ایک دفعہ پھر تیزی سے بہنے لگے۔ اس نے گردن موڑ لی اور بھاگتی ٹریفک کو دیکھنے لگی۔ اس دنیا کے لیے وہ واپس آئی تھی؟ اس زندگی کے لیے؟

وہ گھر آئی تو صد شکر آج داتن نہیں تھی۔ اس نے بس دروازہ بند کیا اور کشن لے کر وہیں لاؤنج میں صوفے پہ لیٹ گئی۔ کروٹ کے بل سمٹی سمٹی سی لیٹی وہ روئے گئی۔ زار و قطار۔ بنا آواز کے۔ دل کے سب سے گہرے خانے سے ابل ابل کے آتے آنسو اس کی آنکھوں سے بہتے گئے۔

کب رات گزری۔ کب صبح ہوئی۔ اسے علم نہیں ہوا۔ بس وہ گھنٹوں اسی پوزیشن میں لیٹی رہی۔

پھر کھڑکیوں سے روشنی اندر آنے لگی تو وہ آنکھیں پونچھتی اٹھی۔ سارے جسم میں درد ہو رہا تھا۔

مگر اسے صرف ایک بات یاد تھی۔

اسے وان فاتح سے ملنا تھا۔

چند منٹ بعد وہ تیار ہو کے سیڑھیاں اترتی دکھائی دی تو خلاف معمول سادہ سے سفید اسکرٹ بلاؤز میں ملبوس تھی اور سیاہ منی کوٹ پہن رکھا تھا۔ سنہرے بال پونی میں باندھے' دھلا دھلایا چہرہ اور خالی آنکھیں..... وہ جیسے اندر تک بدل گئی تھی۔

پورچ ابھی عبور کیا ہی تھا کہ گیٹ پہ گھنٹی بجی۔ وہ قریب آئی تو دیکھا' سامنے کوریئر سروس کا نمائندہ کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹوکری تھی جسے اس نے ادب سے بڑھایا اور ایک کاغذ سامنے کیا۔

"یہ آپ کے لیے آیا ہے۔"

تالیہ نے چپ چاپ دستخط کیے اور ٹوکری تھامی۔ وہ ہیلمٹ پہنتا' واپس بائیک پہ بیٹھ گیا۔

"آج صبح مجھے وان فاتح کی دوسری ای میل موصول ہوئی ہے اور مجھے ان پیسوں کا مقصد انہوں نے سمجھا دیا ہے۔" ٹوکری کے اندر رکھے کارڈ پہ لکھا تھا۔ "وہ چاہتے ہیں کہ میں ہر ہفتے آپ کو یہ بھیجا کروں۔ میں نہیں جانتا وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں' مگر وجہ جو بھی ہو..... ہیپی برتھ ڈے۔"

اس نے ٹوکری میں جھانکا۔ اندر تازہ رسیلے کوکو پھل رکھے تھے۔ اور ان کے درمیان کہیں کہیں چاکلیٹ بارز پڑے تھے۔

(وہ اداکاری کر رہے ہیں۔ وہ عصرہ سے ڈرتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے۔) وہ کار کی طرف بڑھتے ہوئے بدگمانی سے سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

کے ایل پر کب سے بادل برس رہے تھے۔ وہ درمیانے طبقے کا علاقہ بارش سے بھیگ چکا تھا۔ سڑک نشیب میں گرتی دکھائی دیتی تھی اور اطراف میں گھروں کی قطاریں تھیں۔ اس گیلی سڑک پہ ایڈم بن محمد آتا دکھائی دے رہا تھا۔ چیک والی میرون شرٹ سیاہ پینٹ پہنے' وہ موبائل پہ چہرہ جھکائے ٹائپ کرتا چل رہا تھا۔

کیلکولیٹر پہ وہ حساب کر رہا تھا کہ جتنے پیسے وان فاتح نے دیے تھے ان سے اگر وہ ہر ہفتے کوکو پھل لے کر تالیہ کو دے تو وہ کتنے عرصے میں ختم ہوں گے؟

تقریباً چار ماہ میں اور اس کے بعد؟ اس نے گہری سانس لی اور موبائل اسکرین پہ وہ ای میل کھولی جو آج علی الصبح اسے موصول ہوئی تھی۔ وان فاتح نے وہ چار روز قبل بھیجی تھی مگر شیڈول کر دینے کے باعث وہ آج اس تک پہنچی تھی۔

"ایڈم..... میرا سیکرٹری عثمان اب تک ایک خطیر رقم تمہارے حوالے کر چکا ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس رقم سے ہر ہفتے تالیہ کو چاکلیٹس اور کوکو پھل بھجوایا کرو۔ وہ جہاں بھی ہو' اس کو یہ ہر ہفتے ملنا چاہیے۔ بیس تاریخ کو اس کی سالگرہ ہے..... میں چاہوں گا کہ تم بیس تاریخ سے اس کام کو شروع کرو اور جب تک یہ پیسے تمہارے پاس ہوں' تم یہ کام کرتے رہو۔

فقط،
تمہارا وقت کا ساتھی۔"

وہ ای میل صبح سے کئی دفعہ پڑھ چکا تھا۔ تالیہ کو پھل بھجوانے کے بعد بھی وہ اسے بار بار کھولتا۔ انہوں نے یہ کیوں نہیں لکھا کہ وہ اسے معلق کیوں کر گئے ہیں؟ یہ کیوں نہیں بتایا کہ اسے کوکو پھل بھیج کے وہ بار بار اسے اپنا آپ کیوں یاد دلانا چاہتے ہیں؟ اس طرح تو وہ کبھی آگے نہیں بڑھ پائے گی۔ نئی زندگی نہیں شروع کر پائے گی۔ اوہ وان فاتح۔ آپ نے ایسا کیوں کیا؟

اس نے موبائل جیب میں ڈالا اور گیلی سڑک پہ تیز قدم بڑھانے لگا۔ گھروں کی قطار کے آگے ننھے ننھے باغیچے بنے تھے۔ بارش نے ان سب کو بھی — نکھار ڈالا تھا۔ ایڈم سرسری نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیتا' جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلتا جا رہا تھا جب وہ رکا۔

اس کے گھر سے دو گھر چھوڑ کے ایک گھر کے باہر پتھریلی چوکی پہ ایک نوعمر بچی بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ ہاتھ میں قلم بھی تھا جس سے وہ بار بار کچھ انڈر لائن کرتی۔ بارہ تیرہ سالہ بچی نے ابھی تک اسکول یونیفارم پہن رکھا تھا اور سر کتاب پہ جھکا تھا۔

کتاب کا سرورق دکھائی دے رہا تھا' اس لیے اس کے قدم رکے۔ پھر دھیرے دھیرے چلتا وہ اس کے قریب آیا۔

"لیزا!" نرمی سے ہمسائیوں کی بچی کو پکارا تو اس نے سر اٹھایا۔

"ایڈم آبنگ....." پھر بھنویں بھینچیں۔ "آپ مختلف لگ رہے ہیں۔ یہ بالوں کو کیا کیا؟"

"تم اسے چھوڑو۔ یہ بتاؤ' کیا پڑھ رہی ہو؟" دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"یہ!" لڑکی نے کتاب اٹھا کے دکھائی۔ بھوری جلد پہ سنہری رنگ سے واضح لکھا تھا۔ بنگا راملایو (ملایا کا نرگسی پھول) از آدم بن محمد۔

"یہ ایک تاریخی داستان ہے جو ہمارے کورس میں شامل ہے۔"

"اچھا" وہ اداسی سے مسکرایا۔ "کیسی کتاب ہے یہ؟"

"ہونہہ۔ خواہ مخواہ میں ہی لکھی مورخ نے۔" وہ منہ بنا کے بولی تو ایڈم کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔

"پتا نہیں یہ کیوں اتنی موٹی تاریخی کتابیں لکھی جاتی ہیں؟ کون سا سلطان کس سن میں مرا' کون سی جنگ کس تاریخ کو ہوئی۔ ایک دم بے کار۔ بھلا پوچھو' جب بھی ہوئی ہو جنگ' اس کے بارے میں علم ہونے سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ اوپر سے اتنا مشکل ٹیسٹ آتا ہے اس سے۔ دل کرتا ہے اس مورخ کو بھرے چوک میں الٹا لٹکا کے....."

"بس تم ساری زندگی نکمی' کام چور اور جاہل رہنا۔" وہ سرخ پڑتے کانوں کے ساتھ چمک کے بولا۔ "ہمسائیوں کے گھروں سے مرغیوں کے انڈے اور محلے کی دکان سے چاکلیٹس چرا چرا کے کھاتی رہنا۔ تمہیں کتابوں کی اہمیت پتا ہوتی تو یوں مر مر کے پاس نہ ہوتیں۔ ہونہہ۔ یہ لٹکائیں گی مورخ کو!"

بچی نے جواباً زور سے "ہونہہ" کر کے سر جھٹکا اور چہرے کے آگے کتاب کرلی۔ ایڈم نے پیر پٹخا' زیادہ بلند آواز میں "ہونہہ" کیا اور برے برے منہ بناتا آگے بڑھ گیا۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو بادل چھٹ رہے تھے اور دھوپ نکل رہی تھی۔ سفید بلی گھاس پہ انگڑائیاں لیتی ستانے میں مصروف تھی۔ ڈربے کے اندر بیٹھی مرغی چوکنی سی باہر جھانکتی بلی کو دیکھ رہی تھی۔ اپنے بچے اس نے پروں کے قریب دبا رکھے تھے۔

ایڈم نے پنجرے پہ رکھے مرتبان کا ڈھکن کھولا' خوراک کی مٹھی بھری اور جھک کے جالی سے اندر پھینکی۔ چوزے چوں چوں کرتے فوراً دانوں کی طرف لپکے۔

"کیا صبح ہی صبح جاب ڈھونڈنے نکلے تھے؟" ماں اس کے عقب میں کب آ کھڑی ہوئی اسے علم ہی نہ ہوا۔ بس مسکراتے ہوئے چوزوں کو دیکھتا رہا۔

"ایڈم.... نوکری ڈھونڈ رہے ہو نا؟" ابو کے چہرے پہ تشویش تھی۔ وہ جھاڑو ہاتھ میں لیے' آستینیں اوپر چڑھائے' غالباً کام کے دوران اٹھ کے آئی تھیں۔

"نوکری کرنے سے کیا ہوگا' ابو؟" اس کی نظریں چوزوں پہ جمی تھیں جو پھدک پھدک کے دانے چگ رہے تھے۔

"پھر وہی مایوسی کی باتیں۔"

"غلط۔ مایوسی کی بات نہیں کر رہا۔ سوال پوچھ رہا ہوں۔ نوکری کرنے سے گھر میں 'دانہ' آئے گا نا؟" وہ ان کی طرف گھوما تو چہرے پہ سنجیدگی تھی۔

"ہاں بیٹا' تم پیسے کمانے لگو گے تو شادی کرسکو گے' پھر اپنے بچے پال سکو گے' خوشحال رہو گے۔"

"یعنی نوکری صرف کمانے اور بچے پالنے کے لیے کی جاتی ہے۔ مگر ماں.... وہ تو جانور ہوتے ہیں جو صرف کھانے اور بچے پیدا کرنے کے لیے زندہ رہتے ہیں۔"

"وہ الگ بات ہے' ایڈم۔" ابو نے سمجھانا چاہا مگر پنجرے کے سامنے کھڑا ایڈم ان کی نہیں سن رہا تھا۔

"میں سیکیورٹی گارڈ کی نوکری ڈھونڈ رہا ہوں ماں۔ میں نوکری ضرور کروں گا' پیسے بھی کماؤں گا اور کیا پتا کوئی بڑا خزانہ بھی میرے ہاتھ لگ جائے' لیکن' ماں..... کیا انسان کی زندگی میں کوئی بڑا مقصد نہیں ہونا چاہیے جو اس کو جانوروں اور پرندوں پہ فوقیت عطا کرے؟ کوئی تو فرق ہم میں ہونا چاہیے نا؟"

"ہاں ضرور۔ تم با مقصد نیک کام بھی کرو زندگی میں۔ لیکن نوکری الگ چیز ہے۔"

"نیک' با مقصد کام اور نوکری ایک ہی چیز کیوں نہیں بن سکتے ماں؟ اس سوال کا جواب میرے پاس خود بھی نہیں ہے' مگر آج کل میں اکثر یہی بات سوچتا ہوں۔" پھر اس نے گہری سانس بھری اور ایک نظر پنجرے پہ ڈالی۔ چوزے دانہ چگ چکے تھے اور اب مٹی میں آگے پیچھے پھر رہے تھے۔ ان کو مزید دانوں کی تلاش تھی۔ ننھے ننھے پیٹ تھے مگر بھوک مٹتی ہی نہ

تھی۔ ان کی ساری دوڑ دھوپ صرف بھوک مٹانے کے لیے تھی۔

کیا ایڈم بن محمد ان ننھے پرندوں سے بھی گیا گزرا تھا؟ وہ اداسی سے سوچے گیا۔

☆☆☆

آسمان خوب بارش برسا کے اب ہلکا ہو چکا تھا اور بادل چھٹ چکے تھے۔ دھوپ نکل آئی تھی' اور ایسے میں پارلیمان کی عمارت فخر سے سر اٹھائے کھڑی تھی۔

پارلیمان ایک اونچے ٹاورز میں پھیلی عمارتوں پہ مشتمل تھی۔ زمین پہ بنی عمارت میں (پارلیمان اور سینیٹ) کے ایوان تھے اور اونچے ٹاور میں پارلیمانی ممبرز کے دفاتر تھے۔

ٹاور کے اندر قطار میں لفٹس لگی تھیں۔ ایک لفٹ کا دروازہ کھلا۔ تو اندر سے وان فاتح باہر نکلا۔ سامنے طویل کاریڈور تھا جس میں بتیاں جلی تھیں اور چند افراد آ جا رہے تھے۔ فاتح موبائل کوٹ کی جیب میں ڈالتا عثمان سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے اس نئے legislation کا ڈرافٹ اپنی میز پہ چاہیے۔"

"سر وہ تو میں نے آپ کو ہفتے والے روز ہی دے دیا تھا۔"

"ہاں آف کورس!" فاتح نے گہری سانس لی اور پیشانی چھوئی' پھر تیز قدم اٹھاتے عثمان کی طرف جھک کے کہا۔ "مگر درمیان میں اتوار کا دن آ گیا جو میں نے ملاکہ میں گزارا۔ کبھی ایسا ہوا تمہارے ساتھ عثمان کہ تم صرف ایک رات کے لیے سوؤ اور جب جاگو تو لگے ایک زمانہ بیت چکا ہے۔" ساتھ ہی جھرجھری لے کر سر جھٹکا۔

"کبھی میں بہت تھکا ہوا ہوں تو ایسا لگتا ہے' سر۔" عثمان نے اٹک اٹک کے جواب دیا اور پھر فاتح کو دیکھا۔ وہ گرے سوٹ اور ٹائی میں ملبوس تھا' گیلے بال دائیں طرف جما رکھے تھے اور آنکھ کے قریب زخم کنسیلر لگا کے چھپا رکھا تھا۔ وہ اپنے ساتھ کھڑے ایک 'کارکن' سے یوں دل کی بات پہلے نہیں کیا کرتا تھا۔ یہ عادت کب سے پڑی اس کو؟

وہ راہ داری میں مڑے تو لیڈر آف اپوزیشن کا آفس سامنے نظر آیا۔ وان فاتح کے قدم سست ہوئے۔ بند دروازے کے سامنے تالیہ کھڑی تھی۔

"تم.... ادھر؟" اسے حیرت ہوئی۔ پھر ایک برہم نظر عثمان پہ ڈالی۔

"اگر پرس میں پیسے ہوں تو لیڈر آف اپوزیشن کے آفس تک پہنچنے کی اجازت مل جاتی ہے' فاتح صاحب!" وہ سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی سپاٹ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ سادہ سفید اسکرٹ بلاؤز پہ سیاہ کوٹ.. پونی میں بندھے بال' دھلا دھلا یا چہرہ روئی روئی آنکھوں تلے سرخی.... وان فاتح پتلیاں سکوڑ کے اسے دیکھتا قریب آیا۔

"خیریت؟ تم یہاں کیوں آئی ہو؟" اسے یہ ناگوار گزرا تھا۔

"ضروری بات کرنی تھی آپ سے۔ اگر آپ کو مناسب لگے تو میں اندر آسکتی ہوں؟ نہ بھی لگے تو بھی میں اندر آنا چاہوں گی۔" وہ ہٹ دھرم لگ رہی تھی۔ آج آر یا پار ہونا تھا۔

فاتح نے ضبط سے پہلے عثمان کو جانے کا اشارہ کیا اور پھر تالیہ کو پیچھے آنے کا کہا۔ اندر آتے ہی وہ سیدھا اپنی کرسی کی طرف گیا۔

"بیٹھو' تاشہ! اور بتاؤ کیا بات ہے۔" ہاتھ جھلا کے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

کمرے میں وہ دونوں تنہا تھے۔ کوئی ان کی گفتگو نہیں سن سکتا تھا۔ وہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھتی قریب آئی۔ کرسی کھینچی۔ اس پہ بیٹھی مگر پلک تک نہ جھپکی۔ بس اسے دیکھے گئی۔

"تاشہ جو بھی کہنا ہے تمہیں' بس پانچ منٹ میں کہو اور مجھے کام کرنے دو۔ میں اس سے زیادہ مروت کا مظاہرہ ۔۔ نہیں کرسکتا۔" وہ ہموار لہجے میں بولا۔ سپاٹ آنکھیں تالیہ پہ جمی تھیں۔ کوئی شناسائی نہ بیتے زمانوں کا عکس...... ان آنکھوں میں کچھ بھی نہ تھا۔

”آپ جانتے ہیں میں کیا کہنے آئی ہوں۔“ اس کی آواز بلند ہوگئی۔ گلا رندھنے لگا۔

”میں وہ گھر تمہیں نہیں بیچنا چاہتا۔ وہ بات ختم ہوچکی ہے۔ مزید کوئی بات کرنی ہے تو بتاؤ۔“ وہ ناراض نہیں لگ رہا تھا‘ بس بے زار تھا۔ یہ بے گانگی‘ یہ بے نیازی......

تالیہ کا دل ہر دھڑکن کے ساتھ ڈوبنے لگا۔

وہ اداکاری نہیں کر رہا تھا۔

وہ واقعی سب فراموش کرچکا تھا۔

وہ اس کے لیے صرف ایک سطحی‘ بگڑی ہوئی امیر زادی تھی جو بار بار اس کے پیچھے آرہی تھی۔ یااللہ.... اگر اسے واقعی کچھ یاد نہیں تو وہ ان کے بارے میں اس وقت کیا سوچ رہا ہوگا؟

حقیقت کی روشنی ذہن کی کھڑکیوں سے اندر گئی تو اس کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ اس نے تھوک نگلا اور سارے آنسو پی گئی۔ پھر ذرا سنبھل کے بیٹھی۔

”میں صرف ایک وضاحت دینے آئی تھی۔ آپ کو....“ وہ سوچ سوچ کے بول رہی تھی۔ نیم اندھیر آفس ایک دم ٹھنڈا لگنے لگا تھا۔ ”آپ نے مجھ پہ الزام لگایا تھا کہ وہ فائل میں نے چرائی تھی۔ اشعر صاحب کے کہنے پہ۔ آپ اپوزیشن لیڈر ہیں۔ حکومتی اراکین پہ الزام لگاتے ہیں تو ثبوت بھی دیتے ہیں۔ مجھ پہ الزام لگانے کا ثبوت نہیں دیا مجھے آپ نے۔“

”تمہیں شکر ادا کرنا چاہیے کہ میں نے ثبوت پولیس کو نہیں دیے۔ خیر۔ فائل میں واپس لے چکا ہوں۔ اس لیے اس ٹاپک کو بند کردو تو اچھا ہوگا۔“

”پوچھ سکتی ہوں فائل واپس کیسے لی آپ نے؟ سچے اور ایمان دار لیڈر ہیں آپ‘ اپنی ووٹر کے سوال کا جواب دیانت داری سے دینا چاہیے آپ کو۔“

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے سوال کرتی میز پہ دونوں مٹھیاں رکھے ہوئے تھی۔ سبز شیشے سے ٹھنڈک سی نکلتی اس کے سارے جسم میں سرایت کررہی تھی۔

”اچھا تو تم نے مجھے ووٹ دیا تھا۔“ وہ ٹائی کو ذرا ڈھیلا کرتا کرسی پہ پیچھے ہو کے بیٹھا۔

”میرا سوال وہیں موجود ہے‘ فاتح صاحب۔ اگر آپ نے سچ بولا تھا کہ فائل واقعی چوری ہوئی ہے تو اتنی جلدی واپس کیسے آگئی؟“ اس نے ٹھنڈے شیشے سے ہاتھ ہٹا کے گود میں رکھ لیے۔ نظریں وان فاتح کی آنکھوں پہ جمی تھیں۔

”میں نے ایک انویسٹی گیٹر ہائر کیا تھا۔ خوش؟“ ساتھ ہی ابرو اچکائے۔ وہی ازلی بے نیازی۔ وہ واقعی بھول چکا تھا۔

تالیہ نے بدقت خود کو سنبھالا۔ دل زخم زخم ہو رہا تھا۔

”میں نے آپ کی فائل نہیں چرائی تھی۔ کل بھی کہا تھا اور آج بھی کہوں گی۔ لیکن ٹھیک ہے۔ اس ٹاپک کو بند کردیتے ہیں۔ آپ مجھے گھر نہ بیچنا چاہیں‘ آپ کی مرضی۔ بس میرے ایک آخری سوال کا جواب دیانت داری سے دے دیں۔“

پرس اٹھاتے ہوئے وہ کھڑی ہوئی تو وہ ”عادتاً“ اٹھ کھڑا ہوا۔ اٹھتے ہی اسے احساس ہوا کہ اسے نہیں اٹھنا چاہیے تھا‘ پھر کیوں؟

وہ ہلکا سا مسکرائی۔ وہ اس عادت کو پہچانتی تھی۔ یعنی اس کی صرف narrative memory کھوئی تھی۔ عادات اور سیکھی ہوئی چیزیں اس کے وجود سے الگ نہیں ہوئی تھیں۔

”آپ مجھے وہ گھر کیوں نہیں بیچنا چاہتے؟“

”کیوں کہ وہ ایک تاریخی ورثہ ہے اور تم تاریخی چیزوں کو صرف پیسے کمانے کا ذریعہ سمجھتی ہو۔“

”اور کس لیے ہوتی ہے تاریخ؟“

”تاریخ ”سیکھنے“ کے لیے ہوتی ہے۔ عبرت کے لیے۔ وہ گھر میں اس کو بیچوں گا جو اس کی قدر کرنا جانتا ہوگا اور تم صرف پینٹ کرنا جانتی ہو۔“ دونوں کے درمیان میز تھی اور وہ اس کے کناروں پہ آمنے سامنے کھڑے تھے۔ فرش سے اٹھتی ٹھنڈک اس کے پیروں میں سرایت کرتی اسے برف کررہی تھی۔

”آپ پینٹرز کو کمتر سمجھتے ہیں؟“ اس کی ریڑھ کی ہڈی مارے سردی کے دکھنے لگی تھی۔

”تاشہ!“ وہ میز پہ دونوں ہاتھ رکھ کے جھکا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”انیسویں صدی میں ایک امیر گھرانے کی لڑکی الزبتھ تھامسن پینٹ کیا کرتی تھی۔ تب عورتیں اگر پینٹرز بنتی تھیں تو وہ تمہاری طرح عام چیزیں بناتی تھیں۔ پھول‘ انسانی شکل‘ گل دان۔ سینری مگر الزبتھ کی سوچ گہری تھی۔ وہ جنگی پینٹنگز بناتی تھی اور ہاں‘ تب یہ جنگوں پہ مبنی فلمیں نہیں بنتی تھیں نہ اس نے جنگیں دیکھی تھیں، جو اس کو معلوم ہوتا کہ جنگیں کیسی ہوتی ہیں۔ جانتی ہو اس نے اپنی ایک شہرہ آفاق پینٹنگ بنانے کے لیے ایک کھیت میں بچوں کو دوڑایا‘ پھر بہت سے گھوڑے خریدے اور ملازموں کو فوجی وردیاں پہنا کے اس میں دوڑایا۔ پھر نقلی لڑائی کروائی۔ اس سے کھیت تباہ ہوا‘ دھول اٹھی‘ میدان کا رنگ بدلا اور وہ نازونعم میں پلی لڑکی پینٹ کرتی گئی۔ مجھے صرف اس پینٹر عورت نے متاثر کیا تھا۔ وہ لوگوں کو جنگ کی تباہ کاریوں سے روشناس کروانے کے لیے پینٹ کرتی تھی۔ میں پینٹرز کو کمتر نہیں سمجھتا۔ مگر میں صرف ان پینٹرز سے متاثر ہوتا ہوں جو کسی بڑے مقصد کے لیے پینٹ کرتے ہیں۔ جیسے الزبتھ کرتی تھی۔“

یک دم ساری ٹھنڈک تالیہ کے جسم سے نکل گئی۔ اس کا چہرہ دہکنے لگا۔ تنفس تیز ہوگیا۔ وہ آگے بڑھی‘ ہتھیلیاں میز پہ رکھ کے اس کے انداز میں جھکی اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”آپ یہ بتانا بھول گئے فاتح صاحب کہ... الزبتھ نے لارڈ بٹلر سے شادی کرلی تھی۔ اس کا تنگ ذہن جاگیردار نواب شوہر سمجھتا تھا کہ عورت کی اپنی سوچ نہیں ہوسکتی‘ وہ اپنی رائے نہیں رکھ سکتی اور اسے پینٹ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ کبھی الزبتھ کے ٹیلنٹ اور شوق کی انتہا کو نہیں سمجھ سکا۔ اس نے اپنے نظریات الزبتھ پہ تھوپنے شروع کردیے اور اس کا کیریئر آہستہ آہستہ ختم ہوتا گیا۔ شاید اس کا دل مر گیا تھا۔ آپ نہیں جانتے فاتح صاحب‘ ظالم اور بے حس آدمی سے شادی اونچے ارادوں والی لڑکی کو کیسے مار دیتی ہے۔“

پرس کا اسٹریپ پھسل کے نیچے آگیا تھا۔ اس نے اسے کندھے پہ دوبارہ جمایا اور ایک شکوہ کناں نظر اس پہ ڈالتی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

فاتح نے گہری سانس لے کر سر جھٹکا اور کرسی سنبھالی۔ اسے بہت سے کام کرنے تھے۔ شکر کہ وہ مزید وقت ضائع کیے بغیر چلی گئی۔

☆☆☆

کے ایل کے قریب پترا جایا کا شہر تھا۔ کے ایل کی اکثر سرکاری عمارتیں اب پترا جایا منتقل ہوچکی تھیں اور وہ طاقت اور اثر و رسوخ کا منبع بن چکا تھا۔ بارش کے بعد آسمان صاف ہوچکا تھا مگر تھوڑی ہی دیر بعد دھوپ چلی گئی اور سارے شہر پہ ٹھنڈی سی چھا گئی۔ پترا جایا میں ایک بڑا سا پل تھا جس کے چاروں طرف اونچے ٹاورز بنے تھے۔ پل کے درمیان سڑک گزر رہی تھی اور دونوں اطراف میں سرخ کارپٹ سے مزین فٹ پاتھ بنے تھے جن کے اوپر لوگ پیدل بھی پل عبور کر رہے تھے۔

دونوں طرف کے سرخ فٹ پاتھ کو اونچے ریلنگ نے مقید کر رکھا تھا۔ نیچے دریا کی صورت بنی جھیل بہہ رہی تھی۔ وہاں سیاح جگہ جگہ کھڑے تصاویر کھنچواتے دکھائی دے رہے تھے۔

مگر وہ سیاحوں کی طرح کھڑی نہیں تھی۔ وہ ریلنگ سے ٹیک لگائے‘ سرخ کارپٹ پہ اکڑوں بیٹھی نیچے بہتی جھیل کو دیکھ رہی تھی۔ سیاہ کوٹ قریب ہی زمین پہ پڑا تھا اور ہوا سے پونی جھول رہی تھی۔ خالی خالی سیاہ آنکھیں دور پانیوں پہ جمی تھیں۔ پل کی پتھریلی سڑک کی طرف اس کی پشت تھی اور سڑک پہ دوڑتے ٹریفک کا شور اس کو محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

اس کے جیسے سارے احساسات برف ہوگئے تھے اور جب برف پگھلی تو ہر شے بہہ گئی۔ وہ خالی ہاتھ‘ خالی دامن بیٹھی تھی۔

سیاہ بوٹ میں مقید دو قدم اس کے قریب آکے رکے۔ اس نے سر نہیں اٹھایا۔ بس پانی کو دیکھتی‘ خود

فراموشی کے عالم میں بولی۔

''میرے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔ سب کھو گیا۔ میرا اس کے ساتھ گزرا اچھا وقت چوری ہو گیا۔ میرے سارے سچ جھوٹ بن گئے۔ وہ مجھے اب پہچانتا بھی نہیں ہے۔ کوئی ایسے کیسے اجنبی بن جاتا ہے' ذوالکفلی صاحب؟'' شکوہ کناں پلکیں اٹھا کے اسے دیکھا۔

وہ سیاہ پینٹ شرٹ میں ملبوس' آنکھوں پہ سیاہ چشمہ چڑھائے ہوئے تھا۔ بال جگہ جگہ سے سفید تھے اور چہرے پہ مسکراتے ہوئے جھریاں پڑ رہی تھیں۔

''کیا ہوا ہے' تالیہ؟ تم فون پہ اتنی ٹوٹی ہوئی کیوں لگ رہی تھیں؟'' وہ نرمی سے سوال کرتا اس کے سامنے سرخ قالین پہ بیٹھا' ایسے کہ ذوالکفلی کی پشت جھیل کی طرف اور چہرہ تالیہ کی جانب تھا۔

''میں زندگی میں پہلی دفعہ اتنی بری طرح ہاری ہوں۔ مجھے غلط آدمی سے محبت ہو گئی۔ وہ شادی شدہ تھا' اس کے دو بچے تھے' اسی لیے میں اس کا خواب نہیں دیکھتی تھی۔ مگر وہ ان دیکھا خواب سچا ہو گیا۔ وہ مجھے مل گیا' لیکن وہ چھوڑ دیتا تو اچھا تھا۔ کم از کم وہ میرا دوست تو رہتا.....''

اس کی آنکھوں کے کٹورے پانیوں سے بھرنے لگے۔ ''مگر اس نے تو مجھے اپنی زندگی سے کاٹ کے پھینک دیا۔ وہ ایسا بے نیاز اور بے حس ہو گیا کہ اسے میری ساری اچھائیاں بھول گئیں۔ اسے میری ذہانت' میری کوشش سب بھول گئی۔ میں اس کے لیے صفر ہو گئی ہوں بلکہ شاید منفی کا کوئی ہندسہ!'' آنسو ٹپ ٹپ گالوں پہ بہنے لگے۔

''میں کیا کروں ذوالکفلی صاحب' میں اتنی دکھی ہوں کہ میرا دل زندہ رہنے کو بھی نہیں چاہتا۔ میں نے ہر چیز ہار دی ہے۔ میرے پاس کچھ نہیں بچا۔''

ذوالکفلی نے سیاہ چشمہ اتارا اور اپنی جھریوں زدہ آنکھوں کی پتلیاں سکوڑ کے اس کا بھیگا چہرہ دیکھا۔

''کیا اسے تم سے محبت تھی؟''

''اپنائیت تھی' دوستی تھی' محبت کا علم نہیں۔ پھر اس کے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا۔ اس کی یادداشت کھو گئی۔ اب وہ مجھے نہیں پہچانتا۔ اس کا ذہن اس وقت تک رک گیا ہے۔ جب تک وہ مجھے نہیں جانتا تھا۔ اس کو یاد ہی نہیں کہ ہم نے ایک ساتھ کن بلندیوں کا سفر کیا تھا۔''

اس نے روتے ہوئے سر گھٹنوں پہ ٹکا کے آنکھیں بند کر لیں۔ گرم پانی گالوں پہ بہتا محسوس ہوا۔ سارا منظر سیاہ ہو گیا۔ پھر اس میں ذوالکفلی کی آواز گونجی۔

''کیا تم نے اس کے ساتھ زندگی کی کوئی بلندی دیکھی تھی؟''

''ہاں۔'' وہ روئے جا رہی تھی۔ ''ساری دنیا ختم ہو گئی تھی اور بس ہم رہ گئے تھے۔ جنگل کے ساتھی۔ محل کے ساتھی۔ قید خانے کے ساتھی اور اب وہ اپنے محل میں واپس جا چکا ہے۔ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ۔ وہ اپنی بلندی پہ واپس جا چکا ہے اور میں پاتال میں پڑی ایک بھکارن کے سوا کچھ نہیں رہ گئی۔''

''تمہیں یہ تصویر یاد ہے۔'' آواز پہ اس نے گیلی آنکھیں کھولیں اور سر اٹھایا تو اندھیرا چھٹا اور سامنے سرخ قالین پہ آلتی پالتی مارے بیٹھا ذوالکفلی نظر آیا۔ وہ موبائل اسکرین پہ اسے ایک تصویر دکھا رہا تھا۔ منظر دھندلا تھا۔ تالیہ نے پلکیں جھپکیں تو وہ واضح ہوا۔

''یہ تم نے بچپن میں بنائی تھی۔ تم اکثر اسی طرح کی تصاویر بنائی تھیں۔ پہاڑی پہ بنے اونچے محل' اور نیچے بہتا سمندر۔''

تالیہ نے اس پینٹنگ کو دیکھا تو آنسو پھر سے بہنے لگے۔ سرسبز پہاڑی۔ تعمیر شدہ بھوری لکڑی کا محل.... اور عقب میں بہتا نیلا سمندر۔ اسے بندا ہارا کا محل یاد آیا۔

''تمہارے سارے محل ایک دوسرے سے مختلف ہوتے تھے۔ پہاڑی کبھی سرسبز ہوتی' کبھی بھوری بنجر۔ سمندر کبھی رات کے باعث سیاہ ہوتا' کبھی سورج میں نیلا سبز چمک رہا ہوتا مگر جانتی ہو ان سب میں مشترک کیا ہوتا تھا؟''

''کیا؟'' اس نے چونک کے ذوالکفلی کو دیکھا۔ وہ مسکرایا تو اس کی آنکھوں کے گرد جھریاں

گہری ہونے لگیں۔

''تم نے کبھی سڑک نہیں بنائی۔''

تالیہ اسے دیکھنے لگی۔ ''سڑک؟''

''محل تک پہنچنے کے لیے پہاڑی پہ سڑک ہونا ضروری تھی' تالیہ۔ مگر تم کبھی سڑک نہیں بناتی تھیں۔''

اس نے بے یقینی سے تصویر کو دیکھا۔ اس پہ واقعی کوئی سڑک' کوئی راستہ نہیں بنا تھا جو پیدل چلنے والے کو اوپر لے جائے۔

''اور یہی زندگی ہے۔ بلندی پہ بنے محل تک پہنچنے کے لیے کوئی صاف سڑک موجود نہیں ہوتی' پتری تالیہ (شہزادی تالیہ)۔ دشوار گزار پہاڑی راستوں پہ سہج سہج کے چلنا ہوتا ہے۔ ذرا سا قدم پھسلا تو نیچے سمندر میں جا گرو گی۔''

تالیہ نے آہستہ سے ہتھیلی کی پشت سے گال صاف کیے۔ وہ بالکل سُن سی اس تصویر کو دیکھ رہی تھی۔

''زندگی نے آسان سڑکوں کا وعدہ کر بھی نہیں رکھا' پتری! اگر تمہیں اس سے محبت ہے تو کسی دوسرے کا راستہ کاٹنے کے بجائے اپنا راستہ خود بنانا ہو گا۔ اس تک پہنچنے کا راستہ آسان نہیں ہو گا۔ بار بار گرو گی' زخمی ہو گی' اور شاید اس تک پہنچ بھی نہ سکو' لیکن کم از کم ایک دفعہ کوشش تو کرو۔''

اس کے آنسو رک چکے تھے اور وہ گم صم سی نظریں اسکرین پہ جمائے ہوئے تھی۔

''وہ مجھے اپنی زندگی سے نکال چکا ہے۔''

''اگر اس کو کسی حادثے نے تم سے الگ کیا ہے' اس کے دل کے گدلے پن نے نہیں' تو تم اس کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتی ہو؟''

''تو کیا کروں؟ کسی 'Low life' بے وقار' بے خود عورت کی طرح اس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اس کے گرد منڈلاتی رہوں؟'' قدرے غصے سے بولی۔ ''یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔''

''اگر وہ محل میں رہنے والوں میں سے ہے اور تم اس کے ساتھ تعلق کی بلندی تک جا چکی ہو' تو یہ اسی صورت ہوا ہو گا کہ تم بے وقار' بے خود عورت نہیں بنی ہو گی اور بلندیوں پہ رہنے والوں کو بلند قد کے لوگ ہی بھاتے ہیں۔ کسی کے ساتھ رہنے کے لیے خود کو بے توقیر کرنا ضروری تو نہیں اور تم اتنی ذہین ہو کہ مجھے یقین ہے' تم بہتر راستے نکال ہی لو گی۔ اگر نہیں نکال سکتیں تو میں نہیں مان سکتا کہ تم نے کبھی اس کے ساتھ کوئی بلندی دیکھی تھی!'' تالیہ نے چہرہ موڑ کے دور نظر آتی اونچی عمارتوں کو دیکھا۔

''دیکھی تھی۔ ہم ایک زمانہ ساتھ رہے تھے۔ پھر میرے باپ نے مجھ سے وہ بلندی چھین لی۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ وہ سب مجھے واپس مل سکتا ہے؟''

''انسان دل سے کوشش کرے اور اس کی تکنیک درست ہو تو اسے سب مل سکتا ہے۔'' ذوالکفلی نے اسکرین بجھائی اور موبائل واپس جیب میں ڈالا۔

''میرا دل ٹوٹ گیا ہے' میرے جھوٹوں نے میرا پیچھا کر کے مجھے آن لیا ہے۔ مجھ میں اس دشوار گزار گھاٹی پہ چڑھنے کی ہمت نہیں ہے۔ میں تو بالکل ہار چکی ہوں۔''

''پتری تالیہ.... میں جانتا ہوں کہ تم اس وقت بالکل مایوس ہو۔ تمہیں اپنا آپ ایک فیلیئر لگ رہا ہے لیکن اب بھی اگر تمہارے پاس دو چیزیں ہیں تو تم دوبارہ سے کھڑی ہو سکتی ہو۔''

اس نے چونک کے ذوالکفلی کو دیکھا۔ ''دو چیزیں؟''

''پہلی چیز.... تمہاری sanity قائم ہے۔ تم کتنی بھی ٹوٹی ہوئی کیوں نہ ہو' کم از کم تم جھیل میں کود نہیں رہیں' یا لباس چاک کر کے سر میں مٹی نہیں ڈال رہیں۔ ساری مایوسی ایک طرف' تم اب بھی اپنے حواسوں میں ہو۔ اس کا مطلب ہے تم پھر سے کھڑی ہو سکتی ہو....''

تالیہ نے اثبات میں سر کو خم دیا۔ آنسو پھر سے گرنے لگے۔ ''ظاہر ہے میں جانتی ہوں کہ اگر اس سے مایوس ہو بھی جاؤں تو کہیں دور چلی جاؤں گی' خاموش اور اداس زندگی گزاروں گی۔ مگر حواس سلامت ہیں میرے۔ اپنا تماشا نہیں بناؤں گی نہ خودکشی کروں گی۔'' پھر توقف سے بولی۔ ''اور دوسری

چیز؟'' ساتھ ہی ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے۔
''تمہیں اپنی غلطی معلوم ہے اور اس کو اب بھی درست کر سکتی ہو۔ تمہاری غلطی کیا تھی' تالیہ؟'' اس نے دہرایا۔
''میری کریڈیبلٹی نہیں ہے۔ میری 'بات' بے وزن اور بے معنی ہے کیونکہ میں سچ نہیں بولتی تھی۔ اگر میں نے خود کو سچا بنایا ہوتا تو میرا قول معتبر ہوتا اور میری ہر بات پہ وہ آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتا۔''
''دیکھا.... یہ دونوں چیزیں تمہارے پاس ہیں۔ تمہارے حواس برقرار ہیں اور تمہیں اپنی غلطی معلوم ہے۔'' وہ مسکرا کے کہہ رہا تھا۔ اس کے عقب میں بہتی جھیل کے اوپر پرندوں کا ایک غول اڑ رہا تھا۔ تالیہ کی نظریں ان کے پروں پہ جم گئیں۔
''کیا شدید پچھتاووں اور مایوسی سے نکلنے کے لیے بس یہی دو چیزیں چاہیے ہوتی ہیں؟ حواس برقرار ہونا اور اپنی غلطی پہچان کر اسے درست کرنے کی کوشش کرنا؟''
''میرے نزدیک تالیہ.... یہ دونوں کافی ہوتی ہیں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دہرا رہا تھا۔ تالیہ نے دوبارہ سے آنکھیں رگڑیں۔
''تو اب میں کیا کروں؟ کہاں سے شروع کروں؟''
''یہ میں تمہیں کیوں کر بتا سکتا ہوں؟'' وہ حیرت سے مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ گردن اٹھا کے اسے دیکھنے لگی۔ مسکراتے ہوئے ذوالکفلی کی آنکھیں مزید چھوٹی ہو گئی تھیں۔
''تم تالیہ مراد ہو' اور تالیہ کے پاس ہمیشہ پلان بی ہوتا ہے۔''
''میرے پاس کبھی پلان بی نہیں ہوتا۔ پلان سی' ڈی سب بناتی ہوں مگر بی کا خانہ خالی چھوڑ دیتی ہوں سب مجھ پہ اعتبار کرتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ اگر ہر چیز ناکام ہو جائے تو بھی تالیہ کا پلان بی انہیں مصیبت سے نکال دے گا مگر ذوالکفلی صاحب... تالیہ کے پاس کوئی پلان بی نہیں ہوتا۔''

''اب ہوگا!'' وہ پُر یقین تھا۔
چند لمحے بعد ذوالکفلی سرخ فٹ پاتھ پہ دور جاتا دکھائی دے رہا تھا اور وہ اسی طرح وہاں اکڑوں بیٹھی جھیل کے اوپر اڑتے پرندوں کو دیکھ رہی تھی۔
بنا کسی بوجھ کے' وہ ہلکے اور آزاد پرندے' اپنے پر پھیلائے فضا کو چیر کے اوپر اڑتے جا رہے تھے۔
اوپر..... بلندیوں کی طرف.....

☆☆☆

سرخ مخروطی تکون سے مزین شیشوں سے ڈھکی عمارت پوری شان سے کے ایل کے کاروباری علاقے میں کھڑی تھی۔ اندر آؤ تو نیچے ایک شان دار سا شاپنگ مال بنا تھا جہاں بے فکر لوگ راہداریوں میں ٹہلتے' شاپنگ بیگز اٹھائے' خریداری میں مصروف نظر آتے تھے۔ مال کی چھت جہاں ختم ہوتی' اس سے اوپر والے فلورز مختلف کمپنیوں کے آفسز پہ مشتمل تھے۔ ایک فلور باریسن نیشنل (سیاسی جماعت) کا ہیڈ آفس تھا۔ اس فلور کا ماحول یکسر مختلف نظر آتا تھا۔ یہاں ہر طرف چھتوں پہ سفید بتیاں جل رہی تھیں اور شیشے کی دیواروں سے بنے کیبن میں لوگ کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔
ایک آفس میں اشعر محمود کنٹرول چیئر پہ بیٹھا لیپ ٹاپ پہ کچھ دیکھ رہا تھا۔ نک سک سے تیار' گہرے نیلے سوٹ اور ٹائی میں ملبوس' بال جیل سے کھڑے کیے' وہ اس چھوٹے سے آفس سے مطابقت رکھتا دکھائی نہ دیتا تھا۔ یہ آفس پارٹی عہدے کی وجہ سے اس کو اس عمارت میں ملا ہوا تھا جبکہ اس کا اصل آفس یہاں سے کچھ دور کاروباری مراکز پہ بنی ایک اونچی عمارت میں تھا۔ وہ آفس شاہانہ اور پُرتعیش تھا' اور اسی کے لاکر سے 'حالم' نے سن باؤ کے گھر کی فائل چرائی تھی۔ جبکہ یہ والا عام سا تھا۔
''سر!'' سامنے ہاتھ باندھے کھڑا رملی کھنکھارا۔ اشعر نے ذرا کی ذرا نگاہ اٹھا کے اپنے ادھیڑ عمر سیکرٹری کو دیکھا۔
''میں نے بہت تلاش کیا ہے مگر میں یہ معمہ حل

نہیں کر سکا کہ وہ فائل وان فاتح کے پاس واپس کیسے پہنچی۔''
اشعر نے ایک گہری نظر رملی پہ ڈالی۔ ''یہ معمہ تو میں بھی حل نہیں کر سکا' بہرحال تم اس کی فکر نہ کرو۔'' رملی کو اندر تک اترتی نظروں سے گھورا۔ ''جو بھی چور ہے' چاہے وہ اپنا ہے' چاہے وہ دشمن ہے' میں اسے ڈھونڈ لوں گا۔ فی الحال تم آج کی نیلامی کی فکر کرو۔''
''سر' ساری تیاری مکمل ہے۔'' رملی جوش سے بتانے لگا۔ ''آج گھائل غزال نیلامی کے لیے رکھی جائے گی۔ ہمارا آدمی جو کہ ایک قابل بزنس مین ہے' وہاں بولی لگائے گا۔ وہ بولی کو بڑھاتا جائے گا اور مہنگی ترین قیمت پہ گھائل غزال خرید لے گا۔ چونکہ رقم فوراً نہیں بلکہ دو دن میں ادا کرنی ہوتی ہے' اس لیے وہ سودا طے ہوتے ہی دو ماہر ایکسپرٹس کو بلائے گا اور سب کے سامنے وہ گھائل غزال پہ ٹیسٹ کرنا چاہیں گے۔ عصرہ بیگم منع کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں گی اور ماہرین یہ راز فاش کریں گے کہ پینٹنگ جعلی ہے۔ یوں ہمارا بندہ پیسے دینے سے بچ جائے گا اور....''
''اور عصرہ اور فاتح کی ساکھ خاک میں مل جائے گی۔'' اشعر پیچھے ہو کے بیٹھا اور سگریٹ نکال کے لبوں میں دبائی۔ ''پچھلے دس سال میں عصرہ کے بیچے گئے ایک ایک آرٹ پیس کا آڈٹ اور تحقیق شروع ہو جائے گی۔ مقدموں کے انبار لگ جائیں گے اور ان دونوں کے پاس الیکشن کے بارے میں سوچنے کے لیے وقت نہیں ہوگا۔ لیکن....'' وہ لائٹر سے سگریٹ جلاتے ہوئے چونکا۔ جیسے کچھ یاد آیا ہو۔
''وہ لڑکی.... تالیہ مراد.... وہ بھی یہی پینٹنگ خریدنا چاہتی تھی۔ تم اس امر کو یقینی بناؤ گے کہ پینٹنگ ہمارا بندہ ہی خریدے۔ کیونکہ وہ عصرہ کی دوستی اور مروت میں ٹیسٹ نہیں کروانے دے گی اور سارا کھیل خراب ہو جائے گا۔''
''سر' بے فکر رہیں۔ ہم بولی کو اتنا اوپر لے جائیں گے کہ وہ اس لڑکی کی پہنچ سے دور ہو جائے

گی۔'' رملی پُراعتماد تھا۔ اشعر محمود کے لبوں پہ مسکراہٹ در آئی۔ اس نے جلتے سگریٹ کا کش بھرا اور پھر جھک کے سگریٹ کو ایش ٹرے تک لے گیا۔
''عصرہ اور فاتح اتنے بڑے اسکینڈل میں پھنس جائیں گے کہ ان کی صداقت اور امانت مشکوک ہو جائے گی اور پھر....'' اس نے سگریٹ کو جھٹکا۔
راکھ شیشے کے پیالے میں جا گری۔

Ashes Ashes, We all fall down!

پیالے کے وسط میں راکھ کے ٹکڑے پڑے تھے۔ دہکتے انگاروں سے نکلنے والے' ٹھنڈے بے جان ٹکڑے.... اشعر کی نظریں ان پہ جم گئیں۔ سرمئی پن میں یادوں کی ملاوٹ گھلنے لگی....
وہ اس وسیع و عریض' پُرتعیش آفس میں میز کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ چند برس پہلے کا اشعر۔ اس کے بال نسبتاً چھوٹے اور چہرا کم عمر لگتا تھا۔ سفید براق شرٹ پہ میرون ویسٹ پہنے' وہ نک سک سے تیار لگتا تھا' مگر آنکھیں قدرے اداس تھیں۔
کنٹرول چیئر پہ محمود صاحب براجمان تھے۔ ادھیڑ عمر' پختہ چہرے اور برہم آنکھوں والے صاحب جن کی آنکھوں میں ناپسندیدگی تھی۔ ایک زمانے میں یہ ان کا آفس ہوتا تھا۔ اور بے بس سا اشعر سامنے کھڑا ہوتا تھا۔
''آفرین ہے' اشعر۔ تم اپنا مت سوچنا۔ بس اپنے بہنوئی کی غلامی کرتے رہنا۔'' وہ سخت خفا نظر آتے تھے۔
اشعر نے تذبذب سے کرسی کھینچی اور سامنے بیٹھا۔ ''بابا....'' آگے کو جھکے ہاتھ باہم پھنسائے۔ اس نے سمجھانے والے انداز میں بات شروع کی۔ ''فاتح آبنگ کے ساتھ کام کرنے سے مجھے بہت فائدہ ہوگا۔ میں تعلقات بنا رہا ہوں' اپنا نام کما رہا ہوں' ہم ان کی الیکشن مہم شروع کرنے جا رہے ہیں۔ میں نے بہت محنت کی ہے ان کے لیے۔ اس میں ہم دونوں کا فائدہ ہے۔ کل کو وہ ممبر پارلیمنٹ بنیں گے اور پرسوں انہیں مزید اونچا عہدہ ملے گا تو میں بھی نفع میں رہوں گا۔ میں.

ان کے سیاسی تعلقات استعمال کر کے اپنے کاروبار کو فائدہ دوں گا۔ ان کو بھی معلوم ہے کہ میرا بھی اس میں فائدہ ہے اور وہ اس بات سے مطمئن ہیں۔"

"تو کیا تم ساری عمر اس کے غلام بن کے رہو گے؟" محمود صاحب تیوری چڑھائے پوچھ رہے تھے۔

"میں ان کا پولیٹیکل سیکرٹری ہوں' بابا۔ اور میں یہی بننا چاہتا تھا۔"

"ایک سیکریٹری؟"

"نہیں' سیکرٹری نہیں۔" وہ پیچھے کو ہوا اور گہری سانس لی۔ پھر اٹھی ہوئی گردن کے ساتھ بولا۔ "میں کنگ میکر ہوں۔ ان کا سلطان ساز!"

"آہ.... کنگ میکر۔" محمود صاحب نے برہمی سے ناک سے مکھی اڑائی۔ "اب کیا تم پہ اتنا برا وقت آ گیا ہے کہ تم ایک سیاست دان کے کنگ میکر بنو گے؟ جانتے ہو کنگ میکر کیا ہوتا ہے؟"

"جی' میں جانتا ہوں اور مجھے یہ کام پسند ہے۔" وہ پرسکون تھا۔ مطمئن تھا۔

(کنگ میکر سیاست میں اس آدمی یا گروہ کو کہتے ہیں جس کا کسی سیاست دان پہ گہرا Influence (اثر اندازی) ہوتا ہے۔ وہ اپنے عسکری' مذہبی' سماجی اور سیاسی تعلقات کے ذریعے سیاستدان کو تراشتا ہے' اس کو اٹھاتا ہے' اس کو کامیاب کرواتا ہے اور اس کو طاقت کے مقام پہ پہنچاتا ہے۔ اقتدار حاصل کرنے کے بعد بھی اسی کے مشورے سے وزرائے اعظم اور حکمران کام کرتے ہیں۔ کرسی پہ کوئی اور بیٹھا ہوتا ہے اور اس کی ڈوریاں پیچھے سے اس کا سلطان ساز کھینچ رہا ہوتا ہے مگر اپنی ساری صلاحیتوں کے باوجود کنگ میکر خود کبھی سیاسی امیدوار کے طور پہ کھڑا نہیں ہوتا' نہ اس کو عوام جانتے یا پسند کرتے ہیں۔)

"میرے بیٹے' تم اگر کسی اور شخص کے دائیں ہاتھ بنتے تو میں معترض نہ ہوتا۔" وہ بے بسی سے جھنجلاتے ہوئے آگے جھکے اور سمجھانے لگے۔ "مگر تم وان فاتح کو اقتدار دلوانا چاہتے ہو۔ وہ بے نیاز اور خود غرض شخص ہے۔ وہ تمہیں بھلا دے گا۔ تم اپنا ٹیلنٹ' اپنی صلاحیتیں اپنے لیے استعمال کرو۔"

"ہم یہ بات پہلے کر چکے ہیں' بابا۔" وہ اداس ہوا۔

"مگر دوبارہ اس لیے کہہ رہا ہوں تاکہ تم اس بارے میں سوچو۔"

اشعر چپ ہو گیا۔

"میرا سارا پیسہ پھنسا ہوا ہے' بابا اور آپ کے پاس بھی ابھی اتنا پیسہ نہیں کہ میں فوراً الیکشن کی تیاری کر سکوں۔ آپ کاروباری آدمی ہیں اور آپ پہ بھی قرض چڑھے ہیں' بالفرض میں ایم پی کے الیکشن کے لیے کھڑا بھی ہو جاؤں تو پیسہ کہاں سے لاؤں گا؟" وہ جیسے زچ ہوا۔

محمود صاحب نے چونک کے اسے دیکھا۔

"یعنی یہ خیال تمہارے ذہن میں بھی آتا ہے۔" ان کے تنے تاثرات ڈھیلے ہوتے گئے۔

"انسان ہوں' بابا۔ طاقت کی خواہش میرے اندر بھی ہے مگر پیسہ کہاں سے لاؤں؟" وہ بے بس تھا۔ محمود صاحب خاموش ہو گئے۔ پھر چند لمحے کے لیے چھت کو تکنے لگ گئے۔

آفس میں گہرا سناٹا چھا گیا۔ اشعر نے سر جھکا دیا۔ دل برا ہونے لگا۔ اسے ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے تھا۔

"تم شاپ بیچ دو۔"

اشعر کا منہ کھل گیا۔ "وہ تو آپ کی ہے' بابا۔"

"ہاں مگر میرا سب کچھ تمہارا اور عصرہ کا ہی ہے۔ وہ شاپ میں تمہیں دے دیتا ہوں' تم اس کو بیچ دو۔ وہ تاریخی مقام پہ ہے اور اس کی بہت قیمت ہو گی۔ تم خود الیکشن لڑو اور اس پیسے کو استعمال کرو۔"

اشعر چپ ہو گیا۔ "میں نے ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کیا' بابا۔"

"تو پھر جلدی فیصلہ کرو۔ تمہارے پاس زیادہ دن نہیں ہیں۔ اگر تم نے ایک ہفتے میں کاغذات نامزدگی داخل نہ کروائے تو تمہیں پانچ سال انتظار کرنا پڑے گا۔" وہ اس کو سمجھا رہے تھے مگر اشعر متامل تھا.... آفس کی سادہ دیواریں راکھ کے رنگ کی تھیں.... ایش ٹرے میں ٹھنڈی راکھ پھر سے اسے واضح نظر آنے لگی تھی۔

اشعر محمود نے سر جھٹکا اور اوپر دیکھا تو رملی جا چکا تھا۔ وہ اس چھوٹے سے سیاسی آفس میں تنہا بیٹھا تھا۔ ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بکھر گئی۔ اس نے سگریٹ کی تازہ بنی راکھ کو پھر سے ایش ٹرے پہ جھٹکا اور دہرایا۔

Ashes Ashes We all fall down!

☆☆☆

حالم کے بنگلے پہ دوپہر پگھل رہی تھی۔ بادل چھٹ چکے تھے اور آسمان صاف تھا۔ ڈرائیو وے پہ بھاری بھرکم داتن سامان کے شاپرز اٹھائے ہانپتی کانپتی چلتی آ رہی تھی۔ دروازہ کھلا تھا۔ وہ شاپرز اٹھائے اندر آئی تو لاؤنج کی ساری بتیاں جلی ہوئی تھیں۔ دوپہر کے وقت اتنی روشنیاں؟ وہ حیران ہوتی لاؤنج عبور کر کے کچن تک آئی اور شاپرز سلیب پہ رکھے۔ پھر ٹھٹک کے رکی۔ اطراف میں نگاہیں دوڑائیں۔

ہیل والی جوتیاں ادھر ادھر قالین پہ لڑھکی تھیں۔ جیولری' ٹاپس اتار کر میز پر پھینکے گئے تھے۔ صوفے کی حالت سے لگ رہا تھا وہ رات وہیں سوئی ہے۔ ساڑھی کی چمک صوفے پہ بھی لگی تھی۔ غرض ہر چیز ابتر تھی۔

"تالیہ.... تالیہ...." داتن نے چہرہ اوپر کر کے آواز دی۔ جواب ندارد۔ پھر اس نے پریشانی سے فون نکالا اور اسے کال ملائی۔ کال فوراً کاٹ دی گئی تھی۔ تالیہ اس کی کال بھلا کب کاٹتی تھی؟ وہ ٹھیک تو تھی نا؟

داتن دوبارہ کال ملانے لگی مگر درمیان میں اس کے بیٹے عدنان کی کال آ گئی۔ اس نے فون کان سے لگایا۔ "ہاں بولو...."

"ماں.... کیا حال ہے؟" وہ توقف سے بولا۔

"ذرا مصروف ہوں۔ تم بتاؤ۔" پھر اسے یاد آیا۔ "پیسے پورے مل گئے تھے اس دن؟"

"ہاں ماں' لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اگر ساشا میڈم نے اتنے پیسے آرام سے دے دیے ہیں تو...." وہ رک رک کے احتیاط سے کہہ رہا تھا۔ "تو اگر تم ان کی تھوڑی سی منت کر لو تو کیا معلوم اتنی رقم مزید بھی دے دیں۔ دیکھو ماں' یہ کم پڑ جائیں گے میرے لیے اور...."

"عدنان' میں اس وقت شدید پریشان کھڑی ہوں۔ پلیز تم کچھ دیر کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" لیانہ چیخ کے بولی۔ ساتھ ہی لاؤنج کی حالت کو تشویش سے دیکھ رہی تھی۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"ساشا میری کال نہیں اٹھا رہی۔ پتا نہیں وہ کہاں ہے۔"

"کہاں ہونا ہے' ماں؟ امیر لوگوں کے اپنے مشغلے ہوتے ہیں۔"

"عدنان' تم بار بار بھول جاتے ہو کہ وہ مجھے بیٹیوں کی طرح عزیز ہے' مگر تم نہیں سمجھو گے۔" اس نے کوفت سے فون بند کیا۔ پھر بے چینی اور تشویش سے تالیہ کا نمبر ملانے لگی۔ اب کی بار فون بند ہو گیا تھا۔

☆☆☆

کوالالمپور کے اس علاقے میں سڑک کنارے ریستوران اور کافی شاپس کی بہتات تھی۔ دونوں اطراف میں بنی دکانوں کے سامنے کرسیاں میزیں بچھا کے گاہکوں کو کھانا پیش کیا جا رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا اور لنچ بریک کے باعث طرح طرح کے لوگ اس فوڈ اسٹریٹ میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

ایسے میں ایک سوپ پارلر کے سامنے وہ کھڑی تھی۔ سفید اسکرٹ پہ سیاہ کوٹ پہنے' سنہرے بالوں کو پونی میں جکڑے' اداس مسکراہٹ سے اس پارلر کو دیکھ رہی تھی۔ تنگو کامل کے گھر 'نوکرانی' والا کردار ادا کرنے سے قبل اس نے یہاں نوکری حاصل کی تھی کیوں کہ تنگو کامل ادھر اکثر آیا کرتے تھے۔ تالیہ مراد کی ہر چیز پلان کا حصہ ہوتی تھی۔

"تالیہ!" آواز نے اسے چونکایا۔ سامنے سے بوڑھا شیف سبزیوں کی ٹوکری اٹھائے چلا آ رہا تھا۔

اسے دیکھ کے وہ خوش گوار حیرت میں گھر گیا۔
"تم کب آئیں؟ آؤ آؤ اندر آؤ۔ یہاں کیوں کھڑی ہو؟" وہ جو نفی میں سر ہلانا چاہتی تھی' شیف کے اصرار پہ منع نہیں کرسکی۔ وہ اسے مہلت دینے پہ راضی نہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ریستوران کے کچن میں کرسی پہ بیٹھی تھی اور مختصر سا عملہ اس کے گرد جمع تھا۔ ویٹریس' ایک (ویٹر)' شیف' سب اس کو حیرت' خوشی اور خفگی سے دیکھتے سوالوں کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔

"تم بنا بتائے چلی گئیں؟ پورے دو ہفتے بعد آ رہی ہو۔ بدلی بدلی لگ رہی ہو۔"

"ننگو کامل کی ملازمہ نور نے بتایا کہ تمہاری شادی ہوگئی ہے اور تم پاکستان چلی گئی ہو۔"

"واللہ تالیہ ہم تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ تم کیسی ہو؟" بوڑھا شیف بہت اپنائیت سے کہہ رہا تھا۔ تالیہ نے اداس مسکراہٹ سے اس خالی سلیب کو دیکھا۔ کبھی وہ اس پہ چوکڑی مارے بیٹھی ہوتی تھی۔ ان کو ایمان داری کی تلقین کرتی تھی۔ گانے گاتی تھی۔ سوپ اور باتیں بناتی تھی۔

اور آج وہ کرسی میز پہ سنبھلے ہوئے انداز میں بیٹھی تھی۔

"قسمت مجھ پہ مہربان ہوئی۔" اس نے ان کے سوالوں کے جواب میں متانت سے کہنا شروع کیا۔ "میں اپنے ملک واپس چلی گئی' اپنے بابا کے پاس۔ وہاں میری شادی ہوگئی اور یوں میں مالی طور پہ بہت مستحکم ہوگئی۔" وہ سچ بول رہی تھی۔ "میں نے ان کچھ دنوں میں دولت کی بہت ریل پیل دیکھ لی لیکن پھر....." اس کی آواز میں اداسیاں گھل گئیں۔

"پھر میں لیگل طریقے سے واپس آتو گئی لیکن واپسی کی قیمت مجھے یہ چکانی پڑی کہ میرا شوہر..... وہ مجھ سے کھو گیا۔"

"اس؟ وہ کہاں گیا؟ اتنی جلدی؟"

اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے۔ "بس یوں سمجھیں کہ اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ پتا نہیں اس کو میری کیا بات بری لگی۔ خیر....." اس نے انگلی کی نوک سے آنکھ صاف کی۔ "اب میرے پاس کافی پیسہ ہے' سو میں ویٹرس جیسی نوکری نہیں کروں گی بلکہ کوئی بہتر کام ڈھونڈوں گی۔ البتہ آپ لوگوں کو میں ہمیشہ یاد کروں گی۔ آپ نے..... اس جگہ نے..... (نگاہیں اطراف میں دوڑائیں) مجھے بہت کچھ سکھایا ہے۔ یہاں میں نے ہر ایک کو "تالیہ ایک سچی اور امانت دار لڑکی ہے۔" کہتے سنا تھا۔ ان الفاظ کو دوبارہ سننے کی خواہش نے مجھ سے بہت بروقت فیصلے کروائے ہیں۔"

وہ ٹھہر ٹھہر کے کہہ رہی تھی۔ اداس نظریں ان سب کے چہروں سے ہوتی در و دیوار پہ لپٹ جاتی تھیں۔ بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔ کیسے وہ ایک کردار بناتی تھی..... کیسے وہ اس میں ڈھل جاتی تھی۔

"تالیہ..... میری بچی....." شیف کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "تم جب چاہو واپس آسکتی ہو۔ یہ دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔"

"نہ بھی ہوں تو میں کھڑکی سے کود آؤں گی' داتو سری!" وہ نم آنکھوں سے ہنس کے بولی تو وہ سب بھی ہنس دیے۔

اس جگہ نے ایک اور فیصلہ اس کے لیے آسان بنا دیا تھا۔

☆☆☆

داتن لاؤنج میں ٹہل رہی تھی جب پورچ میں کار رکنے کی آواز آئی۔ آواز تالیہ کی کار کی تھی۔ اس نے سکون کا سانس لیا اور اپنے بھاری جثے کو سنبھالتی دروازے تک آئی۔

تب ہی دروازہ کھلا اور تالیہ اندر داخل ہوئی۔ وہ سادہ حلیے میں دھلے دھلائے چہرے کے ساتھ سپاٹ سی لگ رہی تھی۔ داتن کو دیکھ کے بس سر کو خم دیا اور آگے بڑھ گئی۔ داتن اس کی طرف گھومی یوں کہ اب دروازے کی طرف اس کی پشت تھی۔

"تم کہاں تھیں' تالیہ؟"

"جب میں کوئی کام شروع کرتی ہوں تو سب سے پہلا کام معلوم ہے کیا کرتی ہوں؟" تالیہ پرس صوفے پہ ڈالتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ داتن نے الجھ کے اسے دیکھا۔ "تالیہ نے جو کردار ادا کرنا ہوتا ہے' میں اس کی پروفائل لکھتی ہوں' اور پھر خود کو اس میں ڈھال لیتی ہوں۔ آج میں پرانے سوپ پارلر گئی تو مجھے یاد آیا کہ میرا ہر پلان میری پروفائل پہ انحصار کرتا ہے۔"

"میں جانتی ہوں' تالیہ۔ تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہو؟"

تالیہ پرس رکھ کے مڑی اور سادگی سے اسے دیکھا۔ "میں تمہیں نہیں بتا رہی' داتن۔"

داتن چونکی۔ پھر دروازے کی طرف گھومی۔ کھلی چوکھٹ سے دھوپ اندر آ رہی تھی اور وہاں..... ایڈم کھڑا تھا۔

"اندر آ جاؤ' ایڈم۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔" وہ بے نیازی سے کہتے ہوئے لاؤنج کے کونے میں بنے دروازے تک چلی گئی۔

ایڈم نے داتن کو دیکھ کے سلام کہا اور پھر طائرانہ نظریں اطراف میں دوڑائیں۔

داتن شل ہوگئی تھی۔

وان فاتح کا باڈی مین اب اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کے بال بے حد چھوٹے ہوگئے تھے۔ سادہ پینٹ شرٹ میں ملبوس تھا اور جیبوں میں ہاتھ ڈالے دلچسپی سے تالیہ کے گھر کا جائزہ لے رہا تھا۔

"نیچے میرا ورک روم ہے۔" تالیہ نے کونے والے دروازے کے ساتھ بنے چوکھٹے پہ انگوٹھا رکھا اور پھر کوڈ دبایا۔ برقی دروازہ کھل گیا۔ نیچے زینہ تھا۔ وہ زینہ اترنے لگی تو بتیاں خود بخود جلنے لگیں۔

"تو آپ جو بھی چراتی ہیں' وہ نیچے محفوظ کرتی ہیں۔" جب وہ نوجوان بھی سیڑھیوں پہ نیچے اترنے لگا تو داتن کو ہوش آیا۔ وہ ہڑبڑا کے ان کے پیچھے لپکی۔

ورک روم کی ساری بتیاں روشن ہو چکی تھیں۔ وہاں بہت سے ڈبے رکھے تھے جن میں سامان محفوظ تھا۔ ایک دیوار پہ بڑے بڑے سے لاکر بھی بنے تھے جن میں ہر خانے کے مختلف کوڈز تھے۔ درمیان میں بڑی سی ورک ٹیبل تھی۔ تالیہ نے کوٹ اتار کے ایک کرسی کی پشت پہ ڈالا اور کونے سے ایک وائٹ بورڈ کھینچ کر سامنے لائی۔ اسٹینڈ پہ لگا وائٹ بورڈ اس نے دیوار کے سامنے رکھا اور پھر سیاہ مارکر اٹھایا۔

"تالیہ..... میں تم سے بات کرسکتی ہوں؟" داتن ہانپتی ہوئی سیڑھیاں اتر کے نیچے آئی۔ ساتھ ہی بار بار ایڈم کو گھور رہی تھی جو اس کمرے کے لاکرز دیکھ رہا تھا۔

"ایڈم سب جانتا ہے اور یہ میرے نئے اسکام میں میرا ساتھ دے گا۔" تالیہ بورڈ پہ کچھ لکھتے ہوئے بولی تو داتن نے بے بسی سے اس کی کہنی چھوئی۔

"تالیہ..... تم اس پہ کیسے اعتبار کرسکتی ہو؟" وہ دبی سرگوشی میں بولی۔

"مجھے آواز سنائی دے رہی ہے ویسے۔" وہ کندھے اچکا کے بولا تو داتن نے پلٹ کے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"داتن پدوکا۔" تالیہ اس کی طرف گھومی اور رسان سے کہنے لگی۔ "ایڈم میرا دوست ہے۔ بلکہ اب ایڈم فیملی ہے۔ مجھے اس پہ مکمل اعتماد ہے۔ وہ کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔"

"مگر تالیہ..... تم اس کو کیسے کسی اسکام میں شامل کرسکتی ہو؟ اور اسکام ہے کیا؟"

"داتن!" تالیہ نے اس کے دونوں کندھوں کو تھاما اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "میں نے تم سے بہت دفعہ کہا تھا کہ میں اس جھوٹ اور خیانت کے کام کو ترک کرنا چاہتی ہوں۔ تم نہیں مانیں۔ جو اسکام اب ہم کھیلنے جا رہے ہیں' وہ سچائی اور ایمان داری سے کھیلا جائے گا۔ اگر تم خود کو وہ راستہ چھوڑنے کے لیے تیار کرسکتی ہو تو یہاں بیٹھو۔ ہم تمہیں سب بتا دیں گے۔ لیکن اگر تم تیار نہیں ہو تو کچن میں جاؤ' اور میرے لیے کچھ کھانے کو لاؤ' مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ کم از کم میری توانائی برقرار رکھنے کی حد تک تو تم میری مدد کرسکتی ہو۔"

داتن بالکل ٹھنڈی پڑ گئی۔ دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا' پھر گھنگھریالے سیاہ بال کان کے پیچھے اڑستی مڑ گئی۔ جاتے جاتے بھی وہ ایک جارحانہ قسم کی

گھوری ایڈم پہ ڈالنا نہیں بھولی تھی (ایڈم نے جلدی سے نظریں موڑلیں اور تالیہ کی طرف متوجہ ہوا۔)

''آپ نے اتنی جلدی میں بلایا' میں بتا نہیں سکا۔صبح وہ کوکو پھل....'' داتن چلی گئی تو وہ کہنے لگا مگر....

''میں کام کے وقت کام کے علاوہ بات نہیں کرتی' ایڈم۔یہ دیکھو۔'' سپاٹ سے انداز میں کہتے اس نے ایک فائل ایڈم کی طرف اچھالی۔ایڈم نے فائل تھامتے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔دونوں میز کے کنارے پہ آمنے سامنے کھڑے تھے۔تالیہ کی آنکھیں سپاٹ تھیں اور ایڈم کی متاسف۔

''آپ ٹھیک ہیں نا؟'' شاہی مورخ کو شہزادی کی فکر ہوئی۔

''ہاں' میں ٹھیک ہوں اور تم جانتے ہو اب میں جھوٹ نہیں بولتی۔'' وہ سنجیدہ تھی۔

''اس بارے میں میری رائے ابھی محفوظ ہے۔'' پھر فائل کھولی اور صفحے پلٹنے لگا۔

''یہ تالیہ مراد' تنگو کامل کی ملازمہ کی پروفائل ہے۔تنگو کامل کا خاندان اور سوپ پارلر والے اس تالیہ کو جانتے تھے۔مولیا کو بھی میں نے حالم بن کے یہی فائل بھیجی تھی۔''

''اوکے....اس کا کیا کرنا ہے۔''

تالیہ نے مارکر اس کی طرف بڑھایا اور فائل اس سے لے لی۔''میں اس پروفائل جیسی نہیں ہوں' اس لیے مجھے نئی پروفائل بنانی ہے۔سچائی اور ایمان داری کے ساتھ۔تم لکھتے جاؤ۔''

ایک دم سے وہ جیسے قدیم ملاکہ میں چلا گیا۔فضا میں مانوس سی خوشبو آنے لگی۔محل کا باغیچہ۔روش پہ ٹہلتی شہزادی....جس کا تاج اور زیورات دھوپ میں چمکتے تھے اور قلم سے الفاظ کاغذ پہ گھسیٹتا شاہی مورخ جو اس کے پیچھے پیچھے چلتا تھا......

''لکھو!'' ایڈم اس کی آواز پہ چونکا۔سفید اسکرٹ بلاؤز اور پونی میں بندھے بالوں والی لڑکی میز کے گرد ٹہلتی فائل کھولے لکھوا رہی تھی۔ایڈم نے غیر ارادی طور پہ سر کو تعظیم میں خم دیا' پھر مارکر وائٹ بورڈ تک آیا۔

''تالیہ مراد۔'' تالیہ فائل سے پڑھتی شروع ہوئی۔وہ پہلے فائل کے الفاظ پڑھتی پھر اس مختلف الفاظ لکھواتی۔

(تالیہ مراد۔اس کا تعلق کشمیر سے ہے۔)

''تالیہ بنتِ مراد راجہ....اس کا تعلق ملاکہ سے ہے۔''

ایڈم تعمیل کرتے ہوئے مارکر سے سفید بورڈ پہ الفاظ اتار رہا تھا۔

(تین ماہ سے تنگو کامل کی ملازمہ ہے۔زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہے' مگر انگریزی اور ملے زبان ٹھیک سے بول لیتی ہے۔)

''وہ پچھلے کئی سال سے کے ایل میں مقیم ہے۔وہ نہ صرف تعلیم یافتہ ہے بلکہ اس کو آداب معاشرت سے مکمل آگاہی ہے۔'' تالیہ میز کے گرد ٹہل کے لکھوا رہی تھی۔''وہ چار زبانیں بول اور لکھ لیتی ہے اور اس کو آرٹ کی گہری سمجھ ہے۔''

(بہت باتونی لڑکی ہے۔قدرے بے وقوف اور جلد باز۔)

''وہ بہت ذہین لڑکی ہے۔اسے لمبے لمبے صبر آزما کھیل کھیلنے کی عادت ہے اور وہ انسانوں کے لالچ کو اندر تک پڑھ لیتی ہے۔''

(آدھا دن تنگو کامل کی ملازمت کرتی ہے اور شام میں ایک ریستوران میں بطور ویٹرس کام کرتی ہے۔کشمیر میں اس کا لمبا چوڑا خاندان ہے جس کی کفالت یہی کرتی ہے۔)

''لکھو۔اعلا خاندان سے تعلق رکھنے کے باعث اسے بے پناہ دولت ورثے میں ملی ہے۔وہ کوئی جاب نہیں کرتی بلکہ سوشلائیٹ ہے اور مختلف چیریٹی ورکس میں حصہ لیتی ہے۔اس کا کوئی خاندان نہیں ہے جو اس کی کمزوری بنے۔''

کمرے میں یا تالیہ کی آواز تھی یا شاہی مورخ کے سفید بورڈ پہ مارکر گھسیٹنے کی۔

(جو کماتی ہے اپنے خاندان کو بھیج دیتی ہے۔خود عام کپڑوں اور جوتوں میں خوش باش گھوم رہی ہوتی ہے۔)

''لکھو کہ تالیہ صرف اپنے لیے کماتی ہے' اپنے لیے جیتی ہے۔شہزادیوں کی طرح رہتی ہے اور قیمتی چیزیں اوڑھتی پہنتی ہے۔''

(تالیہ کو سوپ بنانے' احمقوں کی طرح بہت بولنے اور ہر چھپکلی کاکروچ کو دیکھ کے چیخیں مار مار کے رونے کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔)

''لکھو کہ....تالیہ کو تیر اندازی اور تلوار زنی کے علاوہ پینٹنگ اور مجسمہ سازی میں بھی مہارت حاصل ہے۔وہ اتنی بہادر ہے کہ ایک تیر سے کموڈو ڈریگن کو ہلاک کرسکتی ہے۔''

ہر فقرے کے ساتھ تالیہ کی آواز بلند ہو رہی تھی۔اندر جیسے بہت سا غصہ تھا جو ابل ابل کے آرہا تھا۔ایڈم بار بار ایک خاموش نظر اس پہ ڈالتا تھا۔اسے اس کی فکر ہو رہی تھی۔

(وہ ایسی لڑکیوں میں سے ہے جن کے پاس اچھی شکل اور دراز قد کے علاوہ کوئی خصوصیت اور صلاحیت نہیں ہوتی۔نہ ذہانت نہ تعلیم۔)

''وہ ایسی لڑکیوں میں سے ہے جو ہمت نہیں ہارتیں' بہادری سے ہر مشکل کا سامنا کرنے کی ترکیب ڈھونڈتی ہیں اور ان کو اپنی تکمیل کے لیے کسی مرد کی ضرورت نہیں ہوتی۔''

(اس کے باوجود تنگو کامل ہو یا سوپ پارلر والے' سب تالیہ سے محبت کرتے ہیں۔میں یہ دیکھ کے بہت حیران ہوا کہ ایک کم ذہن' کم علم' اور سادہ سی لڑکی پہ سب اتنا اعتبار کیوں کرتے ہیں؟ مگر اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہ ایمان دار' سچ بولنے اور خیال رکھنے والی لڑکی ہے۔خوش اخلاق اور ہنس مکھ ہے۔ان ہی خامیوں کی وجہ سے وہ زندگی میں کبھی ترقی نہیں کرسکی اور نہ کرسکے گی۔)

اگلی سطور پڑھ کے وہ چند لمحے تک خاموشی سے فائل پہ سر جھکائے کھڑی رہی۔ایڈم کھلا مارکر لیے منتظر سا اسے دیکھے گیا۔پھر تالیہ نے فائل بند کی اور چہرہ اٹھا کے جیسے حقیقت کا سامنا کیا۔

''لکھو کہ تالیہ بنت مراد کی ان ہی خوبیوں کی وجہ سے اس سے دل سے کوئی محبت نہیں کرتا۔ایک بے حد شاطر' ہنر مند اور پر اعتماد لڑکی جو کسی سے نہ ڈرتی ہو' اسے لوگ مشکل سے ہی پسند کرتے ہیں کیونکہ مرد عورتوں کو مضبوط بننے کے لیے تو کہتے ہیں' لیکن وہ خود کو ان مضبوط عورتوں کے لیے تیار نہیں کرتے۔لکھو کہ وہ اب جھوٹ نہیں بولتی اور ایمان داری سے معاملات ڈیل کرنا چاہتی ہے اور اسے خود بھی نہیں معلوم کہ ان خوبیوں کے ساتھ وہ کبھی ترقی کر بھی سکے گی یا نہیں۔''

پروفائل ختم ہو چکی تھی۔اس نے فائل میز پہ ڈال دی اور وائٹ بورڈ کو دیکھا جہاں ایڈم کا ہاتھ سرعت سے چلتا الفاظ رقم کر رہا تھا۔پھر وہ پیچھے ہٹ گیا اور تالیہ قریب آئی۔اس کی آنکھیں ان الفاظ پہ جمی تھیں۔

''کیا یہ پروفائل من گھڑت ہے' چے تالیہ یا اب آپ ایسی ہی بن چکی ہیں؟''

''کیا تم اب تک یہ نہیں جان پائے ہو؟'' وہ الفاظ کو پڑھتے ہوئے بولی۔

داتن ٹرے لیے نیچے آئی اور اسے میز پہ رکھا۔پھر کرسی کھینچی اور کہنیاں میز پہ رکھے ناراض سی بیٹھ گئی۔ایڈم نے ایک نظر ٹرے کو دیکھا اور پھر تالیہ کی پشت کو۔

''آپ کچھ کھالیں' چے تالیہ۔'' ساتھ ہی چاکلیٹ براؤنیز کی پلیٹ اس کی طرف دھکیلی۔

داتن اسے گھورتے ہوئے قریب ہوئی۔''یہ براؤنیز میں اپنے لیے لائی تھی۔تالیہ اتنی ساری چاکلیٹ اور میٹھا نہیں کھاتی۔وہ گرل چکن کھائے گی۔''

ایڈم نے بہت ضبط سے جواباً سرگوشی کی۔''ان کو چاکلیٹ سب سے زیادہ پسند ہے۔شاید آپ نہیں جانتیں۔''

''تالیہ! کھانا کھالو۔'' داتن نے بلند آواز میں

پکارا تو وہ جو وائٹ بورڈ پڑھنے میں مصروف تھی، چونکی اور پلٹی پھر میز پہ رکھی اشیاء کو متلاشی نظروں سے دیکھا۔ ٹرے تک جھکی اور گرل چکن کی پلیٹ اٹھا کے واپس وائٹ بورڈ کی طرف مڑ گئی۔

داتن نے فاتحانہ نگاہوں سے ایڈم کو دیکھا۔

''اس کو چاکلیٹس پسند ہیں لیکن وہ اپنی ہر پسند کو عادت نہیں بنا لیتی۔'' اس کے تو جیسے اندر تک طمانیت بکھر گئی اور ایڈم اندر تک جل گیا۔

''اور کچھ؟''

''بس اتنا کہ.....'' داتن اس کی طرف جھکی اور اسے گھورا۔ ''یہ وائٹ بورڈ پہ تالیہ نے کمبوڈو ڈریگن کو ایک تیر سے ہلاک کرنے کا لکھا ہے' وہ سچ ہو یا نہ ہو' اگر تم نے میری تالیہ کو کبھی نقصان پہنچایا تو واللہ میں تمہیں کسی بھوکے کمبوڈو ڈریگن کے سامنے ڈال دوں گی۔''

''پھر ایک بات میری بھی سن لیں۔'' وہ بھی اس کے قریب جھکا۔ ''ایڈم بن محمد کو کمبوڈو ڈریگن سے ڈر نہیں لگتا۔ اس لیے آپ اپنی دھمکی اپ گریڈ کرنے کے بارے میں سوچیں۔''

داتن نے ''ہونہہ'' کہہ کر سر جھٹکا اور تالیہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ اپنی پروفائل کو ذہن نشین کر کے ان کی طرف گھوم چکی تھی اور سنجیدگی سے لائحہ عمل بتا رہی تھی۔

''داتن..... میں جانتی ہوں اس کام میں تم ہمارا ساتھ نہیں دو گی۔ نہ میں تمہیں ساتھ چلنے کے لیے کہوں گی۔ مگر تمہیں یہیں سے ایک کام کرنا ہو گا۔ میں تمہیں ٹیکسٹ کر رہی ہوں۔''

ساتھ ہی موبائل پہ بٹن دبائے تو داتن کے فون کی ٹون بجی۔ اس نے عینک لگائی اور اسکرین دیکھی۔ پھر عینک اتاری اور تالیہ سے بولی۔ ''کام ہو جائے گا۔'' پھر ایک جتاتی نظر ایڈم پہ ڈالی۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں' چے تالیہ؟'' وہ قدرے حیران تھا۔

''عصرہ کے گھر نیلامی میں۔ آج گھائل غزال کی نیلامی ہے اور مجھے اس کی سب سے بھاری بولی لگانی ہے' تاکہ اشعر کے بندے اسے نہ خرید سکیں کیونکہ وہ پینٹنگ کو ٹیسٹ کروا کے عصرہ کو عزت کرنا چاہیں گے۔ میں تیار ہونے جا رہی ہوں' وقت کم ہے۔'' وہ بے نیازی سے کہہ کے زینے کی طرف بڑھی تو ایڈم نے الجھن سے پکارا۔

''مگر ہمیں مسز عصرہ کو اس نقلی پینٹنگ کو نیلامی کے لیے رکھنے سے روکنا چاہیے۔ اگر آپ اسے نہ خرید سکیں اور ان لوگوں نے وہ خرید لی' تو کیا ہو گا؟''

''ایڈم! جب میں مشورہ مانگوں' تب دینا۔ ابھی کھانا کھا لو۔'' وہ بے نیازی سے کہہ کے زینے چڑھنے لگی۔ ایڈم نے خفگی سے اسے دیکھا پھر داتن کو جو فاتحانہ مسکراہٹ سے اسے ہی دیکھے جا رہی تھی۔

''تالیہ کے پلانز میں تالیہ کی مرضی چلتی ہے' لڑکے!''

''بہت شکریہ۔'' وہ جل کے بولا۔

داتن کے اندر تک ٹھنڈ پڑ گئی تھی۔

☆☆☆

وان فاتح کی رہائش گاہ کے لان میں تقریب کے انتظامات ہو چکے تھے اور مہمانوں کی آمد آمد تھی۔ بڑے بڑے شوکیسوں میں قیمتی نوادرات اور پینٹنگز سجی تھیں' جن کے گرد لوگ گھوم پھر کے ان کو دیکھ رہے تھے۔ چوکس سیکیورٹی اہلکار جگہ جگہ تعینات تھے۔

وان فاتح اپنے کمرے میں موجود تھا۔ سنگھار میز کے آئینے کے سامنے وہ کالر کھڑے کیے ٹائی پہن رہا تھا۔ پھر آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے ٹھہرا۔ انگلیوں سے گردن کی پشت کو ٹٹولا۔ ابھرا ہوا گول نشان واضح محسوس ہوتا تھا۔

اس کی آنکھوں میں بے بس سی الجھن ابھری۔

یہ زخم... یہ نشان؟ پھر اس نے سر جھٹکا (جن لڑکوں سے ہاتھا پائی ہوئی تھی' یقیناً انہوں نے ہی یہ چوٹ دی ہو گی۔ یا شاید یہ پرانی ہو اور اس نے پہلے نوٹس نہ کیا ہو)۔

پھر ایک دم وہ چونکا۔ ٹائی وہیں گردن میں چھوڑے' اس نے موبائل اٹھایا۔

اس کی سوشل میڈیا ٹیم نے ملاکہ کے ساحل پہ

چار روز قبل فاتح سے ملاقات کرنے والے نوجوان کی تصاویر شیئر کی تھیں۔ یقیناً اس نوجوان نے تصاویر سوشل میڈیا پہ لگائی تھیں جہاں سے معمول کے مطابق اس کی ٹیم نے انہیں آفیشل ہینڈل پہ پوسٹ کر دیا تھا۔ فاتح نے تیزی سے ان تصاویر کو کھولا۔ پھر دو انگلیوں سے بڑا کیا۔

ایک تصویر ساحل پہ چلتے وان فاتح کی پشت سے کھینچی گئی تھی جس میں اس کی سفید شرٹ ہوا سے پھڑ پھڑا رہی تھی۔ اور گردن صاف دکھائی دیتی تھی۔ وہ بالکل صاف اور بے داغ تھی۔

فاتح کے ابرو اکٹھے ہوئے۔ یہ شرٹ..... یہ شرٹ کہاں گئی؟ پولیس اسٹیشن کی ویڈیو میں اس کی سیاہ شرٹ تھی۔ وہ ملاکہ میں صبح اٹھا' تب بھی اس کی سیاہ شرٹ تھی۔ مگر اس روز تو اس نے سفید شرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ شرٹ کہاں گئی؟

اس نے کوفت سے موبائل رکھا اور سر جھٹکا۔ ان لڑکوں نے اسے زخمی کیا ہو گا یقیناً... کپڑے خون آلود ہو گئے ہوں گے..... اس نے پھینک دیے ہوں گے..... یہ اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں کہ وہ اس بارے میں اتنا سوچے۔

وہ اب سنجیدگی سے آئینے میں خود کو دیکھتا ٹائی باندھنے لگا۔ پھر کالر برابر کیے۔ پرفیوم اٹھا کے خود پہ چھڑکا۔ سفید شرٹ پہ گہری نیلی ٹائی رات کی تقریب کی مناسبت سے بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ گیلے بال دائیں طرف کو پیچھے کر کے جما رکھے تھے۔ آنکھ کا زخم ویسا ہی تھا۔

تب ہی عقب میں دروازہ کھلا اور عصرہ داخل ہوئی۔ جوڑا باندھے' کانوں میں آنسو شکل موتی پہنے' وہ پیر تک آتے سلور لباس میں ملبوس تھی۔ دو لٹیں گھنگریالی کر کے گالوں پہ چھوڑ رکھی تھیں۔ مسکراتی ہوئی وہ اس کے قریب آئی اور میز سے کنسیلر کی ڈبیہ اٹھائی۔

''اتنے برس پہلے جو گیلری میں نے بنائی تھی۔ اتنے برس جو سامان اکٹھا کیا تھا.... آج وہ سب بک جائے گا۔'' وہ اداس مسکراہٹ سے کہتی کنسیلر کی ڈبیہ کھول رہی تھی۔ فاتح نے کوٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے اس کی طرف رخ موڑا۔

''حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں تو اب بھی چاہوں گا کہ تم اپنا کام جاری رکھو۔''

''ہمیں امریکہ میں سیٹل ہونے کے لیے.....''

''ہم امریکہ نہیں جا رہے۔ تم جانا چاہو تو الگ بات ہے۔ میں یہیں رہوں گا۔ ہم یہ بات کر چکے ہیں' عصرہ!'' وہ ٹھنڈے انداز میں بولا تو عصرہ نے ڈبیہ سے ذرا سا غازہ انگلی کے پور پہ لگایا اور پھر اسے فاتح کی آنکھ کے قریب احتیاط سے ملنے لگی۔

''تم ضد چھوڑ کیوں نہیں دیتے' فاتح۔ تمہارے پاس ویسے بھی الیکشن کے لیے اتنی رقم نہیں ہے۔'' اب وہ غازہ اس کی کنپٹی پہ مل رہی تھی۔ زخم دھیرے دھیرے چھپنے لگا۔

''پیسوں کی فکر نہ کرو۔ میں سن باؤ والا گھر بیچ رہا ہوں۔ بات ختم۔'' وہ.... ذرا بے رخی سے بولا تو عصرہ نے جتاتی مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

''تمہیں جلد یا بدیر احساس ہو جائے گا' فاتح کہ میں درست ہوں اور تم غلط۔ خیر.....''

زخم چھپ گیا تھا۔ اس نے ڈبی رکھی اور مسکرا کے فاتح کو دیکھا جو کچھ ناخوش نظر آتا تھا۔

''آج کے دن تم میرا مکمل ساتھ دو گے۔ جیسے میں نے تمہیں سپورٹ کیا ہے اتنے سال' تم آج اس سب کا لحاظ کرو گے۔''

''ظاہر ہے۔'' اس نے ٹائی کو دوبارہ کستے ہوئے کندھے اچکائے۔

پھر وہ دونوں ایک ساتھ باہر نکلے۔ سیاہ ٹو پیس میں ملبوس وجیہہ صورت مسکراتا ہوا فاتح اور اس کی کہنی تھامے سلور چمکتے لباس میں خوش باش سی عصرہ۔ وہ دونوں ایک ساتھ چلتے بے حد بھلے معلوم ہوتے تھے۔ پرفیکٹ کپل۔

''سر درد کی دوا ملے گی' مسز عصرہ؟''

آواز پہ عصرہ چونک کے پلٹی۔

☆☆☆

نیلامی کی تقریب شروع ہو چکی تھی۔ لان میں

اونچا اسٹیج بنا تھا اور سامنے کرسیوں کی دو قطاریں لگی تھیں۔ درمیان میں گزرنے کا راستہ تھا۔ اولین کرسیوں میں سے دو نشستوں پہ تالیہ اور ایڈم بیٹھے تھے۔ ایڈم اس زبردستی کے سوٹ میں غیر آرام دہ سا بیٹھا بار بار گردن موڑے اطراف میں دیکھ رہا تھا۔

"میں اور آپ ایک دفعہ پہلے بھی ایک نیلامی اٹینڈ کر چکے ہیں، بے تالیہ۔" وہ ہچکچا کے بولا۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں "ماضی" خود کو دہرانے نہ لگ جائے۔"

"دہرا بھی دے تو کیا ہوا۔" تالیہ لمبی گردن سیدھی رکھے، چہرے پہ مصنوعی مسکراہٹ سجائے سکون سے بیٹھی تھی۔ اس نے اونچا جوڑا باندھ رکھا تھا اور سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ میک اپ کے نام پہ صرف سرخ لپ اسٹک تھی۔ البتہ انگلی کی سرخ آنسو شکل انگوٹھی، کانوں کے یاقوتی ٹاپس اور گردن میں پڑا ہیرے کا نیکلس.... قدیم ملاکہ کا وہ زیور اسے مزید دلکش بنا رہا تھا۔

تالیہ کن اکھیوں سے اپنے دائیں جانب، دو نشستیں چھوڑ کے بیٹھی عصرہ کو دیکھ رہی تھی جو چم چم کرتے لباس میں مسکرا کے اپنے شوہر سے کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ بھی مسکرا کے جواب دے رہا تھا۔ فاتح کے ساتھ بیٹھا اشعر ان کی بات پہ محظوظ سا ہنسا تھا۔ لوگ تصاویر اتار رہے تھے۔ ان کو سراہ رہے تھے۔ وان فاتح، اس کی بیوی اور سالا.... پرفیکٹ فیملی کی تکون۔

"کیا ان کو اپنی بیوی کے ساتھ دیکھ کے برا لگتا ہے آپ کو؟" ایڈم نے سرگوشی کی تو وہ چونکی۔ وہ قدیم ملے میں مخاطب ہوا تھا۔ جب لوگ آس پاس ہوتے تو وہ دونوں قدیم ملے زبان بولنے لگتے تھے۔

تالیہ کے لبوں پہ مبہم مسکراہٹ بکھر گئی۔

"نہیں، شاہی مورخ، کیونکہ میں ان تینوں کے رشتے کی حقیقت جانتی ہوں۔ یہ ایک دوسرے سے بے زار لوگ ہیں۔" پھر گردن موڑ کے اسے دیکھا۔

"تمہارے کیا ارادے ہیں اب؟"

"پتا نہیں، بے تالیہ۔" وہ گہری سانس لے کر اسٹیج کو دیکھنے لگا۔ کوٹ اور ٹائی میں ملبوس، چھوٹے بالوں اور گندمی رنگت والا ایڈم غیر آرام دہ نظر آتا تھا۔

"مجھے لگتا ہے میں دو دنیاؤں کے درمیان پھنس گیا ہوں۔"

"سنو ایڈم!" وہ اس کی طرف ذرا جھکی اور سرگوشی کی۔ "ماضی صرف سیکھنے کے لیے ہوتا ہے۔ نہ اس کے خیالوں میں گم رہا جاتا ہے، نہ اس سے بالکل فرار حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔"

"کل تک اتنی اپ سیٹ تھیں آپ۔ ایک دن میں خود کو سنبھال کیسے لیا ہے؟" ایڈم بس اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت ضبط سے مصنوعی مسکراہٹ سجا کے بیٹھی تھی۔ اس سوال پہ محض شانے اچکائے۔

"ایک بات تو طے ہے کہ جو بھی ہو جائے، تالیہ کی ہمت نہیں ٹوٹے گی۔"

ایڈم کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اسٹیج پہ کھڑے آدمی نے ڈائس کے مائیک پہ چہرہ جھکا کے اعلان کیا۔

"گھائل غزال۔" ساتھ ہی بازو سے اشارہ کیا۔ دو باوردی ملازم آئے اور وہ نادر چھوٹی سی پینٹنگ اسٹینڈ پہ رکھ کے چلے گئے۔ سنہرے فریم میں مقید وہ پینٹنگ محض دو بالشت جتنی تھی۔

پیچھے اسٹیج پہ لگی بڑی پروجیکٹر اسکرین پہ اس پینٹنگ کی تعارفی وڈیو چلنے لگی۔ کس نے بنائی، کب بنائی، وغیرہ وغیرہ۔

"بولی شروع ہوتی ہے پچاس ہزار رنگٹ سے۔ کیا کوئی اس سے زیادہ پیش کرے گا؟" وڈیو کے ختم ہوتے ہی میزبان نے جوش سے حاضرین کی طرف اشارہ کیا۔ تالیہ نے اپنی اسٹک اٹھائی جس پہ اس کا نمبر لکھا تھا اور باآواز بلند بولی۔

"ایک لاکھ رنگٹ!"

دو کرسیاں چھوڑ کے بیٹھی عصرہ نے مسکرا کے اسے دیکھا۔ فاتح البتہ اسٹیج کو دیکھتا رہا اور اشعر.... وہ کن اکھیوں سے عصرہ کو دیکھ رہا تھا۔

دوسری قطار میں بیٹھے ایک صاحب نے اپنا کارڈ بلند کیا۔ "ایک لاکھ پچیس ہزار۔" مگر اشعر کو اس کی آواز نہ سنائی دی۔ لمحے بھر کے لیے اس کی آنکھوں کے سامنے

سے حال لپیٹ دیا گیا اور ماضی کا منظر چلنے لگا۔

وان فاتح کی رہائش گاہ کے سامنے وہ کار میں بیٹھا تھا اور اسٹیئرنگ وہیل پہ چند کاغذ رکھے ان کو پڑھ رہا تھا۔ کاغذات نامزدگی۔ اشعر محمود۔ بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ کاغذ جمع کروانے کی کل آخری تاریخ تھی۔

اس نے کاغذات کو تہہ کر کے پینٹ کی جیب میں ڈالا اور باہر نکلا۔ پورچ سنسان پڑا تھا۔ فاتح کی کار وہاں نہیں تھی۔ البتہ عصرہ کی کار موجود تھی۔ لان بھی خالی تھا۔ وہ جوش اور مسرت سے اندر داخل ہوا تو لاؤنج میں سامنے آریانہ بیٹھی دکھائی دی۔ وہ چہرہ جھکائے کسی کلرنگ بک میں رنگ بھر رہی تھی۔ لمبے بال چہرے کے اطراف میں گر رہے تھے۔ آہٹ پہ سر اٹھایا تو اشعر کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ ہلکا سا مسکرائی اور سر کو خم دے کر سلام کیا۔

"آریانہ! ممی کہاں ہیں؟" وہ مسکراتا ہوا سامنے آیا۔ تب ہی اپنے کمرے سے عصرہ نکلتی دکھائی دی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے کان کا ٹاپس بند کرتی، بغل میں پرس دبائے، عجلت میں لگتی تھی۔

"ایش.... یہ میں کیا سن رہی ہوں؟" وہ خفا خفا سی ٹاپس بند کرتے قریب آئی۔ اشعر کی مسکراہٹ سمٹی۔

"کا کا، میں....."

"بابا نے بتایا کہ تم کاغذات نامزدگی کے بارے میں سوچ رہے ہو۔ یقیناً یہ بے کار خیال بھی انہوں نے تمہارے دل میں ڈالا ہوگا۔ خیر میں نے ان کو اچھی خاصی سنا دی ہیں۔ بھئی حد ہوتی ہے۔ یہ کوئی تمہارے کرنے کا کام ہے۔ تم جو کر رہے ہو، اسی میں ٹھیک ہو۔" وہ برہمی سے کہہ رہی تھی۔

اشعر کی مسکراہٹ بالکل معدوم ہو گئی۔ وہ چپ چاپ سننے لگا۔

"بابا کی ہر بات پہ فضول چیزیں نہ سوچنے لگ جایا کرو، ایش۔ وہ تو ہمیشہ سے ہی ایسے تھے، اور وہ شاپ تو میں نے کب سے بابا کو کہہ رکھا ہے کہ مجھے چاہیے۔ میں نے اس پہ آرٹ گیلری بنانی ہے۔"

اشعر کے کندھے ڈھیلے ہو کے نیچے جا گرے۔

"آپ نے.... پہلے تو کبھی نہیں کہا۔"

"تو اب کہہ رہی ہوں نا۔ دیکھو ایش...." وہ مصالحتی انداز میں قریب آئی۔ ایک ہاتھ سے کلچ پکڑ لیا، دوسرا اس کے کندھے پہ رکھے نرمی سے سمجھانے لگی۔ "مجھے آرٹ گیلری کھولنی ہے۔ میں ایک سیاسی بیوی ہوں، مجھے فاتح کے ساتھ پبلک کی نظر میں رہنا ہے۔ میرا بھی کوئی کیریئر، کوئی پہچان ہونی چاہیے۔ وکیل ہونے کے باوجود فاتح کے تین بچے پالتے پالتے میں کبھی پریکٹس نہیں کر سکی، (آریانہ نے سر اٹھا کے ماں کو دیکھا) اور مجھے شوق بھی نہیں ہے، لیکن یہ آرٹ گیلری فاتح کو بھی فائدہ دے گی اور تم.... تم بالکل بھی سیاست میٹریل نہیں ہو۔ میں کبھی بھی بابا کو یا تمہیں وہ دکان بیچنے نہیں دوں گی۔"

اشعر کے لب بھنچ گئے تھے۔ آنکھوں میں تکلیف ابھری مگر وہ کہے جا رہی تھی۔

"ایش دیکھو.... اگر تم وہ دکان بیچ بھی دو تو تم جیت نہیں سکتے۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔ ابھی تم صرف فاتح کو سپورٹ کرو۔ دکان کو ضائع مت کرو۔ اس سے بہتر ہے وہ دکان بابا مجھے دے دیں۔ تم جو ہو، وہی ٹھیک ہو۔ سمجھ رہے ہو نا۔"

اشعر نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کار میں بیٹھا تھا۔ کاغذات ہاتھ میں اٹھائے وہ ان کو آخری نظر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے لب بھینچ لیے اور ان کو چاک کر دیا۔ چار، پھر آٹھ ٹکڑے کیے..... اور ان کو ڈیش بورڈ کے خانے میں ڈال کے ڈھکن زور سے بند کیا۔

اس کا چہرہ اب غصے بھری بے بسی سے سرخ پڑ رہا تھا مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے پاس اس دکان کے علاوہ بیچنے کو کچھ نہیں تھا۔ پانچ سال...... اسے پانچ سال مزید انتظار کرنا تھا۔

"دو لاکھ۔" نیلامی اپنے عروج پہ تھی۔ وہ میزبان کی آواز پہ چونکا، اور پھر جلدی سے سر جھٹکا۔ کن اکھیوں سے ساتھ بیٹھی عصرہ کو دیکھا جو جوش سے

مسکراتی اسٹیج کو دیکھ رہی تھی۔

''دو لاکھ پچاس ہزار!'' پہلی قطار میں بیٹھی تالیہ نے سکون سے کارڈ بلند کیا۔

''دو لاکھ ستر ہزار۔'' دوسرے کونے میں بیٹھا آدمی فوراً سے کارڈ اٹھا کے بولا۔

''تین لاکھ۔'' وہ سکون سے اسٹیج کو دیکھتی قیمت بڑھا رہی تھی۔

''سوا تین لاکھ۔'' اس آدمی نے اس سے زیادہ سکون سے کہا تو تالیہ چونکی۔ پوری گردن موڑ کے اسے دیکھا۔ چہرے پہ ہلکی سی پریشانی نظر آئی۔

''بے تالیہ! آپ کو یہ ہر حال میں خریدنی ہے۔'' ایڈم نے اضطراب سے سرگوشی کی۔

''سوا تین لاکھ ایک.... سوا تین لاکھ دو۔ بے تالیہ! کیا آپ رقم بڑھانا چاہیں گی۔'' میزبان جوش سے پوچھ رہا تھا۔

تالیہ نے تھوک نگلا۔ پھر کارڈ اٹھایا۔ ''تین لاکھ پچاس ہزار۔''

''چار لاکھ!'' وہ آدمی سرعت سے بولا۔

پہلی قطار میں سب کی گردنیں تالیہ کی طرف گھومیں۔ وہ اسٹیج کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے ایک کھلی لٹ کان کے پیچھے اڑسی اور بولی۔ ''چار لاکھ پچیس ہزار۔''

''ساڑھے چار لاکھ۔'' وہ آدمی اسے موقع نہیں دے رہا تھا۔

تالیہ نے گہری سانس لی اور گردن پھیر کے عصرہ کو دیکھا۔ وہ مسکرا کے اسے دیکھ رہی تھی۔ عصرہ کے اس طرف بیٹھا فاتح بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

تالیہ نے پھر سے کارڈ اٹھایا۔ ''پونے پانچ لاکھ۔''

''چھ لاکھ!'' اس آدمی نے ایک دم چھ لاکھ پہ چھلانگ لگائی تو تالیہ نے گہری سانس لے کر کارڈ گود میں ڈال دیا۔

''چھ لاکھ ایک.... چھ لاکھ دو....'' پرجوش میزبان تالیہ کو دیکھ کے پوچھ رہا تھا۔ اکسا رہا تھا مگر اس نے نظریں جھکا لیں۔

''بے تالیہ! پلیز....'' ایڈم کراہا مگر وہ دلی سرگوشی میں بولی۔ ''میرے پاس اس سے زیادہ نہیں ہیں ایڈم۔''

''چھ لاکھ فائنل۔ مبارک ہو مسز عصرہ۔ گھائل غزال چھ لاکھ میں جناب جعفر غنی کو فروخت کی جاتی ہے۔'' میزبان نے نعرہ لگایا تو لان میں بیٹھے تمام لوگ تالیاں بجانے لگے۔ سوائے ایڈم کے۔

جعفر صاحب کھڑے ہوئے اور مسکرا کے مبارکبادیں وصول کیں۔ پھر کھنکھارے۔

''مجھے یہ اعتراف کرنے دیں کہ میں اپنی جمع پونجی کا ایک حصہ اس پینٹنگ پہ لٹا رہا ہوں۔'' حاضرین نے اس بات پہ بے اختیار قہقہہ لگایا تھا۔

''لیکن....'' وہ دوبارہ کھنکھارے۔ ''میں اس کو خریدنے سے پہلے ایک دفعہ اس کو ٹیسٹ کروانا چاہوں گا۔''

ایک دم سے تقریب میں سناٹا چھا گیا۔ بہت سی گردنیں اس طرف گھومیں۔ خود عصرہ پوری کی پوری گھوم گئی۔ ابرو بھینچ گئے۔

''جعفر صاحب! یہ تمام پینٹنگز اصلی ہیں' میرے پاس ان کے کاغذات ہیں۔'' وہ جبراً مسکرا کے بولی۔ ''اور ہم تمام ٹیسٹ کروا چکے ہیں۔'' (اشعر زیرلب مسکرایا۔)

''جی مگر اپنی تسلی کے لیے اگر اس تقریب میں موجود دو آرٹ ایکسپرٹس اس پینٹنگ کو جانچ پرکھ لیں تو میں آپ کا مشکور ہوں گا۔'' اس نے پچھلی قطار کی طرف اشارہ کیا تو دو افراد کھڑے ہوئے۔ ایک نوجوان تھا' دوسرا ادھیڑ عمر۔

''تنکو منیر صاحب۔'' عصرہ خوش گوار حیرت سے ان کو دیکھ کے جگہ سے اٹھی۔ پھر حاضرین کو دیکھا۔ ''یہ تنکو منیر اور اسمٰعیل صاحب ہیں۔ یونیورسٹی پروفیسرز ہونے کے علاوہ یہ ہمارے اقرباء میں سے ہیں۔ اگر یہ پینٹنگ کو جانچ پرکھ کے دیکھنا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ پلیز آپ لوگ اوپر تشریف لے آئیں۔'' وہ جوش سے کہہ رہی تھی۔

''مگر اس ٹیسٹ کی کیا ضرورت ہے؟'' تالیہ زور سے بولی تو سب مڑ مڑ کے اسے ہی دیکھنے لگے۔

''کیا مسز عصرہ کی نیک نامی اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ یہ پینٹنگ اصلی ہے؟ اگر آپ مسز عصرہ سے کچھ خریدنے آئے ہیں تو ان پہ اعتبار بھی کریں۔'' وہ ناگواری سے کہہ رہی تھی۔ عصرہ نے ہاتھ اٹھا کے نرمی سے اسے روکا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے' تالیہ۔ پلیز آپ لوگ پینٹنگ کو دیکھ لیں۔''

وہ دونوں افراد اپنی جگہ سے اٹھے اور کرسیوں کے درمیان سے گزرتے اسٹیج تک آئے۔ پھر پینٹنگ کو اسٹینڈ سے اتار کے میز پہ رکھا۔ اپنے آلات کا بیگ کھولا۔ عینکیں چڑھائیں۔

عصرہ واپس جگہ پہ بیٹھ گئی اور فاتحانہ نظروں سے اسٹیج کو دیکھنے لگی تب ہی اشعر نے سرگوشی کی۔

''کاکا! مجھے ڈر لگ رہا ہے' آپ کو ٹیسٹ کی اجازت نہیں دینی چاہیے تھی۔''

''مجھے عرب شہزادے کی بات پہ اعتبار ہے۔ وہ مجھے نقلی پینٹنگ کیوں عطیے میں دے گا۔ ڈونٹ وری۔'' عصرہ نے ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں اس کے خدشے کو رد کیا۔ ''ویسے بھی یہ دونوں ایکسپرٹس میرے پرانے جاننے والے ہیں۔ یہ کبھی جھوٹ نہیں بولیں گے۔''

''بے تالیہ! کچھ کریں۔'' ایڈم نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

''میں کیا کر سکتی ہوں۔'' وہ تلخی سے بڑبڑائی۔ ''وان فاتح کو جنگل میں بتایا تھا میں نے کہ گھائل غزال نقلی ہے۔ ان کو وہ مشروب نہیں پینا چاہیے تھا۔ اب نتائج کے ذمہ دار وہ خود ہوں گے۔''

دونوں افراد باری باری پینٹنگ کو جانچ رہے تھے۔ پرکھ رہے تھے۔ مختلف زاویوں سے جائزہ لے رہے تھے۔ پھر معمر صاحب نے سر اٹھایا اور حاضرین کو سنجیدگی سے دیکھا۔

''میری پیشہ وارانہ اور ماہرانہ رائے کے مطابق....'' وہ سانس لینے کو رکے تو سب نے دم سادھ لیا۔

''یہ پینٹنگ اصلی ہے۔''

پھر سوالیہ نگاہوں سے دوسرے ایکسپرٹ کو دیکھا۔ اس نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔

''جی.... پینٹنگ واقعی اصلی ہے۔ سو فیصد۔''

جہاں پورا لان تالیوں سے گونج اٹھا' وہاں اشعر محمود کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس نے بے یقینی سے ماہرین کو دیکھا۔ پھر گردن موڑ کے جعفر صاحب کو جو اپنی جگہ پہ کھڑے ہکا بکا رہ گئے تھے۔ رنگت ایسی پیلی پڑی گویا کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

''جعفر صاحب امید ہے آپ کی تسلی ہو گئی ہو گی۔'' میزبان نے جوش سے اسے مخاطب کیا تو جعفر صاحب جبری مسکرائے اور جگہ پہ بیٹھے۔ ''آپ کے پاس رقم ادا کرنے کے لیے تین دن ہیں۔ اب ہم اگلے آئٹم کی طرف بڑھتے ہیں۔'' نیلامی پھر سے شروع ہو گئی۔

ایسے میں اشعر محمود بالکل گم صم ہو گیا تھا اور عصرہ.... اس نے گردن ذرا نکال کے دو کرسیاں چھوڑ کے بیٹھی تالیہ کو مسکرا کے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

تالیہ نے بھی جواباً مسکرا کے سر کو خم دیا اور سامنے دیکھنے لگی۔ ایڈم ابرو بھینچے ان دونوں کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔

''بے تالیہ.... کیا کیا ہے آپ نے؟''

تالیہ نے مسکرا کے اس کی طرف چہرا موڑا۔

''اے شاہی مورخ! تمہاری گہری نظریں اس وقت کہاں تھیں جب بنداہارا کی حسین بیٹی نیلامی سے پہلے اندر گئی تھی؟''

''بنداہارا کی نقلی والی حسین بیٹی نے کہا تھا کہ وہ مسز عصرہ سے سر درد کی دوا لینے جا رہی ہے۔ لیکن سیانے ٹھیک کہتے تھے۔ چور چوری سے جائے' ہیرا پھیری اور کہانیاں گھڑنے سے نہ جائے۔'' وہ

جل بھن گیا تھا۔

☆☆☆

''ایک گھنٹہ پہلے۔''

فاتح اور عصرہ ایک ساتھ چلتے لاؤنج میں آگے بڑھ رہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی۔

''سر درد کی دوا ملے گی مسز عصرہ؟''

عصرہ چونک کے پلٹی۔ فاتح بھی ساتھ ہی مڑا۔ وہاں تالیہ کھڑی تھی۔ سرخ لپ اسٹک کے ساتھ مسکراتی ہوئی' سنہرے بالوں کا فرانسیسی جوڑا بنائے' وہ جل پری کی طرح کا سیاہ لباس پہنے ہوئے تھی۔

''اوہ تالیہ! تم......'' عصرہ مسکرائی۔ ساتھ ہی ایک محتاط نظر فاتح پہ ڈالی جس کے ماتھے پہ اسے دیکھ کے بل پڑے تھے۔ پھر جلدی سے تشویش سے بولی۔

''ہاں میرے پاس دوا ہوگی۔ تمہارے سر میں درد ہے کیا؟''

''میرے نہیں' آپ دونوں کے سر میں جلد ہی شدید درد ہونے والا ہے اس لیے اسپرین کی گولیاں اپنے ساتھ رکھیں۔''

عصرہ اور فاتح کے تاثرات ایک ساتھ بدلے۔ دونوں نے پہلے ایک دوسرے کو دیکھا' پھر الجھن بھری حیرت سے تالیہ کو۔ ''کیا مطلب؟''

''مجھے کچھ ایسا معلوم ہے جو آپ دونوں کو بھی معلوم ہونا چاہیے کیونکہ....'' سنہرے جوڑے والی خوبصورت لڑکی قریب آئی اور فاتح کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''جو ہمیں معلوم ہوتا ہے' وہ ہماری جان بچاتا ہے۔ اور جو ہمیں معلوم نہیں ہوتا' وہ ہماری جان لے بھی سکتا ہے۔''

مگر وان فاتح کے صاف سلیٹ جیسے ذہن کے لیے وہ فقرہ بے معنی تھا۔ وہ بھنویں اکٹھے کیے سنجیدگی سے بولا۔ ''کیا کہنا چاہ رہی ہو؟''

''کیوں نا ہم اندر بیٹھ کر بات کریں؟'' پھر سرسری سا اطراف میں دیکھا۔ ''ویسے مجھے معلوم نہیں کہ کون سے کمرے میں بیٹھنا چاہیے۔ آپ کی فائل یقیناً میں نے آنکھیں بند کر کے چرائی تھی اس لیے معلوم نہیں کہ کون سا کمرہ کس کا ہے۔ لیکن اس کمرے میں چلتے ہیں۔'' اس نے سامنے والے دروازے کی طرف اشارہ کیا جو عصرہ کے کمرے کا تھا۔ دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''تالیہ' مہمان آرہے ہیں' میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے' اس لیے امید ہے تم نے کسی ضروری بات کے لیے بلایا ہے۔'' کمرے میں آکر عصرہ سنجیدگی سے بولی۔

تالیہ نے دروازہ بند کیا اور ان دونوں کی جانب گھومی۔ پھر سوئچ بورڈ پہ ہاتھ مارا اور بتیاں جلا لیں۔ شاہانہ بیڈروم سفید روشنیوں سے جگمگا اٹھا۔ بیڈ کے کنارے وہ دونوں کھڑے تھے اور ان کے مقابل تالیہ۔

''بات بہت ضروری ہے۔''

''ٹو دی پوائنٹ بات کرو' تاشہ!'' بے زار سے فاتح نے کوٹ کی آستین پیچھے کر کے گھڑی دیکھی۔ تالیہ نے سینے پہ بازو لپیٹے اور قریب آئی۔ باری باری دونوں کی آنکھوں میں دیکھا۔

''جو گھائل غزال آپ بیچنے جارہی ہیں' وہ نقلی ہے۔''

روشن کمرے میں یک دم سناٹا چھا گیا۔ پھر عصرہ کے ماتھے پہ بل ابھرے۔

''کیا مطلب؟ میری پینٹنگ کی ماہرین نے جانچ پڑتال کر کے باقاعدہ تصدیق کی ہے۔'' اس کے گال سرخ ہوئے۔

''صرف ان ماہرین نے جن سے آپ پہلی دفعہ ملی تھیں کیونکہ آپ کے جاننے والے دونوں ماہرین اچانک غائب ہو گئے تھے۔''

فاتح جو آنکھوں کی پتلیاں سکوڑے سامنے کھڑی لڑکی کو خود اعتمادی سے بولتے دیکھ رہا تھا' اس بات پہ چونک کے عصرہ کو دیکھا۔

''تم نے پینٹنگ اپنے قابلِ بھروسہ ماہرین کو نہیں دکھائی تھی؟''

''وہ.....وہ اس وقت ملائیشیاء میں نہیں تھے' مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' عصرہ کا بے بسی اور غصے سے چہرہ دہکنے لگا۔ ''میرے پاس سارا پیپر ورک موجود ہے۔ اور.....''

''جو آدمی آپ سے شہزادہ (شیخ جاسم) بن کے ملا تھا' وہ دراصل اس شہزادے کا مینیجر ہے۔ ایک ملازم۔ گھائل غزال واقعی اس کی تھی' مسز عصرہ' لیکن وہ ڈیڑھ سال پہلے چوری ہوگئی تھی۔ اس نے آپ کو وہ نقلی پینٹنگ دی ہے جو چور وہاں لگا کے چلے گئے تھے۔''

''اور تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہے' تاشہ؟'' وہ مشکوک چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ تالیہ نے نظروں کا رخ اس کی طرف پھیرا اور مسکرائی۔ کئی زمانے پہلے ایک اور نیلامی پر بھی وہ تقریب سے پہلے اس سے ملاقات کرنے اندھیر پنجروں تک گئی تھی۔

وقت کیسے بدل گیا تھا۔ اور وقت کیسے ایک سا تھا۔

''کیونکہ جب پینٹنگز چوری ہوتی ہیں تو وہ بلیک مارکیٹ میں بیچی جاتی ہیں جہاں سے خریدنے والے کو ٹیکس نہیں دینا پڑتا اور آپ کی گھائل غزال اس لیے نقلی ہے کیونکہ اصلی گھائل غزال میرے پاس ہے۔''

اس نے کہنی پہ لٹکے پرس کو کھولا اور اندر ہاتھ ڈال کے کتاب جتنی پینٹنگ نکال کے سامنے کی۔ عصرہ کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔

''مگر تم نے میری ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھ کر کہا تھا کہ میری پینٹنگ اصلی ہے۔'' وہ دھک سے رہ گئی۔

''کیونکہ مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ میرا اعتبار کریں گی۔''

''تم بعد میں بھی بتا سکتی تھیں۔'' فاتح درشتی سے بولا۔ اس کی مشکوک نظریں ہنوز تالیہ پہ جمی تھیں۔

''میں بتانے والی تھی مگر پھر آپ دونوں نے میرے اوپر فائل چوری کا الزام ڈال دیا۔ اگر میں اتنی بدنیت ہوتی فاتح صاحب تو آپ کو خاموشی سے یہ بیچنے دیتی۔ یہ نقلی پینٹنگ کسی نے غلطی سے آپ کو نہیں دی۔ اس کے پیچھے پوری پلاننگ ہے۔ اور جس نے یہ کیا ہے' اس نے اپنا خریدار باہر بٹھا رکھا ہوگا جو اونچی بولی لگا کے سب کے سامنے پینٹنگ کو ٹیسٹ کروائے گا اور نقلی نکلنے کی صورت میں آپ کی بدنامی الگ ہوگی۔ مسز عصرہ پہ پولیس رپورٹ درج ہوگی' یہ جیل جائیں گی اور آپ کی ہر بیچی گئی پینٹنگ کا آڈٹ شروع ہو جائے گا۔''

''نہیں۔'' عصرہ نے مضطرب چہرے کے ساتھ گردن اکڑائی۔ ''میری پینٹنگ اصلی ہے۔ تمہاری نقلی ہوگی۔''

''ہاں تاشہ' ہم کیسے مان لیں کہ تمہاری پینٹنگ نقلی نہیں ہے۔''

''میں نے آپ کے ایک پرانے ماہر طٰہٰ زہری صاحب کو بھی تقریب میں بلایا ہے۔ وہ اس وقت کے ایل میں نہیں تھے جب آپ نے اس پینٹنگ کو ٹیسٹ کروایا تھا۔ مگر فی الحال وہ یہیں موجود ہیں۔ آپ ان کو کال کریں۔ دونوں پینٹنگز دیکھ کے خود بتادیں گے کہ کون سی اصلی ہے۔'' وہ پر اعتماد تھی۔ داتن نے اس کا دیا کام بروقت کر دیا تھا۔

عصرہ نے اسے گھورتے ہوئے کلچ کھولا' موبائل نکالا اور سنگین لہجے میں بولی۔ ''تم یہیں رہو' میں ابھی آرہی ہوں۔'' وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ دروازہ ادھ کھلا رہ گیا۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

قرۃ العین خرم ہاشمی



فریال نے قیمے میں پھلیاں ڈال کر تھوڑا پانی ڈالا اور پھر اسے ہلکی آنچ پر دم پر رکھ دیا۔ چھوٹے سے باورچی خانے کی کھڑکی سے ایک نظر باہر ڈالی۔ دھوپ کب کی ڈھل چکی تھی۔ اس کی عادت تھی کہ عصر کی نماز پڑھنے کے بعد شام کے کھانے کی تیاری کرنا شروع کر دیتی تھی۔

ابھی راحیل کے آنے میں کچھ دیر باقی تھی۔ فریال نے جلدی جلدی ہاتھ چلاتے ہوئے رائتہ اور سلاد بنایا اور فریج میں رکھ دیا۔ گرمی کی شدت میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا تھا۔ اس لیے فریال خراب ہونے کے ڈر کی وجہ سے کوئی بھی چیز فریج سے باہر نہیں رکھتی تھی۔

"آٹا بھی گوندھا ہوا ہے! بس راحیل آئیں گے تو گرما گرم روٹی بنا لوں گی۔ شکر ہے آج کے کام تو ختم ہوئے۔"

فریال نے سب کچھ سمیٹ کر سکون کی سانس لی اور چائے دم پر رکھ کر نہانے چلی گئی۔ نہا کر نکلی تو چائے تیار تھی۔ فریال نے چائے کپ میں ڈالی اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی چھت پر آ کر اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گئی۔ وہ اتوار کے علاوہ ہر روز شام کی چائے اکیلے یہاں ہی بیٹھ کر پیتی تھی۔ اتوار والے دن راحیل گھر پر ہوتا تھا تو وہ چائے پر خاص اہتمام کرتی یا راحیل سے فرمائش کر کے جلیبیاں یا سموسے منگوا لیتی۔ اس کی شادی کو چھ ماہ ہی گزرے تھے۔ چھوٹے سے پرسکون گھر میں وہ اکیلی راج کر رہی تھی۔ اس کی سسرال دوسرے شہر میں آباد تھی مگر راحیل کی نوکری کی وجہ سے اسے بھی یہاں آنا پڑا تھا۔ راحیل کی جاب اچھی تھی۔ بڑھتی مہنگائی اور شادی کے بعد گھر کے اضافی خرچوں کے باوجود اس کا گزارہ بہت اچھے طریقے سے ہو رہا تھا۔ فریال نے چائے کا خالی کپ چھوٹی سی بوسیدہ میز پر رکھا اور اٹھ کر منڈیر سے نیچے جھانکنے لگی۔ روز کی طرح اس کی نظر پچھلے والے گھر کے صحن میں جا رکی۔ فریال نے جتنی معلومات اپنی تانک جھانک سے اکٹھی کی تھیں۔ اس کے مطابق اس بڑے سے گھر میں کئی خاندان آباد تھے۔ ہر عمر کے بچوں کی ایک طویل قطار تھی۔ گھر کی کچھ خواتین سے فریال کی دور سے سلام دعا بھی ہوئی تھی۔ گھر کی خواتین کے ہار سنگھار سے ان کی خوش حالی اور پیسے کی ریل پیل کا اندازہ ہوتا تھا۔ کئی بار انھوں نے فریال کو اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دی مگر فریال نے طریقے سے ٹال دیا۔ وہ ان کے سامنے اکثر احساس کمتری کا شکار ہو جاتی۔

"وہ لوگ تو اتنے بڑے عالی شان گھر میں رہتے ہیں، میرا یہ چھوٹا سا تین مرلے کا کرائے کا گھر کیا اچھا لگے گا کہ میں انھیں اپنے گھر بلاؤں اور مذاق اڑانے کا موقع فراہم کروں؟" فریال نے خود سے سوچا اور خود ہی سب کچھ سچ مان کر ان سے دور سے ہی رابطہ رکھنے لگی۔

ابھی بھی فریال دیکھ رہی تھی کہ کام کرنے والی عورتیں پھلوں کے کئی ٹوکرے اٹھا کر اندر باہر جا رہی تھیں۔

"شاید ان کے گھر کوئی دعوت ہے!" فریال نے اندازہ لگایا۔ اسی وقت ایک درمیانی عمر کی عورت نے اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔

"آج ہمارے گھر دعوت ہے! آپ کا مکان نمبر کیا ہے؟ رضیہ کے ہاتھ کچھ بھجوانا ہے۔" اس عورت نے پاس کھڑی ایک لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ فریال کو نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا مکان نمبر بتانا پڑا اور مسکرا کر شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دے دی۔

"پہلے آپ آئیں ہمارے گھر کسی دن، پھر میں بھی چکر لگاؤں گی۔" اس عورت نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور ہاتھ ہلاتی ہوئی اندر چلی گئی۔ فریال کپ اٹھا کر نیچے اترنے لگی۔ جب اس کے دروازے پر دستک ہوئی۔ جب تک وہ نیچے پہنچی بیل بھی کئی بار بج چکی تھی۔

"کون ہے اتنا بے صبرا؟" فریال بڑبڑاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے بڑا سا تھال تھامے رضیہ کھڑی تھی۔ جس کی صورت سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔

"باجی! اتنی دیر کر دی دروازہ کھولنے میں۔ بیگم صاحبہ نے کہا بھی تھا کہ میں آ رہی ہوں، اب ایسے کھڑی کیا دیکھ رہی ہیں؟ جلدی سے یہ تھال خالی کر کے دیں۔ مجھے ابھی اور بھی گھروں میں جانا ہے۔" رضیہ کی تیز تیز چلتی زبان کے آگے فریال بے بس سے کھڑی بس سر ہلا کر رہ گئی۔ فریال نے تھال تھاما اور باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ تب تک رضیہ گھر کے اندر آ کر تفصیلی جائزہ لے چکی تھی۔

"ارے باجی آپ کا گھر تو بہت چھوٹا سا ہے۔ یہ کریم اصلی ہے یا نقلی؟ میری باجی تو مجھے باہر کی کریم لا کر دیتی ہیں۔ عام کریمیں تو میری اسکن کو سوٹ ہی نہیں کرتیں، ویسے یہ سوٹ کہاں سے لیا ہے آپ نے؟ ایسا ہی پرنٹ میری باجی کے پاس بھی ہے۔ یہ بیڈروم سیٹ آپ کے جہیز کا ہے کیا؟"

رضیہ کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں آ کر رکی۔ فریال نے جلدی سے تھال خالی کر کے اس کے ہاتھ میں تھمایا اور پھر ایک نظر سامنے کھلے دروازے سے نظر آتے سادہ سے فرنیچر پر ڈالی۔

"نہیں، کیوں؟" فریال نے حیرت سے پوچھا۔

"ویسے ہی، اندازہ لگا رہی تھی کہ آپ کا میکہ کتنا امیر ہے۔ بھئی میری باجی نے تو اپنی بیٹی کی شادی پر اتنا عالی شان فرنیچر دیا ہے کہ لوگ دیکھتے ہی رہ گئے۔ آپ کے پاس زیور وغیرہ نہیں ہے؟ بالکل ہی خالی ہاتھ اور کان ہیں۔ میری باجی تو......"

"دروازہ اس طرف ہے!" فریال نے سنجیدگی سے کہا تو رضیہ کا منہ بن گیا اور وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد فریال نے گہری سانس لے کر دروازہ بند کیا اور باورچی خانے میں آ کر مختلف اشیاء کو جائزہ لینے لگی۔



”بریانی، زردہ، مٹھائی، قورمہ، کئی طرح کے پھل۔ اف کتنا کچھ بھیج دیا ہے انھوں نے۔ اب میں کیا بھیجوں گی، ہماری تو اتنی حیثیت ہی نہیں۔“

فریال نے افسردگی سے سوچا اور ایک گلاب جامن اٹھا کر منہ میں رکھ لی اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆

”کھانا بہت مزے کا ہے، الحمدللہ۔“

راحیل نے ہمیشہ کی طرح کھانا ختم کر کے اس کی تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے رب کا بھی شکر ادا کیا۔ فریال بریانی سے لطف اندوز ہو رہی تھی ایک نظر اپنے بنائے ہوئے سالن پر ڈالی۔

”کیا خاک مزے کا ہے؟ آپ نے یہ سب تو لیا نہیں۔ سچ میں بریانی تو کمال کی بنی ہوئی ہے اور قورمہ تو......“ فریال نے بریانی سے بھرا چمچ لیتے ہوئے کہا تو راحیل مسکرا دیا۔

”مجھے اپنے گھر کی روٹی پسند ہے فریال! چاہے جیسی بھی بنی ہو۔ ایک مدت اس طرح کے بازاری کھانے کھائے ہیں۔ اب دل نہیں چاہتا۔“

راحیل نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

فریال سر ہلا کر اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ جب تک باورچی خانہ سمیٹ کر چائے کے گرما گرم دو کپ بنا کر کمرے میں آئی۔ راحیل ٹی وی پر چلنے والے ٹاک شو کا اختتامی حصہ دیکھ رہا تھا۔ فریال نے کپ اس کے سامنے میز پر رکھا اور خود بیڈ پر بیٹھ کر میگزین کھول لیا۔ کچھ دیر تک میگزین کی ورق گردانی کرنے کے بعد وہ راحیل کی طرف متوجہ ہوئی۔

”آپ کا یہ سیاست نامہ کتنا رہ گیا ہے؟ بندہ گھر آ کر بیوی سے بات کرتا ہے، اسے وقت دیتا ہے مگر شوہر نامدار کو سیاسی خبروں سے آگے کچھ نظر آئے تو، سخت برے لگتے ہیں مجھے یہ سیاسی لوگ، جھوٹے اور منافق۔“ فریال نے ناک چڑھا کر کہا تو راحیل نے ٹی وی کی آواز کم کرتے ہوئے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

”جی فرمائیں زوجہ محترمہ! آج کیا شکوہ کرنا ہے؟“ راحیل نے اس کی ناشکری کی عادت پر چوٹ کی۔ فریال نے ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

”شکوہ سمجھیں یا کچھ اور مگر ایک بات تو بتائیں ہم اس چھوٹے سے گھر میں کیوں رہتے ہیں؟ کیا ہم تھوڑا بڑا گھر افورڈ نہیں کر سکتے؟“

راحیل اس کے بچکانہ انداز پر ہنس پڑا۔

”چاہے ہم اس چھوٹے سے گھر میں رہیں یا اتنے بڑے والے گھر میں۔ رہنا تو ہم دونوں نے ہی ہے ناں! اچھا ہے نا اس چھوٹے سے گھر میں تمہارے گم ہونے کا ڈر تو نہیں رہتا مجھے، ایویں اتنے بڑے سے گھر میں تم اگر گم ہو گئیں تو میرا کیا ہو گا؟“

راحیل نے شرارت سے کہا تو فریال ہنس پڑی۔ پھر کچھ دیر کے بعد کچھ سوچ کر بولی۔

”آپ تو ہر بات کو مذاق میں اڑا دیتے ہیں۔ وہ بھی تو لوگ ہیں جو اتنے بڑے بڑے گھروں میں رہتے ہیں، کیا شان سے رہتے ہیں۔ ٹھاٹ سے زندگی گزارتے ہیں۔ ہر طرح کی نعمتیں ان کے گھر میں سجی ہوتی ہیں۔“ فریال نے خواب ناک لہجے میں کہا۔ راحیل نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔

”کس کی بات کر رہی ہو؟“ راحیل کے پوچھنے پر فریال چونکی اور پھر پرجوش ہو کر بتانے لگی۔

”وہ جو ہماری گلی سے اگلی گلی ہے ناں۔ وہ سفید گیٹ والا بڑا سا گھر۔ جس کے باہر سنہری رنگ میں ”ملک ہاؤس“ کی نیم پلیٹ لگی ہوئی ہے۔

ان کے صحن کا پچھلا حصہ ہماری چھت سے صاف نظر آتا ہے، اف کتنا بڑا تو ان کا صحن ہے اور وہاں ہر وقت آنے جانے والوں کا میلہ لگا رہتا ہے۔ ان کے گھر کی کچھ خواتین سے میری بہت اچھی سلام دعا ہے۔ آج یہ سب کچھ ان کے گھر سے ہی آیا تھا۔ ویسے ایک بات اور بھی ہے کہ ان کی نوکرانی کا منہ بہت کھلا ہوا ہے۔ ایسے ہر بات اور چیز پر تنقید کر رہی تھی جیسے خود کہیں کی ملکہ ہو!“

فریال کی گفتگو کا آغاز ملک ہاؤس کی تعریف سے ہوا مگر اختتام رضیہ کی شخصیت پر تبصرے سے ہوا۔ راحیل گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”سادہ سی بات ہے فریال! ہر انسان اپنے رتبے اور سوچ کے مطابق کی بات کرے گا ناں۔ اب کام والی ہے تو ایسی ہی بات کرے گی۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ تمہیں ادب و تمیز پر لیکچر دیتی، حد ہے بھئی!“ راحیل کے کہنے پر فریال منہ بنا کر رہ گئی۔

”خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں، کام والیاں بھی بہت اچھی اور تمیز دار قسم کی ہوتی ہے۔ یہ ہی تھوڑی اوچھی ٹائپ کی لگی مجھے، خیر ہمیں کیا۔“ فریال نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔

”یہ چیز ہی تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ چاہے کام والی ہو یا اس کے مالک یا کوئی اور ہمیں کسی سے کیا لینا دینا۔ اب دیکھو ناں تم نے اپنے لیے مانگا وقت غیروں کی باتیں کر کے ضائع کر دیا۔ اب مجھے سکون سے خبریں سننے دو، باقی باتیں کل کے لیے رکھ دو۔“

راحیل نے مسکراتے ہوئے کہا اور ٹی وی کی آواز اونچی کر دی۔ فریال نے سر جھٹک کر اپنا موبائل ہاتھ میں تھام لیا۔

☆☆☆

”کون ہے؟“ فریال نے دروازے پر ہوئی دستک کے جواب میں پوچھا۔

”اماں خیرو آئی ہے!“ اماں خیرو کی پاٹ دار آواز سنائی دی تو فریال کا منہ بن گیا۔

”کہہ تو ایسے رہی ہیں جیسے ملکہ عالیہ تشریف لائی ہیں۔“

فریال نے بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ اماں خیرو اپنے علاقے کے مخصوص روایتی لباس میں ملبوس، سر پر بڑی سی گٹھری اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ اس نے کئی دنوں کا میلا اور بوسیدہ سا پاؤں تک آتا مختلف رنگوں کا فراک پہنا ہوا تھا۔ شلوار کے پائنچے بھی بڑے اور مختلف رنگوں کی کڑھائی سے سجے ہوئے تھے۔ سانولے اور مضبوط ہاتھوں میں موٹے موٹے چاندی کے کڑے پہنے ہوئے تھے۔ اماں خیرو نے چھوٹے سے صحن میں اپنی گٹھری رکھی اور دوپٹے سے چہرے پر آیا پسینہ صاف کرنے لگی۔ فریال اندر کی طرف بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئی تو شربت کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا جو اس نے اماں خیرو کی طرف بڑھایا۔

”اللہ سدا سہاگن رکھے، خوشیوں کا ہر رنگ دکھائے تجھے۔“ اماں خیرو نے شربت کا گلاس ایک سانس میں خالی کر کے اسے دعا دی۔

شربت کا یہ جگ صبح راحیل کے لیے بنایا تھا۔ ایک گلاس بچ گیا تو اس نے فریج میں رکھ دیا۔ اب اماں خیرو کو دیکھ کر اسے بچے ہوئے شربت کا خیال آیا تو فوراً ڈال کر لے آئی مگر اماں خیرو نے اتنی دعائیں دیں کہ فریال شرمندہ ہی ہو گئی۔

”راحیل کیسا ہے؟ اسے کہنا اماں خیرو بہت یاد کر رہی تھی۔ کسی دن اتوار کو چکر لگاؤں گی، بڑا اچھا اور نیک بچہ ہے۔ پچھلے پانچ سال سے میں اسے جانتی ہوں۔ جب وہ نیا نیا اس شہر میں نوکری کے لیے آیا تھا۔ ایک دن میں کپڑے بیچنے آئی تو اچانک ہی تیز بارش شروع ہو گئی تب راحیل نے مجھے کہا کہ اماں جب تک بارش رک نہیں جاتی میرے صحن میں بیٹھ جائیں۔ میں تقریباً دو گھنٹے یہاں بیٹھی رہی۔ راحیل نے بہت ہمدردی سے پوچھا کہ آپ اتنے خراب موسم میں کیوں گھر سے باہر نکلیں۔ میں نے بتایا کہ وقت اور حالات کی سختی دھکے کھانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ میرا جوان بیٹا گردوں کی تکلیف میں مبتلا بستر پر پڑا ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے چار بچے ہیں۔ میری بہو گھر سنبھالتی ہے اور میں گلی گلی گھوم کر کپڑے بیچتی ہوں۔ بس جب راحیل کو میرے حالات کا پتا چلا۔ اس نے اپنے دوستوں سے کہہ کر میرے بیٹے کے علاج کے لیے پیسے جمع کر دیے۔ جس کی وجہ سے

ہم اسے بڑے ہسپتال لے کر جا سکے میرا بیٹا اس بیماری سے لڑتے لڑتے دو سال پہلے مر گیا مگر جس طرح آج تک راحیل میری مدد کرتا ہے۔ میں اس کا احسان کبھی نہیں بھول سکتی ہوں۔"

اماں خیرو نے دوپٹے کے پلّو سے آنکھیں پونچھیں۔ فریال پہلے بھی کئی بار یہ سب کچھ اماں خیرو کی زبانی سن چکی تھی مگر اماں خیرو جب بھی آتی، اپنی گفتگو کا آغاز یہیں سے ہی کرتی۔

"اچھا اماں۔ یہ سب چھوڑیں، کپڑوں کے اچھے اچھے ڈیزائن تو دکھائیں۔" فریال کے کہنے پر اماں خیرو نے جلدی سے سر ہلایا اور گٹھری کھول کر اسے کپڑے دکھانے لگی۔

"اماں خیرو، یہ سب تو پرانے ڈیزائن ہیں۔ کچھ نیا تو لے کر آتیں۔" فریال نے منہ بنا کر کہا تو اماں خیرو کا چہرہ یکدم بجھ سا گیا۔

"ہاں۔ نیا مال آیا تو تھا مگر وہ پہلے ہی بک گیا۔ اچھا میں اگلی بار سب سے پہلے تیرے پاس ہی آؤں گی۔" اماں خیرو نے کہا تو فریال نے سر ہلا دیا۔ کچھ دیر اماں خیرو بیٹھی رہی پھر خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

فریال روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ شام کو راحیل آیا تو فریال نے روز کی طرح اسے دن بھر کی روداد سنائی۔ اماں خیرو کا نام سن کر راحیل چونکا۔

"تم نے اماں خیرو کو پیسے دے دیے تھے؟" راحیل نے پوچھا تو فریال ایک دم چپ کر گئی۔

"مجھے دینا یاد ہی نہیں رہا!" فریال نے آہستگی سے کہا تو راحیل گہری سانس لے کر رہ گیا۔ راحیل ہر مہینے اپنی تنخواہ میں سے حسب توفیق اماں خیرو کی مدد کرتا تھا۔

"ہوں! بے چاری بہت ضرورت مند ہیں۔ پتا نہیں کتنی آس لے کر آئی ہو گی، اگلی بار جب بھی آئے تو انھیں یاد سے رقم دے دینا اور ہاں! اس سے ایک دو سوٹ لے لیا کرو، وہ کون سے اتنے مہنگے ہوتے ہیں کہ میں افورڈ نہیں کر سکتا۔ چلو اسی بہانے اس کی مدد ہو جائے گی۔"

راحیل نے نرمی سے کہا تو فریال کا منہ بن گیا۔

"پسند کے بغیر تو میں کوئی چیز نہیں لے سکتی۔ اتنے فضول رنگ اور ڈیزائن تھے ان کے پاس۔ اچھا مال تو پہلے ہی بیچ آئی تھیں۔ بھئی لوگ بھی بہت سمجھ دار ہیں۔ آپ ان کی ہمدردی میں ایسے ہی گھلے جا رہے ہیں۔" فریال نے طنزیہ لہجے میں کہا تو راحیل گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"دیکھو فریال! میں لمبی چوڑی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا ہوں۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ جب سے میں اماں خیرو کی مدد کر رہا ہوں۔ اللہ نے میرے تھوڑے میں بھی برکت ڈال دی ہے۔ پہلے اکثر مہینے کے آخر میں میرے پاس کچھ نہیں بچتا تھا مگر اب کیسے وقت گزرتا ہے، پتا ہی نہیں چلتا۔ حالانکہ پہلے میں غیر شادی شدہ تھا مگر اب تو تمہاری بھی ذمہ داری ہے مگر الحمدللہ بہت کرم ہے اس ذات کا۔" راحیل نے شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔

"یہ سب تو میری وجہ سے ہے جناب! میں ہی خوش قسمت ثابت ہوئی ہوں آپ کے لیے۔ اماں خیرو کا کیا لینا دینا اس سب میں۔" فریال نے ضدی لہجے میں کہا تو راحیل مسکرا دیا۔

"چلو ایسا ہی سمجھ لو مگر پلیز اگلی بار اس کام میں کوتاہی مت کرنا۔ میری خوشی کے لیے۔ اوکے؟" راحیل نے مان سے کہا تو نہ چاہتے ہوئے بھی فریال نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

☆☆☆

دو مہینے گزر گئے مگر اماں خیرو کی آمد نہیں ہوئی۔ راحیل نے کئی بار فریال سے پوچھا مگر ہر بار اس کا جواب نفی میں ہوتا۔ ایک دن فریال کو "ملک ہاؤس" کی طرف سے میلاد میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ فریال نے وہاں جانے کی خاص تیاری کی۔ اپنی طرف سے ہر بہترین چیز کا انتخاب کیا اور بہت مطمئن ہو کر ان کے گھر گئی۔ گھر جتنا باہر سے خوب صورت اور عالی شان تھا، اندر سے بھی کمال تھا۔ اعلا سجاوٹ اور بہترین انتظامات۔ گھر کی سب خواتین مہنگے کپڑے پہنے اور زیورات سے لدی ہوئی آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ نوکروں کی ایک فوج تھی جنہوں نے سب کام سنبھالا ہوا تھا۔ شاندار انتظامات تھے۔ فریال تو حیرت سے دیکھتی ہی رہ گئی۔

"کتنی خوش نصیب ہیں یہ، ہر چیز کی بہتات ہے ان کے گھر۔" فریال نے رشک بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ بہترین اور خوش ذائقہ کھانے کے بعد جب فریال نے جانے کی اجازت مانگی تو انھوں نے اسے خالی ہاتھ نہیں جانے دیا اور مٹھائی کے پیک ڈبے اور پھل بھی ساتھ دیے۔ فریال وہاں سے واپس آ کر ان کے شان و شوکت اور امارت کے گن گاتی رہی۔ راحیل سن کر مسکرا دیتا۔

کچھ دنوں کے بعد اچانک اماں خیرو چلی آئی مگر وہ بہت بیمار اور کمزور لگ رہی تھی۔ فریال نے اس کی غیر حاضری کی وجہ دریافت کی تو وہ اداسی سے کہنے لگی۔

"بس کیا بتاؤں۔ بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ کمزوری اور بیماری بھی ہے۔ مگر پھر بھی اللہ کا شکر ہے۔ جس نے راحیل جیسے لوگوں کو ہمارا وسیلہ بنایا ہوا ہے۔" راحیل نے اماں خیرو کی غیر حاضری کے باوجود پچھلے تین مہینوں کے پیسے ان کے لیے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ فریال تو اکثر چڑ جاتی۔

"کہ یہ پیسے کسی اور مستحق کو بھی دیے جا سکتے ہیں۔"

"بالکل دیے جا سکتے ہیں اور میں دیتا بھی رہتا ہوں۔ یہ باتیں بتانے کی تو نہیں ہوتیں ناں، مگر اماں خیرو کو ایک عرصے سے ہمارے گھر سے ایک آس اور امید بندھی ہوئی ہے۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ وہ یہاں امید لے کر آئے اور خالی ہاتھ واپس جائے۔" راحیل کے کہنے پر فریال چپ کر گئی اور آج جب اماں خیرو کے آتے ہی فریال نے اس کے لیے رکھے پیسے فوراً نکال کر دیے تو وہ احساس تشکر سے رو پڑی۔

"پچھلے کچھ دنوں سے پہلے اپنی اور پھر بڑے پوتے کی بیماری کی وجہ سے سخت پریشان تھی۔ گھر میں کھانے پینے کو بھی کچھ نہیں رہا۔ آج بہت ہمت کر کے کام پر نکلی تو سب سے پہلا خیال یہاں کا ہی آیا۔ بس اللہ نے ہی سب وسیلے بنائے ہوئے ہیں۔ اللہ بہت برکت دے اور تھوڑے کو بھی زیادہ بنا دے۔ آمین"۔ اماں خیرو دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔

☆☆☆

راحیل کی ترقی ہوئی اور اس کی ٹرانسفر دوسرے شہر ہو گئی۔ فریال بہت خوش تھی۔ وہ جانے کی تیاریاں کر رہی تھی جب ایک دن اماں خیرو ملنے آ گئی اور جب اسے پتا چلا کہ وہ لوگ یہاں سے جا رہے ہیں تو وہ اداس ہو گئی۔ فریال کا موڈ آج اچھا تھا۔ اس لیے وہ اپنے ساتھ اماں خیرو کے لیے بھی چائے بنا کر لے آئی اور اس سے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی باتوں ہی باتوں میں ملک ہاؤس کا ذکر آیا' فریال حسب معمول ان کی امارت اور شان کے گن گانے لگی۔ اماں خیرو سن کر ہنس پڑیں۔

"اس میں ہنسنے والی کیا بات ہے اماں! آپ نے شاید ان کا گھر دیکھا نہیں ہے!" فریال کو اس کا ہنسنا برا لگا تھا۔

"میں تو ان کے گھر تب سے جا رہی ہوں جب اس گھر میں نئی بہویں بھی نہیں آئی تھیں۔ بڑی بیگم صاحبہ اچھے دل کی مالک ہیں مگر۔" اماں خیرو کچھ کہتے کہتے چپ کر گئی۔

"مگر کیا؟" فریال نے پرتجسس انداز میں پوچھا۔

"مگر بہت دکھی عورت ہیں وہ جی! ماشاءاللہ سے پانچ بیٹے ہیں مگر ان میں سے ایک بھی فرماں بردار نہیں ہے۔ کون سی ایسی بری لت ہے جو ان کے بیٹوں کو نہیں لگی ہوئی۔ بھلے پہننے کو اعلا سے اعلا کپڑا ہے، مہنگے زیورات ہیں، اچھا کھانا پینا ہے مگر جسے گھر کا سکھ اور چین کہتے ہیں، وہ ان کے گھر میں نہیں

ہے۔ یہ مال و دولت ہی ان لوگوں کے درمیان لڑائی جھگڑے کی وجہ بنی ہوئی ہے۔ نہ بیٹوں کی آپس میں بنتی ہے اور نہ بہوئیں ایک دوسرے سے بولتی ہیں اور نہ اپنے بچوں کو ایک دوسرے کے بچوں سے کھیلنے دیتی ہیں۔ بس نہ پوچھیں وہاں کا حال......! بظاہر تو سب کچھ ہے مگر کثرت میں برکت ہو یہ ضروری نہیں ہوتا۔ آپ خوش نصیب ہیں کہ اللہ نے آپ کے گھر میں برکت اور سکون دیا ہے۔ یہ سب سے بڑی دولت اور نعمت ہے!'' اماں خیرو نے سڑ سڑ کر کے چائے کا کپ خالی کیا اور فریال کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی اور اپنی گٹھری سر پر رکھ کر وہاں سے چلی گئی۔ فریال اماں خیرو کے جانے کے بعد کچھ دیر تک ان کی بتائی باتوں پر سوچتی رہی اور پھر سر جھٹک کر اپنی ادھوری پیکنگ کرنے لگی۔

''ماشاء اللہ! آپ کا گھر تو بہت خوب صورتی سے سیٹ ہے۔''

نئی نئی شفٹ ہوئی پڑوسن نے چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے متاثر کن لہجے میں فریال کی ساس سے کہا تو چائے کی ٹرے میز پر رکھتی فریال دھیرے سے مسکرا دی۔ اسے اپنے سسرال کے ایک کنال کے بڑے سے گھر میں شفٹ ہوئے تین سال گزر گئے تھے۔ راحیل جس کمپنی میں کام کرتا تھا، وہ دیوالیہ ہونے کے بعد بند ہوگئی تو مجبوراً راحیل اور فریال کو واپس اپنے گھر آنا پڑا۔ فریال جو شادی کے فوراً بعد ہی سسرال کی جادوگری سے دور رہی تھی۔ جب ان کے درمیان آکر رہنا پڑا تو کچھ مہینوں میں ہی وہ بوکھلا کر رہ گئی۔ سسرال میں جہاں افراد کی کثرت تھی تو وہاں مسئلے اور مسائل بھی بکثرت پائے جاتے تھے۔ خاص کر سسرالی رشتوں اور گھریلو سیاست نے فریال کے ذہن اور دل کو مرجھا کر رکھ دیا تھا جیسے ایک سرسبز پودے کو کوئی تیز دھوپ میں رکھ دے اور وہ دھوپ سے لڑتے لڑتے ـــ اپنی تازگی اور خوب صورتی کھونے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح فریال بھی سسرالی جھمیلوں میں پھنس کر آزادی اور سکون کی تازہ ہوا کے لیے ترس گئی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ راحیل کو نئی جاب بھی ملی اور اس نے ترقی کا زینہ بھی چڑھا۔ تنخواہ بھی پہلے سے زیادہ تھی۔ آنگن میں تین ننھے پھول بھی کھل چکے تھے۔

زندگی میں سب کچھ تو تھا مگر اب اکثر مصروفیات کے پیچھے گم ہوتی فریال کو شادی کے وہ پہلے چھ ماہ بہت یاد آتے تھے۔ اکثر اس کی یاد کے پردے پر وہ چھوٹا سا آنگن، آزادی اور بے فکری سے گزرے وہ دن رات ابھرتے اور ڈوب جاتے۔ وہ اداسی سے مسکرا دیتی۔ فارغ وقت میں راحیل سے اکثر وہ وہاں بیتی ایک ایک بات کا ذکر کرتی۔ راحیل سنتا اور مسکرا دیتا۔ کبھی کبھی راحیل حیرت سے سوال کرتا۔

''تم اس چھوٹے سے گھر میں گزرے دن رات کا ذکر تو تفصیل سے کرتی ہو مگر حیرت کی بات ہے کہ تم نے کبھی ''ملک ہاؤس'' کا ذکر نہیں کیا۔ جب کہ ان دنوں ان کے بارے میں بات کرنا تمہارا پسندیدہ موضوع ہوتا تھا۔ کیا تم سچ میں اسے بھول گئی ہو یا؟'' فریال ہمیشہ اس کا سوال سن کر ٹال دیتی مگر ایک دن کسی رو میں کہہ ہی گئی۔

''ہاں مجھے کبھی بھی ملک ہاؤس یاد نہیں آیا کیونکہ......'' فریال نے اداسی سے گہری سانس لی۔

''مجھے اماں خیرو اور اس کی باتیں بہت یاد آتی ہیں اور ایک بار اس نے کہا تھا کہ کثرت میں برکت ہو، یہ ضروری نہیں ہوتا۔''

راحیل اس کی بات پر چونکا۔ پھر سر جھٹک کر سامنے کھلی فائل کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اسے کل ہر حال میں یہ فائل مکمل کر کے دینی تھی۔ فریال بے دلی سے دو سالہ مدثر کو تھپکنے لگی اور اس کے ساتھ لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔ اس کی بند آنکھوں میں قید آنسوؤں میں ماضی کا رنگ بھی تھا اور حال کا دکھ بھی۔

اب اس کے پاس ہر چیز کی کثرت تو تھی مگر وہ جسے برکت اور سکون کہتے ہیں وہ کہیں پیچھے رہ گیا تھا۔ شاید اسی چھوٹے سے آنگن کے کسی کونے میں، یا اماں خیرو کی پرانی گٹھڑی کی کسی تہہ میں۔ ☆

پہن کے رنگ ہزاروں، دکھائے رنگ اپنا
لگے وہ اور بھی سادہ، سنگھار کرنے سے

صدائیں ٹوٹ رہی ہیں فضا سے ٹکرا کر
سکوت اور بھی پھیلے، پکار کرنے سے

شب فراق کو آب حیات پلوا دو
طلب کی عمر بڑھے، انتظار کرنے سے

مرے دکھوں نے مجھے قہقہوں میں دفنایا
مرا ہوں زندہ دلی اختیار کرنے سے

جو حلق تر کرے وہ ایک بوند ہے کافی
بجھے نہ پیاس، سمندر کو پار کرنے سے

مظفر اپنی اڑانیں بھی ساتھ چھوڑ نہ دیں
ہوا کے بازوؤں پر انحصار کرنے سے

مظفر وارثی

احساس

میں اپنوں کے جھرمٹ میں
اکثر سوچتا رہتا ہوں
کہ کون ہے میرا
ہر اک شخص کا دعویٰ ہے یہ
اس کو مجھ سے
پیار بہت ہے
ہر اک شخص کے لب پر
میٹھی باتیں ہیں
پر من میں جھانک کے دیکھو تو
من مندر میں نفرت کی بو باس بھری ہے
یہ احساس بہت ہے مجھ کو
میں اپنوں کے جھرمٹ میں
اکثر سوچتا رہتا ہوں

عابد معروف

شگفتہ جاہ



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوذر جندب بن جنادہ اور حضرت ابو عبدالرحمٰن معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تو جہاں کہیں بھی ہو، اللہ سے ڈر اور برائی کے پیچھے نیکی کر، نیکی برائی کو مٹا دے گی اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آ۔"

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن ہے)

فوائد و مسائل :۔

1۔ "نیکی برائی کو مٹا دے گی۔" کا مطلب ہے کہ نیکی، برائی کا کفارہ بن جاتی ہے یعنی انسان کو چاہیے کہ گناہ سرزد ہو جانے کے بعد فوراً ہی کوئی نیکی کرے تاکہ گناہ کے جسمانی اور روحانی مضر اثرات زائل ہو جائیں کیونکہ مومن بندے کو گناہ بے کل کیے رکھتے ہیں تاوقتیکہ توبہ کر لے یا کوئی نیکی کر لے۔ مومن کے شایان شان یہی ہے کہ گناہ کے فوراً بعد توبہ کر لے، اس طرح اس کا گناہ لکھا بھی نہیں جائے گا۔

2۔ جلوت و خلوت میں اللہ کا تقویٰ ضروری ہے اور یہی حقیقی تقویٰ ہے کہ انسان تنہا ہو یا لوگوں میں، کوئی اسے دیکھ رہا ہو یا نہ دیکھ رہا ہو، ہر حال میں وہ اللہ سے ڈرے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اللہ کی عظمت اور اس ذات عالی کا وقار انسان کے دل میں جاگزیں ہو۔ جلوت میں تقویٰ کا اظہار اور خلوت میں اللہ کی حرمتوں کو پامال کرنا اتنا گھناؤنا جرم ہے کہ اس سے انسان کے سارے اعمال برباد ہو جاتے ہیں۔

3۔ حسن اخلاق بھی ان اعمال میں سے ہے جن سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

محبت کو ضرب دیا کرتے ہیں،

اشفاق احمد کہتے ہیں۔

"میرا پہلا بچہ میری گود میں تھا، میں باغ میں بیٹھا تھا اور مالی کام کر رہے تھے۔ ایک مالی میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"ماشاء اللہ بہت پیارا بچہ ہے، اللہ اس کی عمر دراز کرے۔"

وہ کہنے لگا "میرے آٹھ بچے ہیں۔"

جب اس نے آٹھ بچوں کا ذکر کیا تو میں نے کہا۔

"اللہ ان سب کو سلامت رکھے لیکن میں اپنی محبت کو آٹھ بچوں میں تقسیم کرنے پر تیار نہیں ہوں۔"

یہ سن کر مالی مسکرایا اور میری طرف چہرہ کر کے کہنے لگا۔

"صاحب جی! محبت تقسیم نہیں کیا کرتے، محبت کو ضرب دیا کرتے ہیں۔"

موقع سے فائدہ،

بھارتی ریاست آندھرا پردیش میں زبردست سیلاب آیا۔ لوگوں کے گھر بار، ڈھور ڈنگر سب اس سیلاب میں بہہ گئے۔ بے سروسامانی کا عالم تھا۔ امدادی ٹیمیں اپنا کام کر رہی تھیں۔ اخبار اور ٹی وی کے نمائندے بھی اپنے فرض کی ادائیگی میں جتے ہوئے تھے۔ ایک عورت اپنے بچے کھچے گھر کے پاس بیٹھی ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ ایک ٹی وی نمائندے کی نظر پڑی۔ وہ اس کے پاس گیا اور ازراہ ہمدردی بولا۔

"کیا ہوا موسی؟"

"کیا بتائیں بیٹا۔ ہمارا تو سب کچھ یہ نگوڑا سیلاب لے گیا۔ ہمارا مرد بھی کھوئی گوا۔ ہمرے باقی مال اسباب

کے ساتھ۔ اب ہم کا کریں؟"

ٹی وی نمائندے نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "موسی فکر مت کرو۔ ہم ٹی وی پہ کام کرتے ہیں۔ تم اپنے مرد کا حلیہ بتاؤ۔ ہم اسے ڈھونڈنے میں تمہاری مدد کریں گے۔"

"اچھا بیٹوا! ہمارا مرد اونچا، لمبا، سفید اور گبھرو جوان ہے۔ بالکل اکشے کمار دکھتے ہے۔"

پاس ہی ایک نوجوان کھڑا سن رہا تھا۔ وہ نہ رہ سکا۔ بولا۔

"موسی! کیوں جھوٹ بولتی ہو۔ تمہارا مرد تو ٹھگنا اور کالا ہے۔"

وہ جھلاتے ہوئے بولی۔ "اے تو چپ کر مردوئے۔ اب یہ ڈھونڈیں گے تو کوئی اچھا ہی ڈھونڈیں گے ناں۔"

حرام اور حلال کی پہچان،

1۔ آج کل مارکیٹ میں حرام گوشت فروخت ہو رہا ہے اسی لیے حلال گوشت کھاتے وقت بھی دل کو دھڑکا لگا رہتا ہے آیا کہ حلال ہے کہ حرام۔ درج ذیل ترکیب سے خواتین با آسانی پتا لگا سکتی ہیں کہ وہ حلال ہے کہ نہیں۔

2۔ گوشت پکاتے وقت اس کو دھیان سے دیکھیں، اگر ہنڈیا میں گوشت سکڑ جائے تو وہ حلال ہے اگر گوشت اپنے حجم میں ڈبل ہو جائے چاہے وہ موٹائی میں ہو یا لمبائی میں، تو اسے پھینک دیں، یہ حرام ہے۔

3۔ اسی طرح انڈے بھی حرام جانوروں کے فروخت ہو رہے ہیں۔ اگر انڈا اوول شکل میں ہے۔ مطلب اگر اس کا دونوں سائیڈ سے منہ ایک جیسا ہے تو وہ حرام ہے۔ حلال انڈہ ایک سائیڈ سے قدرے موٹا اور دوسری سائیڈ قدرے باریک رکھتا ہے جیسا کہ چوزے، یہ انڈہ حلال ہوگا خواہ کسی بھی جانور کا ہو۔

(از امام جعفر صادق)

ناظمہ زیدی۔ چوک اعظم

باتوں سے خوشبو آئے،

- معاملات میں صفائی... وعدے کی پابندی... تجارت میں برکت کا گر ہے۔
- بلند آواز سے رونا بے صبری اور قہقہے سے ہنسنا بے وقوفی کی دلیل ہے۔
- شیطان کو زیر کرنے کا نسخہ بکثرت ذکر اللہ اور اتباع شریعت۔
- آخرت کا کام آج کر۔ دنیا کا کام کل پر چھوڑ دے۔
- سب سے بڑا وظیفہ گناہ سے بچنا ہے خاص طور پر گناہ کبیرہ سے۔
- نیک بننے کی اتنی ہی کوشش کرو جتنا حسین بننے کی کرتے ہو۔
- گناہ کے بعد ندامت بھی توبہ کی شاخ ہے۔
- وعظ گوئی سے پرہیز کرو جب تک خود پورے عامل نہ بن جاؤ۔
- زبان ذاکر، دل شاکر اور عورت فرماں بردار ہو۔ یہ عظیم دولت ہے۔
- نرم لہجے کا اثر الفاظ سے زیادہ ہوتا ہے۔
- احسان سب جگہ بہتر ہے لیکن ہمسائے کے ساتھ بہترین ہے۔
- قول بے عمل اور عمل بے اخلاص ناقابل قبول ہے۔
- اہل و عیال کو صلاحیت سے رکھنا اور ادب سکھانا جہاد سے افضل ہے۔
- ظالم، مظلوم کی دنیا بگاڑتا ہے اور اپنی آخرت۔

نورے محمد۔ یوسے والا

اقوال زریں،

- دیانت داری نیکی کی کنجی ہے اور نیکی جنت کی کنجی ہے۔ (حضرت علیؓ)
- عمل کا حسن یہ ہے کہ آج کا کام کل پر نہ ڈالو۔ (حضرت عمرؓ)

امت الصبور

جاؤں کی ڈائری

عائشہ فاطمہ کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر سلیم کوثر کی یہ نظم موجودہ حالات کی عکاس ہے۔

ہاں ابھی نہیں،

جذبے زنجیر نہیں ہوتے سلائے تو اسیر نہیں ہوتے
جو منظر ہیں پس منظر میں وہ کیوں تصویر نہیں ہوتے
جتنے بھی خیال گزار لیے وہ کیوں تحریر نہیں ہوتے
اب خواب سراب سے لگتے ہیں دن رات عذاب سے لگتے ہیں
کہیں جلتے بجھتے سناٹے ہیں کہیں ان دیکھے ہمسائے سے
آنگن بازار میں گلیوں میں سب موت کا کھیل اٹھا لائے
کوئی کسی کی فردِ جرم لکھے کوئی کسی کی جیل اٹھا لائے
اب خوف بچھا ہے رستوں میں بارود بچھا ہے بستوں میں
کہیں زہر ہے رات کی رانی میں کہیں آگ لگی ہے پانی میں
تم کہتے ہو تمہیں آن ملیں تمہیں کیسے آن ملیں آخر
جو کچھ تھا بے ترتیب ہوا اس گھر کا حال عجیب ہوا
یہاں ساحل تھا جہاں آتی جاتی لہروں کے پیغام ہمارے
نام لکھے تھے
دور افق کے صحراؤں میں بادلوں کے خیمے تھے جن
میں دھوپ کے
لشکر چھپے ہوئے تھے، اکثر دھوپ کی شدت ان
خیموں کو چھلنی کرتی تھی
یہاں شام کی محرابوں سے جل تھل کرتی رات
اترتی تھی
یہاں ریت تھی جس کے سینے پر قدموں کے نشان
دھڑکتے تھے
یہاں ناؤ تھی جس کے چلنے سے پانی پہ چراغ سے
جلتے تھے

کوئی آگ تھی جس میں چھپے ہوئے جسموں کے بھید
پگھلتے تھے
کوئی گوشہ تھا جہاں خواب سے خواب بدلتے تھے
کوئی تتلی پھول پہ کھلتی تھی
دامن سے خار الجھتے تھے

خوشبو کے رنگ بکھرتے تھے
اب کوئی نہیں اور کوئی نہیں
اس چہرے سے اس چہرے تک حسرت سی ایک نمو
کی ہے
اس لمحے سے اس لمحے تک بس ایک لکیر لہو کی ہے

حمدہ خان کی ڈائری سے

محبت ایک بے خود کرنے والا جذبہ ہے۔ اس میں کہیں ہجر و وصال کی کیفیت ہے تو کہیں کیف و انبساط ہے۔ فاطمہ حسن نے اس غزل میں محبت کی اسی کیفیت کو بیان کیا ہے۔

کبھی راستے میں ٹھہر گئے، کبھی منزلوں سے گزر گئے
کبھی خواہش در و بام میں جو گئے تو اوروں کے گھر گئے

نہ تھی آرزو کسی دوست کی، نہ کسی رفیق کی جستجو
کہیں اجنبی سے بھی مل لیے کہیں دوستی سے مکر گئے

نہیں زندگی سے کوئی گلہ کہ تھا خواب جیسا ہی سلسلہ
کبھی تیرگی کا اثر ہوا، کبھی چاندنی سے بھی ڈر گئے

تھیں ہوائیں تیز تو صحن سے جو اٹھا سکی، اٹھا لیا
مگر ایسے پیڑوں کا کیا کروں جو اجڑ گئے، جو بکھر گئے

کوئی اجنبی کوئی آشنا، ہمیں دے رہا تھا کہیں صدا
کہ وہ راستوں کا طلسم تھا، ہمیں جانتے تھے مگر گئے

کہیں آبشار میں بھیگتی، کہیں سبزہ زار میں کھیلتی
مری زندگی کے تمام رنگ محبتوں سے نکھر گئے

یہ ہنر بھی اس کا کمال ہے یہ اسی کا عکس جمال ہے
میرا آئینہ جو بھی بن گیا، مرے خد و خال نکھر گئے

ثمرہ اقرا کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر لیاقت علی عاصم کی یہ غزل آپ سب قارئین کے لیے۔

کیوں محبت کا داغ دھویا جائے
یہ ندامت نہیں کہ رویا جائے

دل تو دھڑکے کسی کے پہلو میں
درد پتھر میں کیا سمویا جائے

لکھ لیے شعر بے وفاؤں پر
یہ سفینہ کہاں ڈبویا جائے

وہ یہ کہنے کو آیا تھا کہ اسے
خواب کی طرح پا کے کھویا جائے

آنے والو تمہیں خدا رکھے
وقت ہو تو تمہیں بھی رویا جائے

نور محمد کی ڈائری سے

کسی نامعلوم شاعر کی یہ غزل میری پسندیدہ ہے آپ سب کے لیے۔

ہم نے ہر دکھ کو محبت کا تسلسل سمجھا
ہم کوئی تم تھے کہ دنیا سے شکایت کرتے

ہم نے سوکھی ہوئی شاخوں پہ لہو چھڑکا تھا
پھول اگر اب بھی نہ کھلتے تو خسارہ کرتے

ہم اگر چپ ہیں تو اس کو بھی غنیمت جانو
ہم اگر صبر نہ کرتے تو قیامت کرتے

ہم کو معلوم ہے دشمن کے سب ٹھکانوں کا پتا
شریکِ جرم نہ ہوتے تو مخبری کرتے

کی محبت تو سیاست کے چلن چھوڑ دیے
ہم اگر عشق نہ کرتے تو حکومت کرتے

روبی عامر کی ڈائری سے

میری پسندیدہ شاعرہ پروین شاکر کی ایک غزل آپ سب کے لیے۔

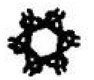
دروازہ جو کھولا تو نظر آئے کھڑے وہ
حیرت ہے مجھے آج کدھر بھول پڑے وہ

بھولا نہیں دل، ہجر کے لمحات کڑے وہ
راتیں تو بڑی تھیں ہی مگر دن بھی بڑے وہ

کیوں جان پہ بن آئی ہے، بگڑا ہے اگر وہ
اس کی تو یہ عادت کہ ہواؤں سے لڑے وہ

ہر شخص مجھے، تجھ سے جدا کرنے کا خواہاں
سن پائے اگر ایک تو دس جا کے جڑے وہ

بچے کی طرح چاند کو چھونے کی تمنا
دل کو کوئی شہ دے دے تو کیا کیا نہ اڑے وہ



خاموشی کو بیاں ملے

ادارہ

علینہ اختر...... اسلام آباد

چونکہ میں زندگی میں پہلی دفعہ پیارے خواتین کے کسی سلسلے میں شرکت کر رہی ہوں تو مجھے حق ہے کہ میں لمبے ے ے ے لمبے سے جوابات لکھوں ہے نا؟؟؟ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟ (اور آپی اگر ہوا بھی تو ——— ایڈیٹنگ۔ نہیں کرنی ٹھیک ہے؟ پلیز......)

1۔ نام تو آپ میرا پڑھ ہی چکے ہیں...... مجھے علینہ کہتے ہیں پیار سے بھی اور غصے سے بھی...... ویسے انعم آپی اور تجل بھی کبھار عینا کہہ دیتی ہیں (پیار سے......) ہم پانچ بہنیں سمیہ، میں، سحر، حفصہ اور سب سے چھوٹی ساڑھے چار سالہ زارا (جو اس وقت بھی میرے پاس بیٹھی کب سے میرے کان کھا رہی ہے ٹر ٹر کر کے...... میری پیاری سی لڑاکا بلی) اپنے سوئیٹ سے امی، ابو کے آنگن کی پیاری پیاری چڑیاں...... بھائی کوئی نہیں ہے (جس کی کمی میں شدت سے محسوس کرتی ہوں)

ہمارا آبائی تعلق تلہ گنگ سے ہے ہم جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہتے آرہے ہیں۔ پچھلی تین نسلوں سے...... میرے دادا و غیرہ تین بھائی تھے۔ دادا ابو، مجھلے بابا جان (دونوں مرحوم ہیں) پھر نانا ابو...... سب کی فیملیز عشروں سے مل جل کر رہتی ہیں دو گھروں میں، ''ملک ہاؤس'' تو گاؤں ہی میں ہے جبکہ ''حیدر ولا'' باہر ڈیرے پہ ہے...... میری چھوٹی تائی، بڑے پھوپھا، بڑی ممانی اور اکلوتے خالو چاروں بہن بھائی ہیں (ہے نا مزے کی بات......)

یہاں اسلام آباد میں ہماری اور بڑے ماموں کی فیملی رہتی ہے ساتھ میں چھوٹے ماموں، پھپھو کے دو بیٹے بھی، زندگی اپنی تمام خوبصورتیوں سمیت ہمارے درمیان موجود ہے......

جہاں تک ہے تعلیم کی بات تو جناب میں نے اسی سال ایف ایس سی پاس کیا ہے...... ہماری فیملی میں لڑکیوں کو پڑھانے کا زیادہ رواج نہیں تب ہی بڑے ابو نے منع کر دیا آگے پڑھنے سے......

ابو کا تو بہت دل تھا آگے پڑھانے کا مگر بڑے بھائی کے احترام میں خاموش ہو گئے ہیں...... اب ان شاء اللہ پرائیویٹ سلسلہ جاری ہوگا...... مشاغل بھی بہت سارے ہیں سر فہرست پر مطالعہ ہے...... پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق ہے مابدولت کو، ہر قسم کی بکس پڑھتی ہوں...... اسلامک لٹریچر، تاریخی ناولز، ڈائجسٹ، رسالے اخبارات، اسٹوری بکس سب کچھ......

مجھے اقبال، پاکستان، آرمی اور اسلامک قسم کے اشعار ڈھونڈ ڈھونڈ کر ڈائریز میں لکھنا بہت پسند ہے اس کے علاوہ بہت بولنا، بہت کھانا...... کہانیاں لکھنا وغیرہ وغیرہ' ویسے مجھے ہارس رائیڈنگ اور گنز چلانے کا بھی شوق ہے۔ گھوڑے بھی ہیں گنز بھی ہیں مگر شوق کون پورے کرنے دے؟؟؟؟ بھاگنا' دوڑنا' کھیلنا ہم سب کزنز کی جان ہے ہم لوڈو اور کرکٹ بہت شوق سے کھیلتے ہیں۔

2۔ خواتین سے باقاعدہ تعلق تب سے جڑا ہے جب سے میرا موسٹ فیورٹ ناول ''نمل'' میری موسٹ فیورٹ، پیاری رائٹر ''نمرہ احمد'' نے شروع کیا...... اس سے پہلے باقاعدہ تعلق نہ تھا بلکہ شاذ و نادر ملتا تھا...... اور اس بات پر میرا ناقابل تلافی نقصان ہوا۔ میں خواتین میں چھپنے والی شاہکار قسم کی لاتعداد کہانیوں سے محروم رہ گئی ہوں...... خواتین کے لیے بس اتنا ہی کہ......

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے۔
تو بہت دیر سے ملا ہے مجھے۔

آہ۔

ادارۂ خواتین نے اپنے لکھنے والوں کے ذریعے بہت شاہکار تحریریں پیش کیں۔ خواتین کے لکھنے والوں کا یہی خاصہ ہے اور یہی چیز انہیں سب سے منفرد بناتی ہے۔

بہت سی ایسی تحریریں ہیں جنہیں میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی ——— نمرہ آپی کی سب تحریریں خصوصاً نمل، مصحف، جنت کے پتے...... سانس ساکن تھی' وغیرہ اسید عبدالرحمن، آفتاب (تابی) فاطمہ، آمنہ والا ناول جس کی رائٹر مجھے یاد نہیں ہیں مگر کہانی کا نام غالباً پل صراط تھا...... شبلی جوادی سیریز...... از میر بٹ سیریز سمیرا اور ثمینہ عظمت علی کے تمام افسانے اور بھی بہت کچھ ہے جو یاد نہیں آرہا اس وقت...... (اوپر سے زارا کی گنگناہٹیں...... اف) ...... باقی نمرہ احمد، سمیرا حمید، سحر ساجد، ثمینہ عظمت علی، صائمہ اکرم، ساجدہ حبیب، عقیقہ ایوب، سائرہ رضا، کنیز نبوی، قراۃ العین خرم ہاشمی، تنزیلہ ریاض، نگہت سیما اور بہت ساری فیورٹ رائٹرز ہیں۔ فرحت اشتیاق کا ''متاعِ جاں ہے تو'' اور عقیقہ ایوب کا ''میرے قاتلوں کو گماں نہ ہو'' میں کبھی نہیں بھلا سکوں گی...... اور بھی بہت سی کہانیاں۔

3۔ ہر انسان خوبیوں اور خامیوں کا مرقع ہوتا ہے (وہی کھانے والے مربہ جیسا ہی ہی) اور یقیناً میں بھی ہوں۔ خیر سب سے پہلے رابطہ کیا اپنی پیاری امی جان سے...... کہنے لگیں۔

''ہر وقت کتابی کیڑا بن کر بیٹھی رہتی ہو آس پاس کا کوئی ہوش نہیں رہتا......'' (خامی۔)

''خوبی یہ بتائی کہ یہ جب ناراض ہو جاتی ہے تو پھر فوراً آکر کہتی ہے سوری...... اس کے بغیر نہیں سوتی۔'' ہی ہی ہی

سمیہ جسے ہم سیم، سمو وغیرہ کہہ کر بلاتے ہیں بقول اس کے ''پٹر پٹر بولتی ہو، دماغ کھا جاتی ہو۔'' اور بھی الا، بلا...... وغیرہ وغیرہ۔

4۔ سالگرہ؟؟؟...... جب چھوٹی تھی تو ایسے مناتے تھے کہ ماموں کیک وغیرہ لے آئے۔ کاٹا اور ہو گئی سال گرہ...... مگر جب شعور کی دہلیز پر قدم دھرا' قرآن کو جو تھوڑا بہت پڑھا...... اندر کی آنکھ کھلی تو تب احساس ہوا کہ یہ جو ہم ہر نماز میں اتنی دفعہ سورۃ فاتحہ کے آخر میں اللہ سے دعا کرتے ہیں...... اللہ ہمیں انعام یافتہ لوگوں کے رستہ پر چلا نہ کہ مغضوب اور بھٹکے ہوؤں کے۔ تو تب احساس ہوا کہ یہ سالگرہ، ویلینٹائن' بسنت اور نہ جانے کون کون سے ڈے یہ سب ان ہی مغضوب اور بھٹکے ہوؤں کے رائج کردہ ہیں اور ہم ان کے طریقے اپنا کر خود بخود انعام یافتہ رستوں سے دور جا رہے ہیں، تو اب الحمدللہ نہیں منایا کرتی اور اللہ کرے کبھی نہ مناؤں (کہیے آمین)

5۔ پسندیدہ شعر، نظم، کتاب اقتباس؟

شاعری تو مجھے وہی ساری پسند ہے جو اوپر لکھ بھی چکی ہوں اس میں سے اب پسندیدہ لکھنا مشکل ہے...... لیکن خیر......

سوز دل حد سے سوا ہو' اشک فشانی نہ ہو
اس سے پوچھو' جس کا گھر جلتا ہو اور پانی نہ ہو
بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی

پسندیدہ کتاب...... سب سے پہلے تو قرآن مجید پھر سید مودودی کی ''تفہیم القرآن''...... بہت ساری تاریخی کتب خصوصاً نسیم حجازی کی...... اس کے علاوہ اے حمید کی ''اور چنار جلتے رہے'' طارق اسمٰعیل ساگر کی ''اے راہ حق کے شہیدوں''، ''لہو کا سفر'' وغیرہ نمرہ آپی' تنزیلہ ریاض کے ناولز...... اشتیاق احمد کے ناولز ملک احمد سرور کی کتابیں...... اور بھی بہت ساری جنہیں تحریر کرتے کرتے نہ جانے کتنی صدیاں بیت جائیں...... ہاہ۔





خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

فائزہ بھٹی......پتوکی

اگست کا خواتین 11 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل ٹھیک رہا۔ فہرست پر نظر ڈالنے کے بعد احادیث کا مطالعہ کیا۔ جزاک اللہ۔ پلیز یہ بھی بتا دیں کہ نہار منہ پانی پینا ٹھیک ہے یا نہیں؟

''الف'' عمیرہ احمد کیا ایک اور سالار سکندر سے متعارف کروائیں گی۔ سالار سکندر تا حیات یاد رہنے والا ہے۔

بنیاد بتاتی ہے کہ عمارت بہت خوب صورت ہوگی۔ ویسے تو وہ کہتے ہیں نا۔ ''نام ہی کافی ہے۔''

قلب مومن کہو کیا حال ہیں اب ......ویسے ایک بات تو بتاؤ جنگل میں خط ڈالنے تم جایا کرتے تھے نا۔ مومنہ سلطان اب ذرا بچ کے...... جوڑی لاجواب ہے مومنہ میک اپ تم نے اپنے ابا سے کروایا۔ شرم سے ہم ڈوب ڈوب گئے۔ اباؤں سے میک اپ کروانا......اف توبہ۔

''دشت جنوں'' ایک بار پھر آئندہ ماہ کہہ کر، انتظار کی سولی پر لٹکا دیا۔ دیکھتے ہیں آخری قسط میں رائٹر کیا کمال کرتی ہیں کہ یہ کہانی ہمیں عرصہ دراز تک یاد رہے گی۔

حالم میں اس بار وہ مزہ نہیں آیا جو حالم کی پہچان ہے۔ ہمارا خیال تھا۔ واپسی کا سفر پہلے سے زیادہ دلچسپ ہوگا۔ فاتح اتنی کڑی شرط ماننے کی بھلا ضرورت کیا تھی۔ تالیہ سے پوچھ لیتے اس کے پاس تو ہمیشہ پلان بی، سی ہوتا ہے۔ مگر افسوس......

''نسخہ ہائے وفا'' نعیمہ ناز کی کہانی اچھی رہی۔ ساری کہانی میں مزہ آتا رہا......میرے خیال میں عفت بیگم شہید احمد سے زیادہ ہی قصور وار تھیں۔ اس طرح کی خواتین اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو برباد کر دیتی ہیں اور الزام ساری زندگی دوسروں کو دیتی ہیں۔ آرزو جیسی بیٹیاں والدین کا فخر ہوا کرتی ہیں۔ ایک بار پھر غلطی کی اور بہت برا کیا۔

ثانیہ کا بھی اتنا قصور نہیں تھا۔ کچھ لوگ فطرتاً ایسے ہوتے ہیں۔ چلو جیسے بھی سہی۔ اداس بلبل جیسے لوگ تو خوش ہوئے۔

''یہ قرینے اہل محبت کے'' فاخرہ جبیں تو ہمیں ویسے بھی بڑی پسند ہیں۔ کہانی اچھی معلوم ہو رہی ہے۔ ابھی پوری نہیں پڑھی۔

فاخرہ کی جولائی میں آئی کہانی کی بھی تعریف کرنا چاہوں گی۔ مجھے پڑھ کر بہت مزہ آیا...... یہ کہانی دوبارہ بھی پڑھی جا سکتی ہے۔

ج: جولائی میں آپ خط لکھنے کے باوجود پوسٹ نہ کروا سکیں۔ ہمیں اندازہ ہے کہ خط پوسٹ کروانا کتنا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی دوسرے سے کام کروانا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔

مومنہ نے اپنے باپ سے میک اپ اس لیے کروایا کہ اس کے باپ کا تعلق فلم انڈسٹری سے رہا ہے۔ وہ میک اپ آرٹسٹ تھا اور یہی اس کا پروفیشن تھا۔ میک اپ کرانا تو کیا مومنہ کو تو یہ پروفیشن ہی پسند نہیں ہے مگر وہی حالات کی مجبوریاں۔

مسرت الطاف احمد......کراچی

خواتین ڈائجسٹ ہاتھ میں آتے ہی ماڈل گرل دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ عمیرہ احمد کا ناول ''الف'' اپنی تمام تر دلچسپیوں کے ساتھ پسند آیا۔ تھیم کافی اسٹرونگ اور دم دار ہے۔ قلب مومن کا غرور آگے جا کر یقیناً خاک میں ملنے والا ہے۔ مومنہ کی بے بسی نے دل افسردہ کر دیا۔ مومنہ کی تذلیل قلب مومن کو بہت بھاری پڑنے والی ہے۔ مومنہ آگے جا کر بھی ثابت قدم ہی رہے۔

''دشت جنون'' کی یہ قسط ذرا بھی دل کو نہ بھائی۔ یہ کیا......! آئے کت کے گناہوں کو نظر انداز کر کے سارا ملبہ معاویہ پر گرا دیا۔ آئے کت نے بھی آیو شمتی بن کر وسامہ کی جان لی تھی لیکن اسے اگنور کیا جا رہا ہے اور معاویہ کو ہیرو سے زیرو بنایا گیا۔ پلیز معاویہ کے کردار کو لیٹ ڈاؤن نہ کیا جائے۔ معاویہ تو پوری اسٹوری کی جان ہے۔

''حالم'' کی اس ایپی سوڈ میں فاتح پر جی بھر کر غصہ آیا۔ خود غرضی کی انتہا کر دی۔ فاتح کو ایڈم اور تالیہ کو حقیقت سے لاعلم نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ تالیہ تو اس کے نکاح میں تھی اسے اس رشتے سے ہی آزاد کر دیتا کیونکہ یہاں اس کی اپنی فیملی تھی۔ ''نسخہ ہائے وفا'' لاسٹ ایپی سوڈ ایکسی لینٹ تھی سب اپنے اپنے انجام کو پہنچے۔ سبرینہ نے رافع کے ساتھ بہت اچھا کیا۔ رافع کو اپنی غلطی کا احساس تو ہوا اور والدین کو بھی اپنے بچوں کی خوشیوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، زندگی تو انہیں گزارنی ہے۔ ''بحر بیکراں'' اسٹوری مزاح سے بھرپور اور متاثر کن تحریر تھی۔ شاویز جیسا خود غرض انسان جو کسی کی فیلنگز کی قدر ہی نہیں کرتا وہ عمیرہ کو خوش کیسے رکھتا۔ عمیرہ کا بروقت فیصلہ اسے کسی بڑی تباہی سے بچا گیا۔

ج: پیاری مسرت! آپ ہمیشہ تفصیلی اور مدلل تبصرہ کرتی ہیں۔ اس بار بھی بہت صحیح تبصرہ کیا ہے آپ نے تمام کہانیوں پر۔ خوش رہیں، آباد رہیں۔

سعدیہ ابراہیم......قلات بلوچستان

میرا خواتین ڈائجسٹ میں پہلا خط ہے۔ جس مشکل سے میں یہ خط لکھ رہی ہوں اور اگلا مرحلہ برداشت کروں گی (پوسٹ کروانے کا کہہ رہی ہوں) وہ میرے علاوہ میرے بھائی، شوہر جانتے ہیں۔ چلیں تھوڑا تبصرہ کر لیتے ہیں۔ ''کرن کرن روشنی'' (پتا ہی نہیں چلا کیسے ڈھائی پیج ختم ہوئے) شروع کے صفحات کچھ بڑھائیں۔ ''انشا جی'' کو ہم پڑھتے نہیں۔ نمرہ کا ''حالم'' زبردست جا رہا ہے۔ لیکن ہم پڑھنے سے قاصر ہیں کیوں کہ ہر ماہ انتظار ہم سے نہیں ہوتا۔ نعیمہ ناز کا ''کاوش بے سود'' کا ذکر نہ کریں تو زیادتی ہوگی۔ باقی پورا ڈائجسٹ بہت بہت زبردست لگا۔ میں تو بتانا بھول گئی کہ میں ''خواتین ڈائجسٹ'' کی بہت بڑی فین ہوں۔

ج: پیاری سعدیہ! آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ آپ کا خط، تاخیر سے ملا پھر بھی شائع کر رہے ہیں کیونکہ ہمیں احساس ہے کہ آپ نے کتنی مشکل سے خط لکھا اور پوسٹ کرایا ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کے لیے آپ کی پسندیدگی ہماری محنتوں کا حاصل ہے۔ قارئین کے خط پڑھ کر ہماری ساری محنت وصول ہو جاتی ہے۔

ردا......لاڑکانہ

خواتین ڈائجسٹ میرا پسندیدہ ڈائجسٹ ہے۔ پلیز آپی میرا یہ خط بھی شامل کرنا آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ ایک سوال پوچھنا تھا کیا ''دشت جنون'' کہانی اصلی ہے میرا مطلب کیا سچی ہے پلیز ضرور بتانا۔ میں بڑی مشکل سے خط بھیج رہی ہوں۔

ج: پیاری ردا! آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے کتنی مشکل سے خط لکھا ہے اس کا بھی ہمیں اندازہ ہے۔ دشت جنوں کی کہانی سچی نہیں ہے۔

فوزیہ سرور......لاہور کینٹ

خواتین اور شعاع ڈائجسٹ چھٹی کلاس سے زیر مطالعہ ہیں۔ ان سے محبت کا یہ عالم ہے کہ ہر ماہ مجھے خود امی یا بھانجے کے ساتھ بازار کا چکر لگانا پڑتا ہے لازمی۔ امی کو خریداری کرنی ہوتی ہے اور مجھے ڈائجسٹ خریدنے ہوتے ہیں۔ امی کا جب بھی ارادہ بازار جانے کا ہو تب میں تیرہ یا چودہ تاریخ کو ہی امی کو بازار جانے دیتی ہوں۔ تاکہ خواتین، شعاع اور کرن ایک ہی دفعہ خرید لوں۔ اتنے طویل عرصے سے تینوں ڈائجسٹ زیر مطالعہ ہونے کے باوجود مجھے اب یہ لگنے لگا ہے کہ محبت کا ثبوت شاید خط لکھنا

ہے۔ اب میرا کوئی خط ہر ماہ پوسٹ نہ کروائے تو کیا کیا جائے۔ لیکن اب تو میں نے بھی کہانیاں لکھنا شروع کر دی ہیں۔ ابتدا کرن ڈائجسٹ میں تحریریں بھیج کر کی۔ اس میں شائع بھی ہو گئی۔ ایک تحریر بے چاری لگنے کے انتظار میں سوکھ رہی ہے۔ پھر خواتین ڈائجسٹ میں میں نے دو تحریریں بھیجیں۔ دو ماہ بعد بات کی۔ مژدہ سنایا کہ ایک افسانہ قبول کر لیا گیا ہے۔ رمضان میں ہی لگے گا۔ کیونکہ اس کا ٹاپک رمضان سے متعلق تھا۔ پھر ہمت بڑھی اور وقفے وقفے سے دو مزید تحریریں بھیج دیں۔ واصفہ سہیل سے دو ماہ بعد میری بات ہوئی۔ بہت پیارے انداز میں انہوں نے مجھ سے بات کی۔ مجھے یہ کہہ دیا گیا دونوں تحریریں زیر غور ہیں۔ اب میں مزید تحریریں بھیجنا چاہتی ہوں۔ لیکن دل میں ڈر سا بیٹھ گیا ہے۔ آج کل آپ کے نمبر پر کال ہی نہیں ہو پاتی۔ میں جس کو بھی اپنی شائع شدہ کہانی دکھاتی ہوں۔ ان کا سوال کہ خواتین یا شعاع میں نہیں لکھتیں، مجھے افسردہ کر دیتا ہے۔ اب آتی ہوں خواتین ڈائجسٹ پر تبصرہ کی طرف! حالم کے تو کیا کہنے۔ ویری ویری فنٹاسٹک اینڈ امیزنگ ناول۔ "دشتِ جنون" اچھی اسٹوری ہے۔ فاخرہ جبیں۔ بہت اچھی تحریر۔ دل کو چھوتی ہوئی تحریر "نسخہ ہائے وفا"، بہت اچھی اسٹوری ہے۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ کرن کرن روشنی سے روح و جاں معطر ہو جاتے ہیں۔ نفسیاتی ازدواجی الجھنیں پڑھ کر بے ساختہ دل سے دعا نکلتی ہے اللہ ہر بہن کی مشکل حل کرے۔ (آمین)

ج: پیاری فوزیہ! آپ میں صلاحیت ہے آپ بہت اچھا لکھ سکتی ہیں۔ مزید کہانیاں ضرور بھجوائیں کہانیاں شائع ہونے میں تاخیر کے بہت سے سبب ہوتے ہیں۔ آپ تاخیر سے مایوس نہ ہوں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر آپ نے مایوس ہو کر لکھنا نہ چھوڑا تو ایک دن بہت اچھا لکھیں گی۔

اقراء جٹ...... منچن آباد

"خواتین" نے ہمیں جگہ دینی کم کر دی اس لیے ہم نے بھی وقفے وقفے سے آنا شروع کر دیا ہے۔ کہنی سنی میں عمیرہ احمد کا نام دیکھ کر چیخ نکل گئی۔ آپی عمیرہ احمد کا ناول...... دی گریٹ ویلکم ٹو خواتین نگری آپی عمیرہ احمد۔ کیا ہی مزہ ہے نمرہ احمد، عمیرہ احمد جیسی رائٹرز کے ناول ہمیں خواتین میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔ کرن کرن روشنی ونڈر فل سلسلہ۔ "حالم" مائی فیورٹ ناول ...... ویری انٹرسٹنگ اینڈ انفارمیٹو۔ پہلے حالم کے لیے خواتین لینا میری مجبوری تھی اور اب سمجھ جائیں بھئی عمیرہ احمد کے "الف" کے لیے۔ "نسخہ ہائے وفا" نعیمہ ناز زبردست "خاتون کی ڈائری" میں سیلف پوئیٹری (یعنی نظمیں، غزلیں، بھیجی جا سکتی ہیں؟) خواتین ڈائجسٹ کی ہر کہانی بہت ہی زبردست ہوتی ہے۔

ج: پیاری اقراء! آپ نے یہ کیسے سوچا کہ خواتین میں آپ کے لیے جگہ نہیں یا آپ کو جگہ دینا کم کر دی۔ آپ کے خط ہمیں تاخیر سے موصول ہوتے ہیں تو ہم شامل نہیں کر پاتے۔ آپ کے لیے ہمارے دل میں بھی جگہ ہے اور خواتین میں بھی۔

عمارہ شفیق...... اوچ شریف

اسلام علیکم جی! میں نے خواتین ڈائجسٹ میں تین کہانیاں بھیجی ہیں۔ میں نے کہانیاں دونوں جانب (صفحے کے) لکھی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صفحے کے ایک طرف ہی لکھا جائے تو کاغذ ضائع ہوتے ہیں دوسرا اتنے پیسے ہی نہیں ہوتے کہ اتنی ساری شیٹس (کاغذ) نہیں خرید سکتے۔

ج: پیاری عمارہ! آپ پریشان نہ ہوں۔ کہانیاں قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔

تبسم حسین...... ڈنگہ

ٹائٹل کیوٹ تھا۔ کہنی سنی بھی خوب رہی۔ محمود خاور کے لیے دعائے مغفرت کی۔ کرن کرن روشنی نے دل و دماغ کو روشن کر دیا۔ سب سے پہلے عمیرہ احمد کا "الف" پڑھا۔ پہلی ہی قسط نے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ سچ عمیرہ آپی میں نے آپ کو پہلی بار پڑھا ہے۔ اس سے پہلے صرف تعریفوں کو سنا ہے کہ عمیرہ احمد کا لکھا دل پہ راج کرتا ہے۔ پہلی قسط سے آپ کی فین ہو گئی۔ "حالم" نمرہ احمد مجھے اس تحریر کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ عمیرہ احمد، سمیرا حمید اور سائرہ رضا کے ہاتھ چوم لوں۔ بے تحاشا محبت ہے آپ سب سے۔ "دشتِ جنوں" رات کو پڑھی۔ آبےکت نے جان لے لی۔ مجھ معصوم کی خوش نصیب کے ساتھ ساتھ میری بھی سانسیں اٹک گئیں۔ "نسخہ ہائے وفا" نعیمہ ناز ایک بہترین تحریر کا بہترین اینڈ۔ یہ "قرینے محبت کے" فاخرہ جبیں بہت خوشی ہوتی ہے کہ کسی پرانی رائٹر کو ہم یاد ہیں۔ بہت خوب صورت تحریر۔ "بحرِ بیکراں" ثمینہ فرحان نے بھی زبردست لکھا۔ افسانے سارے اے ون تھے۔ آخر میں دو باتیں کیا میں خط میں پیسے رکھ کر بھیج دوں؟ اور سائرہ اور سمیرا ابھی ذرا قسط وار لکھیں۔

ج: پیاری تبسم! عمیرہ احمد کو آپ نے پہلی بار پڑھا ہے یہ جان کر حیرانی ہوئی۔ اس سے پہلے عمیرہ احمد کی متعدد تحریریں خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہو چکی ہیں اور کتابی شکل میں بھی آ چکی ہیں۔ سائرہ رضا کی تحریر اس ماہ شامل ہے۔ سمیرا حمید تک آپ کا پیغام ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

نجمہ اسرار احمد...... کراچی

پچھلے دنوں کسی قاری کا خط پڑھا جو غالباً نانی یا دادی بن چکی ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ سے ان کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ خوشی ہوتی ہے ہنسی بھی آتی ہے۔

اپنی بات کروں تو عمر کی ساتھویں دہائی میں داخل ہونے والی ہوں۔ غالباً (71) یا (72) کی بات ہے کسی عزیز کے گھر کی سیڑھیوں پر ایک پھٹا پرانا رسالہ دیکھا ہم شوقین فوراً اٹھا لیا۔ بشریٰ رحمان کا (ماں جی) تھا اس میں اور بس پھر خواتین ڈائجسٹ اور ہم۔ بچوں کی دنیا سے (نونہال) پھر حور پھر زیب النساء لیکن خواتین سے جو رشتہ جڑا وہ آج تک قائم ہے اور بہت دل سے قائم و دائم ہے۔

فاطمہ شہناز مرتضیٰ، رضیہ جمیل، ناہید نذر، نبیہ نقوی، شمیمہ نقوی، بشریٰ رحمٰن، خدیجہ منور، ہاجرہ مسرور اور نجانے کتنی رائٹرز ہیں جن کے میں نام بھول رہی ہوں اور جو ہمارے دل میں بستی ہیں۔

بشریٰ رحمٰن کے "ماں جی" نے جو جادو کیا وہ آج تک دل پر ثبت ہے۔ کبھی ہماری آج کی قاری کو "ماں جی" پڑھوائیں۔ بشریٰ رحمٰن کے افسانوں کا تڑکا کبھی کبھی لگا دیا کریں۔

ذہن پر بہت زور دے کر لکھنا پڑتا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ میری ذہنی اور روحانی تسکین کرتا ہے۔ میرا نشہ ہے۔ جس عمر میں بچیاں صرف نصاب پڑھتی ہیں میں نصاب کے ساتھ ساتھ۔ رضیہ بٹ، رضیہ جمیل، دیبا خاتم، حمیدہ جبیں کے ناولز پڑھا کرتی تھی۔ اک عمر کا تجربہ ہے اچھا۔ برا سب پڑھا مگر سیکھا سب اچھا ہی اچھا۔ اگر یہ مبالغہ نہ سمجھو تو مجھے نماز اور نماز کی پابندی اسی خواتین کے پڑھنے سے ہوئی۔ یہ سب سے بہترین کام تھا جس کا کریڈٹ ہماری لکھاری بہنوں کو جاتا ہے اور یہ بات میں برملا سب سے کہتی ہوں۔ اور یہ بھی کہ سب مائیں اپنی بچیوں کو خواتین ڈائجسٹ پڑھنے کو دیں۔ اپنی زندگی کے نشیب و فراز سے کس طرح نمٹا جا سکتا ہے۔ خواتین ڈائجسٹ پڑھ کر آ جائے گا۔ یہ اک استاد کی طرح سکھاتا ہے۔ میرے بے شمار مسائل جن میں پھنسی ہوتی تھی حیرت انگیز طور پر کسی نہ کسی ناول، ناولٹ یا افسانے میں اس کا حل موجود ہوتا تھا۔ میں ششدر رہ جاتی تھی اور شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ جس کا موقع آج پندرہ سال بعد مل رہا ہے۔

آپ کے رسالے نے مجھے کبھی مایوس نہیں ہونے دیا۔ آپ کی رائٹرز کے ناولز۔ افسانے کے بعض اقتباسات نے مجھے نئی ہمت عطا کی اور مصائب سے لڑنا سکھایا۔ یہ سب جھوٹ یا مبالغہ یا خوشامد نہیں یہ سب بالکل سچ اور حقیقت ہے (اللہ ریاض صاحب کی مغفرت کرے) میں نے پڑھنے کے اس سلسلے کو اپنی بیٹیوں تک پہنچایا ہے انہیں شوق ہے اور وہ میری باتوں سے اتفاق بھی کرتی ہیں۔

اب تھوڑا تبصرہ ہو جائے۔

سمیرا حمید۔ قلم کی خوب صورتی دیکھا کیجیے۔

ایمل رضا۔ کبھی دل دکھاتی اور کبھی خوش کرتی ہیں۔

سلویٰ بٹ۔ دونوں۔

مصباح علی۔ حیران کر دیتی ہیں۔

عفت سحر طاہر۔ بہت پرانی جان پہچان ہے ان

سے۔

قانتہ رابعہ۔ فکر کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔

صائمہ اکرم۔ ٹی وی رسالے دونوں میں بہت مصروف مگر اچھی جارہی ہیں۔

سائرہ رضا۔ کن لفظوں میں لکھوں ان کی تعریف کبھی لیاقت آباد (لالوکھیت)۔ کبھی ناظم آباد اور کبھی اورنگی ٹاؤن گھمادیتی ہیں۔ ایسا مسحور کردیتی ہیں کہ رسالہ چھوٹنے میں ہی مزہ آنے لگتا ہے۔

بہرحال نئی لکھنے والی بھی بہت اچھا اور بہت خوب صورت لکھ رہی ہیں۔ میری لکھائی بہت خراب ہوگئی ہے بہرحال اپنے دل کا حال آپ تک پہنچا کرخوش ہورہی ہوں۔ دیکھیں کیسی پذیرائی ملتی ہے۔ بہت، بہت بہت پرانی قاری کو۔

نام میرے نام۔ بہت مزہ آتا ہے پڑھ کر خاص کروہ جوگرلز کیاں بہنیں، دوردراز علاقوں سے خط لکھتی ہیں علاقوں کے عجیب نام بہت اچھے لگتے ہیں۔ کہاں کہاں تک روشنی پہنچا رہے ہیں آپ لوگ، بہت خوشی ہوتی ہے۔ خاص طور پر ثمینہ اکرم اور کوثر خالد۔

حسن المآب۔ کیا لکھوں! ابھی تک ششدر ہوں پڑھتی جاتی ہوں اور آنکھیں نم بھی ہوئی جاتی ہیں۔ کیا آسان دین دیا ہے ہمیں اللہ تعالیٰ نے انسان کو زیرو سے اٹھا کر وہاں لے جاتا ہے جہاں دنیا اسے سر اٹھا کر دیکھتی ہے۔

بہرحال لکھنا تو بہت کچھ تھا فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ آئندہ بھی لکھوں گی اگر پذیرائی ملی تو۔ لیکن خواتین ڈائجسٹ اور میں لازم وملزوم ہیں جب تک زندگی ہے۔

ج: نجمہ بہن! ہم تہہ دل سے ممنون ہیں کہ آپ نے خط لکھ کر اپنے احساسات و جذبات کا اظہار کیا۔ ہمیں بے پناہ مسرت ہوئی ہے۔ ہم بھلا آپ کی پذیرائی کیوں نہیں کریں گے۔ رفاقتوں کا اتنا طویل سفر آپ نے ہمارے ساتھ طے کیا ہے۔ یہ طویل رفاقتیں ہمیں یقین دلاتی ہیں کہ ہم وقت کے ساتھ چلے ہیں جو ہمارے ساتھ تھے۔ انہیں مطمئن رکھ پائے ہیں۔ ہمارے پرچے کا معیار برقرار رہا ہے۔ آئندہ ہمیں خط لکھیے گا تو پرچے کی کہانیوں پر بھی تبصرہ کیجیے گا۔

سمیعہ اختر......سید آباد خواجگاں

میں آٹھ سال سے آپ کی خاموش قاری ہوں۔

آپ کے خواتین ڈائجسٹ کا ہر ناول، افسانہ بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ جس سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ نمرہ احمد، سمیرا حمید، عمیرہ احمد اور عفت سحر طاہر میری پسندیدہ رائٹرز ہیں۔ نمرہ احمد کا حالم مجھے بہت پسند ہے۔ مجھے تالیہ اور فاتح رامزل کا کردار بہت پسند ہے، ایڈم اور تالیہ کی نوک جھونک بہت اچھی لگتی ہے۔ دشت جنوں جو آمنہ ریاض نے بہت اچھے سے لکھا جو ہمیں بہت پسند آیا۔ اس میں معاویہ کا کردار مجھے پسند آیا۔ خوش نصیب اور کیف کی باتیں اچھی لگی ہمیں۔

ج: پیاری سمیعہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔

آٹھ سال آپ خاموش قاری رہیں۔ اب دوبارہ خاموشی اختیار نہ کرلیجا...... ہمیں باقاعدگی سے خط لکھنا۔

نخبہ اکرم......گاؤں گولیکی ضلع گجرات

تقریباً ڈیڑھ سال بعد خط لکھ رہی ہوں، وجہ پوسٹ کروانے کا مسئلہ۔ مجھے بہت خوشی ہوتی ہے جب خواتین اور شعاع میں اپنا نام دیکھتی ہوں۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ شعاع اور خواتین کی وجہ سے میری زندگی میں کتنی مثبت تبدیلی آئی ہے۔ وہ رائٹرز جو واقعی اپنی جادوئی تحریروں کے ذریعے پڑھنے والے کا دل موہ لیتی ہیں۔ ان کا کردار بھی بلاشبہ قابل تحسین ہے۔

"کرن کرن روشنی" سے لے کر بیوٹی بکس تک کوئی بھی سلسلہ ایسا نہیں جو مجھے پسند نہ ہو۔ حالم کا بے صبری سے انتظار رہتا ہے کہ اب کیا کرنے والی ہیں نمرہ جی۔ میرے چھوٹے بھائی شہزاد کو حالم بہت پسند ہے یا یوں کہہ لیں اسے نمرہ احمد کا ہر ناول ہی بہت پسند ہے۔ اک سحر سا ہوتا ہے ان کی کہانی میں۔ شہزاد سے انتظار نہیں ہوتا بہت بے چین ہوجاتا ہے جب قسط لیٹ ہوجائے تو۔

میں تعریف کرنا چاہوں گی نعیمہ ناز کی۔ ان کی تحریریں میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں پر دل جیت لیا "کاوش بے سود" نے۔ سالوں یاد رہنے والی کہانی ہے کیا یہ سچی کہانی ہے؟؟؟

اور اب "نسخہ ہائے وفا" بھی بہت ہی زبردست رہا۔

"مہر میراں" اک نئے موضوع پہ لکھی جانے والی تحریر دل کو چھوگئی۔ پڑھتے پڑھتے اردگرد کیا ہورہا میں بھول گئی۔ بہت ہی عمدہ تحریر لکھی سمیرا حمید نے۔ عدنان بھائی کو قارئین کی اتنی اچھی اصلاح پر میری طرف سے بہت خلوص بھرا سلام پیش کیجیے گا۔ ثمینہ اکرم، فوزیہ ثمر، مسرت الطاف احمد مجھے اپنی اپنی سی لگتی ہیں۔ تمام سلسلے ہی لاجواب ہوتے ہیں پر میں سب سے پہلے شاعری پڑھتی ہوں جب کبھی میرا شعر شائع ہوتا ہے تو بہت خوشی ہوتی ہے۔

ج: پیاری نخبہ! آپ ہمیں یاد ہیں۔ عید پر بھی آپ کو میسج کیا تھا۔ پتا نہیں کیوں آپ کو نہیں مل سکا۔ اب آپ نے جو نمبر لکھا تھا۔ اس پر میسج کردیا ہے۔ آپ نمبر نوٹ کرلیجیے گا۔

حالم آپ کے چھوٹے بھائی کو پسند آرہا ہے۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کی تعریف ہم متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

مقدس زہرہ...... جھنگ

عمیرہ احمد، نمرہ احمد اور سمیرا یہ اپنے ناولز میں موجود کرداروں کو بہت اسٹرونگ دکھاتی ہیں اکثر۔ بہت بہت شکریہ ان سب کا اللہ تعالیٰ ان کی دنیا و آخرت میں آسانیاں پیدا فرمائیں۔ (آمین)

جولائی کا جو مجھے شمارہ ملا تھا اس میں شروع کے 34 پیج دوبارہ جڑے ہوئے تھے اور صفحہ نمبر 98 سے 130 تک کے صفحات غائب تھے۔

ج: پیاری مقدس! خواتین کی محفل میں خوش آمدید ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو جو پرچا ملا۔ اس میں صفحات غائب تھے۔ آئندہ اگر کبھی ایسا ہو تو اپنے بک اسٹال والے کو پرچا دے کر تبدیل کرالیں۔

شبانہ نعیم......فیصل آباد

آپ کے رسالوں کی میں پچھلے 25 سالوں سے مستقل قاری ہوں ان رسالوں سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ کبھی خط اس لیے نہیں لکھا کہ اکثر بہنیں وہ لکھ دیتی ہیں۔ جو میرے سوال ہوتے ہیں۔

انیقہ انا پتا نہیں کہاں غائب ہیں۔ خط سے قاری بہنوں سے بھی ایک اپنائیت کا رشتہ ہوجاتا ہے۔ ثمینہ اکرم لیاری، فوزیہ ثمر بٹ، نواب زادی سونگی، شاہ شہزاد کے خط میں ضرور پڑھتی ہوں ان میں وہی باتیں ہوتی ہیں۔ جو کہانی پڑھ کر میرے ذہن میں آتی ہیں۔

عمیرہ احمد، سائرہ، نایاب جیلانی، نمرہ احمد اور بہت سی رائٹرز ہیں جن میں سے انتخاب میرے لیے مشکل ہوتا ہے کہ میری فیورٹ کون سی ہے۔ جب تک رسالے پڑھ نہ لیں سکون نہیں ملتا۔ اب پڑھنے کی رفتار کم ہوگئی ہے نظر کی وجہ سے لیکن پڑھتی ضرور ہوں۔ پچھلے دنوں بیمار تھی پھر اللہ تعالیٰ نے پیاری نواسی اسماء سے نوازا تو میں نے سارے رسالے اکٹھے رکھ لیے اور بعد میں پڑھے۔

ج: پیاری شبانہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔

25 سال کی طویل خاموشی کے بعد آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ اتنی طویل رفاقت میں آپ نے ایک بار بھی خط نہیں لکھا، اس کا ہمیں افسوس ہے۔ دوسرے لاکھ ہماری ترجمانی کریں۔ لیکن وہ اپنے الفاظ میں ہی کرتے ہیں۔ آپ خود خط لکھتیں تو ہمیں زیادہ خوشی ہوتی۔

☆

خبریں وبریں

واصفہ سہیل



مقصد

اداکاری کے حوالے سے صبا قمر کا کہنا ہے کہ عوام ہمارے ٹی وی پر ادا کیے گئے کرداروں سے خود کو بڑے پیار سے جوڑ رہے ہوتے ہیں (شکر ہے آپ کو احساس تو ہوا) اس لیے کم از کم میں کوئی بھی کردار قبول کرنے سے پہلے اب بہت سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے لگی ہوں (یعنی پہلے بغیر سوچے سمجھے......؟) میرے خیال میں ڈرامے کی کہانی اور کریکٹر، دونوں کو ہی مضبوط ہونا چاہیے، پھر موضوع بھی نیا ہو (ٹی وی ڈراما یا فلم میں نیا موضوع......؟) تب جا کر بات بنتی ہے۔ میں صرف مصروف رہنے کے لیے کام نہیں کرتی (کوئی بھی نہیں کرتا صبا! سب کام کرتے ہیں۔ بھئی، پیسے اور شہرت کے لیے اور کیا......؟) بلکہ اپنی اداکاری سے معاشرے کے سدھار میں کوئی کردار ادا کرنا میرا اصل مقصد ہوتا ہے۔ (معاشرے کا سدھار؟ جو ڈرامے دکھائے جا رہے ہیں، کیا ان سے معاشرے میں سدھار آسکتا ہے؟)

خواہش

اداکارہ میرا جو نہ کریں وہ کم ہے۔ اب یہی دیکھ لیں کہ انہوں نے ایک ٹی وی شو میں وینا ملک کی زندگی پر فلم بنانے کا اعلان کر دیا ہے (ہائیں! کیا وینا پر، نہیں نہیں وینا ملک کی زندگی پر فلم بن سکتی ہے؟ سنسر بورڈ اپنی قینچیاں تیز کرلے پھر؟)

میرا کو ڈائریکشن کا شوق تو عرصے سے تھا (یہ عرصہ...... کتنے عرصے پر محیط ہے یہ ہم کیوں بتائیں بھئی......؟) وہ اس خواہش کا کئی بار اظہار بھی کر چکی ہیں (ہزاروں خواہشیں ایسی کہ......؟) لیکن انہوں نے کسی پروجیکٹ کا اعلان نہیں کیا (ملا ہی نہیں ہوگا ورنہ تو......؟) اب میرا نے کہا ہے کہ وہ سوانح حیات



پر بنی فلم کی ہدایت کاری کرنا چاہتی ہیں (سوانح حیات ......آہم) اور کسی اور کی نہیں بلکہ وینا ملک (آ...... ہم ......ہم ہم) اور اس فلم کا نام ہوگا ”میں بنوں گی وینا ملک“ (نہیں، نہیں یہ ہم نہیں کہہ رہے بلکہ یہ تو ......میرا کا خیال ہے) میرا نے مزید کہا ہے کہ وینا ملک بہت مقبول اداکارہ ہیں (ہیں......!) جن کے مداح دنیا بھر میں موجود ہیں (......ہم بولیں گے تو ......؟) اور سفر کے دوران اکثر وبیشتر لوگ انہیں وینا ملک سمجھتے ہیں۔“ (وہی تو......اصل وجہ؟)

حصہ

ایمان علی کو ان کے مداح بہت جلد ٹی وی پر گوہر رشید کے ساتھ دیکھیں گے۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ بادشاہ بیگم میں صبا قمر کو لیا گیا تھا۔ کچھ وجوہات کی بناء پر (کون سی وجوہات......؟) صبا اس پروجیکٹ سے علیحدہ ہوگئیں۔ اس بارے میں پروڈیوسر راشد راشدی کا کہنا ہے کہ ”صبا قمر ایک بہترین اداکارہ ہیں۔ انہوں نے میرے پروجیکٹ میں کام کرنے سے انکار کر دیا۔ میں ان کے فیصلے کی عزت کرتا ہوں۔ یہ ڈراما میرے دل کے بہت قریب ہے (اور باقی؟) انہوں نے مزید کہا ہم ایمان علی کی جانب دیکھ رہے ہیں (وہ خوب صورت ہی اتنی ہیں کہ ہر کوئی ان کی جانب دیکھتا رہ جاتا ہے تو......؟) امید ہے وہ اس ڈرامے کا حصہ بن جائیں گی (مطلب ابھی واضح نہیں ہے کہ وہ مان جائیں......) وہ ابھی اسکرپٹ پڑھ رہی ہیں۔

ادھر ادھر سے

فراز کی شاعری اور زندگی لازم وملزم ہے۔ شاعری ادب اور زندگی کا آئینہ ہے۔ اگر زندگی کی تمام تر اچھائیوں، برائیوں، تہذیبی ومعاشرتی، سیاسی کشا کش اور ہم آہنگی کے ساتھ دیکھا جاسکتا ہے تو اسے صرف ادب وشاعری کے ذریعے ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ (اسد مفتی......حکایتیں، شکایتیں)

☆ عام تاثر یہ ہے کہ شاید پرویز مشرف سے متعلق عدالتیں بے بس ہیں۔ خود مجھ جیسے سیاست کے طالب علم بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اتنے سال گزرنے کے باوجود پرویز مشرف کے معاملے میں ویسا انصاف کیوں نہیں ہو رہا جیسا کہ نواز شریف وغیرہ سے متعلق ہو رہا ہے۔ (سلیم صافی......جرگہ)

☆ دنیا میں جہاں بھی جبر، آمریت اور ظلم رہا وہاں کبھی تخلیق اور تعمیر پروان نہیں چڑھی، جہاں غور وفکر اور اظہار رائے کی آزادی نہیں ہوتی۔ وہاں کولہو کے بیل جنم لیتے ہیں۔ اعلانسل کے گھوڑے نہیں تیار ہوسکتے۔ (کسہیل وڑائچ......فیض عالم)

☆ خارجہ سطح پر اس وقت صورت حال یہ ہے کہ نہ یورپ کے سربراہان نے مبارک باد کے فون کیے اور نہ ہی چینی صدر نے مبارک باد کا فون کیا۔ ایسے حالات میں غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیگر ممالک کے حوالوں سے دعوے کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ معاملہ کسی سیاسی جماعت کی ساکھ کا نہیں بلکہ ریاست پاکستان کا ہے۔

(محمد مہدی......فکر جہاں)

☆ ایک لیگی عہدے دار کے مطابق اڈیالہ جیل میں نواز شریف نے رت جگوں کو اپنا معمول بنالیا ہے۔ ساری رات قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں اور مختلف موضوعات پر کتابیں پڑھتے ہیں، جس میں سیرت نبویؐ کی سوانح شامل ہیں اور فجر کی نماز پڑھنے کے بعد سوتے ہیں۔ نواز شریف کو دو اخبارات فراہم کرنے کی اجازت ہے اور ان کو فراہم کیے ٹی وی پر صرف پی ٹی وی چینل دستیاب ہے۔ (امت رپورٹ)

☆ خدا اس ملک پر کیسے رحم کرے جس کے رہنے والے خود اپنے آپ پر رحم نہیں کرتے؟

خلق خدا کی گھات میں زندو فقیہہ، میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردش صبح وشام ابھی

(ڈاکٹر ضیاء الدین۔ امت)

آپ کا باورچی خانہ

نزہت رضوان قاضی

خواتین اور شعاع سے وابستگی تو بہت پرانی ہے مگر اب اس کے سلسلوں میں شمولیت کا دل چاہا۔ میاں ـــ کی جاب ایسی تھی کہ کئی جگہوں پر رہے۔ کافی عرصہ کوئٹہ میں رہے پھر کچھ عرصہ کراچی، اب لاہور میں آباد ہیں۔ میاں ـــ رضوان صاحب کی مارکیٹنگ کی جاب ہے اس لیے وہ آئے دن دوروں پر ہوتے ہیں۔ اس لیے انہیں باہر کھانے سے چڑ ہے کیونکہ انہیں مہینے کے بیس دن باہر کھانا کھانا پڑتا ہے اور وہ گھر میں کھانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ گھر میں بھی سادہ کھانا کھانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

س: کھانا پکاتے وقت آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟

ج: جی، ہم سادہ مگر غذائیت سے بھرپور کھانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ میاں صاحب زیادہ مرچ مسالے والے کھانے پسند نہیں کرتے۔

س: کھانے کا وقت ہے...... اچانک مہمان آجائیں تو؟

ج: مہمان اگر اچانک آجائیں تو چکن کڑاہی اور کوئی سے چاول، چائنیز مکس سبزی والے یا چنے کی بریانی بنالیتی ہوں۔

س: کچن کی ٹپ؟

ج: آئینہ کیلیے اخبار سے صاف کریں۔

گھر کی کوئی قیمتی چیز پیسے یا گولڈ کسی خفیہ جگہ رکھ دیں اور تین بار آیت الکرسی پڑھ کر پھونک دیں، کبھی چوری نہیں ہوگی۔

منی پلانٹ کے پودوں میں گھر میں جو بھی سبزی کاٹیں آلو یا انڈہ ابالیں اس کا پانی ڈال دیں، خوب پھلے گا۔

س: کچن کی صفائی کا کتنا خیال رکھتی ہیں؟

ج: جی اب آتے ہیں کچن کی طرف، صاف گھر اور کچن تو سب کو ہی اچھا لگتا ہے۔ میں بھی ہفتہ وار اور مہینہ وار گھر اور کچن کی صفائی کرتی رہتی ہوں۔

سودا مہینہ وار اور سبزی ہفتہ وار آتی ہے۔ سب کچھ دھو دھو کر فریج میں رکھ دیا جاتا ہے۔ گوشت صرف ہفتے بھر کا لیتے ہیں، مہینے بھر کے لیے اسٹور نہیں کرتے۔ میرے اُن کا خیال ہے کہ زیادہ پرانا گوشت استعمال نہیں کرنا چاہیے، بیکٹریا پیدا ہوجاتا ہے۔

کوکنگ اور گھرداری کا بہت شوق ہے، گھر کے کام کرکے مزا آتا ہے۔ نئی نئی ڈشیں ٹرائی کرتی رہتی ہوں۔ بعض اوقات خود بھی کوئی نہ کوئی نئی ریسپی ایجاد کرلیتی ہوں۔

مسالا بھری مرچیں

اشیاء:۔

بڑی مرچیں...... ایک پاؤ

نمک، مرچ...... املی...... آم چور...... پسا ہوا زیرہ۔

ترکیب:۔

مرچوں کو دھو کر کٹ لگالیں۔ املی کو بھگو کر گودا نکال لیں، اب تمام مسالے مکس کرکے بھردیں۔

ایک درمیانی دیگچی میں تھوڑا تیل ڈال کر پکنے رکھیں، وہ گرم ہوجائے تو مرچیں آرام سے رکھ دیں۔ جب کڑکڑانے کی آواز آنے لگے تو ڈھکن کے نیچے توا رکھ دیں اور مرچوں پر کوئی وزن رکھ کر ڈھکن پر رکھ دیں۔ یوں مسالا جلے گا نہیں۔ تھوڑی دیر میں چیک کریں، مرچیں تیار ہیں، کسی بھی دال یا پھر کسی سبزی کے ساتھ مزا دیں گی۔

ہنٹر بیف

گوشت...... ایک کلو کا بڑا ٹکڑا

نمک...... ایک کھانے کا چمچہ

سرکہ...... دو بڑے چمچے

تیل...... دو بڑے چمچے

کالی مرچ...... ایک کھانے کا چمچہ

ادرک لہسن پیسٹ...... دو چمچے

ترکیب:۔

گوشت کو دھو کر چھری سے گہرے گہرے کٹ لگادیں۔ اب یہ تمام مسالے مکس کرکے رکھ دیں۔ تقریباً ایک دن فریج میں رکھ دیں اور کانٹے سے گودتی رہیں۔ اب ایک کوکر آدھا پانی سے بھردیں اور گوشت کا پیس ڈال دیں، جب پانی گرم ہوجائے تو کوکر کا ڈھکن لگادیں۔ آنچ پہلے تیز کریں، جب خوب گرم ہوجائے تو آنچ ہلکی کردیں اور پورا دن رکھا رہنے دیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چیک کرتی رہیں، آپ دیکھیں گی گوشت گل کر بالکل نرم ہوگیا، پریشر نہیں دینا، صرف ڈھکن لگانا ہے۔ اوپر سیٹی (ویٹ) بھی لگادیں، بس آنچ ہلکی رکھیں۔ جب خوب گل جائے، پانی خشک ہوجائے تو نکال کر ٹھنڈا کرکے سلائس کرلیں۔ سینڈوچ بنائیں یا پھر ٹکڑے کاٹ کر ڈھیر سارا سلاد جس میں ابلے ہوئے مٹر گوبھی، گاجر شامل ہوں اور فرنچ فرائز اور کولڈ ڈرنک کے ساتھ انجوائے کریں۔

☆

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

سندھی دیگچی کباب

ضروری اجزاء:۔

قیمہ	ایک کلو
براؤن پیاز	آدھا کپ
بیسن، خشخاش	دو، دو کھانے کے چمچے
انڈا	ایک عدد
دہی	دو کھانے کے چمچے
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب:۔

قیمے میں چار ہری مرچ، نمک، ہرا دھنیا، سیاہ مرچ، گرم مسالا، پسی ہوئی خشخاش کے ساتھ باریک پیس لیں۔ پھر اس میں براؤن پیاز کا چورا، انڈا، بیسن اور دہی مکس کرکے دبا دبا کر لمبے کباب بنالیں۔ دیگچی میں تیل گرم کرکے یہ کباب احتیاط سے رکھ دیں ـــــ پھر ڈھک کر دھیمی آنچ پر پکائیں۔ پانچ منٹ بعد احتیاط سے دیگچی ہلاتے رہیں کہ تمام طرف سے کباب اچھی طرح پک جائیں۔ چمچہ نہیں چلانا ورنہ کباب ٹوٹ جائیں گے۔ کٹی ادرک اور ہرا دھنیا چھڑک کر رائتہ اور چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

تاج کباب

اجزاء:۔

گوشت	ایک کلو
پیاز	آدھا کلو
آلو	ایک پاؤ
ٹماٹر	ڈیڑھ پاؤ
ادرک لہسن	ایک بڑا چمچہ
لال مرچ پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	ایک چائے کا چمچہ
ٹماٹو ساس	ایک بڑا چمچہ
نمک	حسب ضرورت

ترکیب:۔

پہلے گوشت ـــــ دھو کر اس کے ٹکڑے کرلیں۔ سارے مسالے پیس کر دہی میں ملا دیں اور گوشت میں لگا کر رکھ دیں تاکہ گوشت گل جائے۔ اس کے بعد ٹماٹر اور آلو صاف کرکے اس کے چھلکے اتارلیں، ٹکڑے کاٹ کر رکھ لیں۔

ایک بڑے فرائی پین میں آدھا کپ گھی ڈال کر گرم کرلیں۔ جو گوشت میں مسالا ملا کر رکھا ہے وہ سب بچھا دیں۔ اوپر سے ٹماٹر اور آلو کے ٹکڑے بچھا کر پیاز کے لچھے کاٹ کر گوشت پر بچھا دیں۔ جو گھی بچا ہوا ہے وہ اس پر ڈال دیں اور ایک پیالی پانی ڈال کر اوپر سے ڈھانپ کر چولہے پر رکھ دیں۔ آنچ دھیمی رکھیں۔ جب آپ یہ دیکھیں کہ پانی بھی خشک ہوگیا اور گوشت بھی بادامی رنگ کا ہوگیا ہے تو سمجھ لیں کہ کباب تیار ہیں۔

بھنی ہوئی چانپیں

اشیاء:۔

بکرے کی چانپیں	چھ عدد
کالی مرچ پسی ہوئی	ایک چوتھائی چمچہ
ادرک پسی ہوئی	ایک چوتھائی چمچہ
سفید سرکہ	دو بڑے چمچے
پسا ہوا پیاز	آدھا چمچہ
لہسن	آدھا چمچہ
نمک	آدھا چمچہ
اجینوموتو	آدھا چمچہ
سویا ساس	ایک بڑا چمچہ
کارن فلور	دو بڑے چمچے
آئل	حسب ضرورت

ترکیب:۔

چانپیں دھو کر نمک، ادرک لہسن، کالی مرچ اور سرکہ ڈال کر اچھی طرح ملیں تاکہ مسالا اچھی طرح چانپوں پر لگ جائے اور اسے دو گھنٹوں کے لیے رکھ چھوڑیں۔ اس کے بعد کارن فلور اور اجینوموتو، سویا ساس میں ملائیں اور چانپوں پر اسے اچھی طرح مل دیں۔ فرائی پین میں تیل ڈال کر گرم کریں اور ہلکی آنچ پر چانپیں دونوں طرف سے فرائی کریں۔ سرخ ہونے پر چکن پیپر پر رکھتے جائیں تاکہ تیل اس میں جذب ہوجائے۔

دہی والی چٹ پٹی چکن

اشیاء:۔

چکن	ڈیڑھ کلو
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
پسی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
دھنیا پسا ہوا	آدھا چائے کا چمچہ
زیرہ پسا ہوا	آدھا چائے کا چمچہ
دہی	ایک کپ
تیل	آدھا کپ

ترکیب:۔

پیالے میں دہی، لہسن ادرک پیسٹ، پسی لال مرچ، نمک، دھنیا، پسا ہوا زیرہ، جائفل جاوتری پاؤڈر ڈال کر مکس کرکے اس میں چکن ڈال کر تیس منٹ کے لیے میرینیٹ کریں۔ ساس پین میں تیل گرم کرکے آمیزے سمیت چکن ڈال کر ڈھک کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ پانی خشک ہوجائے تو مزید پانچ منٹ فرائی کرکے چولہے سے اتار لیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر سرو کریں۔

کریبین ٹرائفل

ضروری اشیاء:۔

سادہ کیک	آدھا پونڈ
بنانا جیلی کرسٹلز	ایک پیکٹ
پائن ایپل جیلی کرسٹلز	ایک پیکٹ
اسٹرابیری جیلی کرسٹلز	ایک پیکٹ
دودھ	آدھا لیٹر
کیلے	دو تین عدد
اناناس	چار سلائس
ونیلا کسٹرڈ پاؤڈر	تین کھانے کے چمچے
چینی	دو کھانے کے چمچے
کریم	سجاوٹ کے لیے
کھوپرا	دو کھانے کے چمچے

ترکیب:۔

دو کھانے کے چمچے دودھ الگ کرکے اس میں کسٹرڈ پاؤڈر گھول لیں۔ بقیہ دودھ کو ابال کر اس میں چینی ڈال کر پکائیں۔ کسٹرڈ پاؤڈر ڈال کر ہلکا گاڑھا ہونے تک پکائیں اس کے بعد چولہے سے اتار کر اس میں کیلے کاٹ کر ڈال دیں۔ تینوں قسم کی جیلیز کو علیحدہ علیحدہ آدھے کپ پانی میں ابال کر جمالیں۔

ایک ڈش میں پہلے کیک کی تہہ لگا کر اوپر سے پائن ایپل جیلی کی تہہ لگائیں، اب تھوڑے کسٹرڈ میں کھانے کا رنگ ڈال کر اس کی تہہ لگائیں، اوپر اسٹرابیری جیلی کی تہہ لگا کر تھوڑے کسٹرڈ میں گلابی رنگ ڈالیں۔

اسے جما کر سیٹ کرلیں اس کی تہہ لگائیں، آخر میں کسٹرڈ کے اوپر جیلی اور اناناس کے قتلے سجا کر ٹھنڈا کرکے پیش کریں۔



کوثر خالد

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

ناہید مسعود......لاہور

سن ۔۔ میری شادی ہوئی تو میرے شوہر جاب کرتے تھے۔ وہ ایک اچھے عہدے پر فائز تھے۔
میرے شوہر کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ اپنی بڑی بہن کے ساتھ رہتے تھے۔ میرے شوہر کے دو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ چھوٹی بہن کی شادی ہو گئی تھی، بڑی بہن نے شادی نہیں کی تھی۔ دراصل میرے سسر کی وفات ہوئی تو یہ بہن بھائی بہت چھوٹے تھے۔ نند سب سے بڑی تھیں۔ انہوں نے ہی گھر سنبھالا۔ وہ گورنمنٹ جاب میں تھیں، معقول تنخواہ تھی۔ انہوں نے سب بہن بھائیوں کو اعلا تعلیم دلائی۔ سسر نے پلاٹ لے رکھا تھا۔ گھر کی تعمیر بھی شروع کرا رکھی تھی لیکن زندگی نے مہلت نہ دی۔ جب میرے شوہر اور جیٹھ نے تعلیم مکمل کر کے جاب کی تو یہ گھر تعمیر کرایا۔ میرے شوہر کو بیرون ملک جاب کی آفر ہوئی تو وہ باہر چلے گئے لیکن وہ وہاں سے بھی گھر کی تعمیر کے لیے پیسہ بھیجتے رہتے تھے، شادی کے بعد میں بھی ان کے ساتھ باہر چلی گئی۔ ہماری باہر کی نیشنلٹی بھی ہے۔ میں اس دوران دو بار پاکستان آئی۔ نند دیور کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ جیٹھ بھی ملک سے باہر ہیں اور انہوں نے باہر جانے کے بعد گھر سے کوئی رابطہ بھی نہیں رکھا۔ مسئلہ جب کھڑا ہوا جب دیور کی شادی ہوئی۔ دیور نے اپنے ایک دوست کی سالی سے شادی کر لی۔ نند کو ان لوگوں کے خاندان پر اعتراض تھا لیکن دیور کی مرضی دیکھ کر انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔

دیورانی نے گھر آتے ہی مطالبہ کیا کہ وہ نند کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ نند کو گھر سے نکال دیا جائے۔ نند اپنا گھر کیسے چھوڑ سکتی تھیں، اس گھر میں ان کی خون پسینے کی کمائی شامل تھی۔ انہوں نے گھر چھوڑنے سے انکار کیا تو دیورانی نے ان کا کچن میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا۔ مجبوراً انہوں نے اپنے بیڈروم میں ہی چولہا رکھ لیا۔ جہاں وہ اپنا کھانا خود بناتی تھیں۔ میرے شوہر پاکستان آئے تو انہیں یہ صورت حال دیکھ کر بہت دکھ ہوا، انہوں نے گھر میں جو چھوٹا سا اسٹور نما کمرہ تھا، اس میں کچن کا سامان سیٹ کر دیا یہ صورت حال دیکھ کر میری دیورانی غصہ سے پاگل ہو گئی اس کی زبان درازی مزید بڑھ گئی۔

دو سال پہلے میرے شوہر بہن سے ملنے پاکستان آئے تو میری نند بیمار تھیں۔ انہیں کینسر تشخیص ہوا۔ اس حالت میں نند کو تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا کیونکہ دیور اور دیورانی تو انہیں ایک گلاس پانی دینے کے روادار نہیں تھے۔ گھر میں عید پر دعوت ہوتی، بقر عید پر قربانی ہوتی، بچوں کی سالگرہ کی تقریب ہوتی لیکن انہوں نے نند کو کبھی ایک پلیٹ چاول یا سالن نہیں دیا تو ان سے کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ میرے شوہر نے نند کے پاس پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ گھر پر دیورانی کا قبضہ تھا۔ اوپر ایک کمرہ تھا، ہم نے وہاں رہائش اختیار کر لی یہاں یہ واضح کر دوں کہ میرے بچے نہیں ہیں۔ نند کا علاج جاری ہے۔ وہ اب کافی بہتر ہیں لیکن میرے شوہر ان کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہتے کیونکہ دیورانی کا رویہ نند کے ساتھ بہت خراب ہے، وہ با قاعدہ انہیں کوسنے دیتی ہے۔ میری نند اس سے دہشت زدہ رہتی ہیں۔

اوپر جس کمرے میں ہم رہتے ہیں، دیور نے وہاں دونوں سائڈ پر اسٹور بنا کر کھڑکیاں بند کر دی ہیں، جس سے ہمیں تازہ ہوا نہیں ملتی۔ دیورانی چاہتی ہے کہ وہ پورے گھر پر قابض ہو جائے۔ وہ ہر ممکن طریقے سے ہمیں زچ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بہانا بنا کر چیخنا چلانا شروع کر دیتی ہے۔ ہماری سیڑھیوں پر گندگی اور کوڑا کرکٹ ڈالنا معمول بنا لیا ہے۔ ہر طریقے سے تنگ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ میں ان حالات میں شدید ڈپریشن کا شکار ہوتی جا رہی ہوں کیونکہ لڑائی جھگڑا میری فطرت نہیں ہے۔

ج: آپ نے مشورہ مانگا ہے لیکن درحقیقت آپ نے اس کا حل بھی خود ہی پیش کر دیا ہے یہ لکھ کر کہ نند کو تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس مسئلہ کا سب سے اچھا حل تو یہ ہے اس گھر کو بیچ کر سب بہن بھائیوں کو حصہ دے دیا جائے یوں یہ مسئلہ خوش اسلوبی سے حل ہو سکتا ہے لیکن آپ کی نند اس پر راضی نہیں ہوں گی۔ وہ یقیناً اپنی زندگی کے آخری ایام اسی آبائی گھر میں گزارنا چاہیں گی۔

درحقیقت سمجھانے کی ضرورت آپ کی دیورانی کو ہے۔ یہ گھر بالآخر اس کو ملنا ہے، اگر وہ تھوڑا صبر سے کام لے تو یہ اس کے حق میں بہتر ہو گا۔ گھر کا ماحول خوش گوار رہے گا جس سے اس کا اور اس کے بچوں کا ذہن پرسکون رہے گا۔ آپ کی نند بھی اسے دعا دیں گی۔ مریض کی دعا بہت جلد قبول ہوتی ہے۔ آپ کی دیورانی کو سوچنا چاہیے کہ وہ جو سلوک آپ کی نند کے ساتھ کر رہی ہے، کل وہ اس کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا صرف ایک ہی بیٹا ہے۔ بہو نے اسے گھر میں رکھنے سے انکار کر دیا تو وہ کہاں جائے گی۔ اس کا ٹھکانا کہاں ہو گا۔

جہاں تک آپ کے ڈپریشن کا تعلق ہے تو آپ اپنی دیورانی کی باتوں کا اثر نہ لیں۔ آپ جب چاہیں۔ باہر واپس جا سکتی ہیں۔ آپ نے اللہ کی خوشنودی کے لیے ایک اچھا کام کیا ہے۔ یہ سوچیں گی تو ذہن پرسکون رہے گا۔

غ۔الف۔حسن ابدال

پیاری بہن! جب آپ نے شادی کا فیصلہ کیا تو اس وقت آپ کے اور آپ کی والدہ کے سامنے پورے حالات نہیں تھے۔ آپ نے بچپن سے سخت مشقت کی زندگی گزاری تھی۔ ان حالات میں آپ نے اور آپ کی والدہ نے یہ سوچا کہ ایک سہارا مل رہا ہے تو اسے قبول کر لیا جائے۔ دراصل اس میں ہمارے ہمارے معاشرے کا بھی قصور ہے یہاں کسی لڑکی کا غیر شادی شدہ ہونا مسئلہ بنا دیا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے آپ کی غربت اور مجبوری سے فائدہ اٹھایا اور اصل بات چھپائی۔ درحقیقت مجرم وہ ہیں۔ آپ اپنے دل سے یہ پچھتاوا نکال دیں کہ آپ نے وہاں شادی کر کے غلطی کی۔

جہاں تک اس پچھتاوے کا تعلق ہے کہ آپ کسی حکیم سے اس کا علاج کرا لیتیں تو وہ صحیح ہو جاتا۔ تو آپ اس خیال کو دل سے نکال دیں۔ وہ پیدائشی طور پر ذہنی کمزوری کا شکار تھا اس کی ذہنی عمر جسمانی عمر کے لحاظ سے بہت کم تھی۔ اس بیماری کا اب تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوا۔ نہ ہی اس کا علاج ممکن ہے۔

پچھتاوے انسان کو ختم کر دیتے ہیں آپ صرف یہ سوچیں کہ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح لکھا تھا۔ اب آگے زندگی آپ کے سامنے ہے۔ اللہ سے دعا کریں۔ وہ ضرور آپ کے لیے کوئی راہ نکالے گا۔ ویسے بھی آپ کسی کی محتاج نہیں ہیں اپنا خرچ خود اٹھا سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہنر دیا ہے۔ سماعت کی کمی ہے لیکن اس کے علاوہ آپ ہر لحاظ سے مکمل ہیں۔ آپ کو آپ کے حصے کی خوشیاں ضرور ملیں گی۔

☆

بیوٹی بکس

امت الصبور

انجم نصیر...... پشاور

س: میرا مسئلہ یہ ہے میرے بال روکھے، بے جان اور کمزور ہیں۔ میں یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ ہوں، جس کے باعث میں زیادہ تیل نہیں لگا پاتی۔ جب کہ پھل اور سبزیاں کھانے کی بھی چور ہوں، پلیز مجھے کوئی ایسا حل بتائیں۔ جس سے میرے بالوں کی بے رونقی ختم ہوجائے اور بال گرنا بھی بند ہوجائیں؟

ج: بالوں کی کمزوری اور روکھے پن کی ایک بڑی وجہ تیل نہ لگانا ہے جبکہ غذائیت سے بھرپور پھل اور سبزیوں کا کم استعمال بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ سب سے پہلے اپنی غذا پر توجہ دیں۔ پھل اور سبزیوں کے استعمال کو یقینی بنائیں جبکہ بالوں کی بے رونقی دور کرنے کے لیے ایلوویرا کا استعمال کریں۔

رات کو سونے سے قبل ایلوویرا کے گودے سے سر کا مساج کریں اور صبح پانی سے دھولیں۔ یہ عمل ہفتے میں دو سے تین بار دہرائیں۔ آپ خود فرق محسوس کریں گی۔

اس کے علاوہ ایک کپ ناریل کا تیل، چار کھانے کے چمچے کیسٹر آئل، دو چمچے کلونجی اور دو چمچے میتھی دانہ لے لیں۔ پہلے میتھی دانے اور کلونجی کو الگ الگ پیس لیں پھر ناریل کے تیل اور کیسٹر آئل کو کڑاہی میں ڈال کر ہلکا گرم کرلیں پھر اس میں کلونجی اور میتھی دانہ ڈال کر تین سے پانچ منٹ کے لیے پکائیں۔ اب تیل کو پانچ سے چھ گھنٹے کے لیے کسی ٹھنڈی جگہ پر رکھ دیں۔ ہفتے میں دو سے تین دفعہ اس تیل کو لگائیں، بال لمبے، گھنے اور چمک دار ہوجائیں گے۔

نسیم جہاں...... کراچی

س: میری عمر 27 سال ہے۔ پچھلے کچھ عرصے سے میرے چہرے پر دانے نکل رہے ہیں، جو نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ میں نے بیسن سے بھی منہ دھو کر دیکھا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

ج: ایکنی کی اصل وجہ پیٹ کی خرابی ہے۔ آپ سب سے پہلے اپنی غذا کی طرف توجہ دیں۔ کھانے میں سبزی اور پھلوں کے استعمال کو یقینی بنائیں۔ چہرے پر موجود نشانات کے خاتمے کے لیے رات کو سونے سے قبل ایلوویرا کا گودا لے کر چہرے پر لگائیں اور صبح تازہ پانی سے منہ دھولیں۔ ایلوویرا کے استعمال سے نا صرف چہرے کے داغ دھبوں کا صفایا ہوگا بلکہ جلد بھی چمک دار ہوگی۔

فاطمہ عنبریں...... لاہور

س: ایک سال پہلے میرا چہرہ بالکل صاف شفاف تھا۔ بچے کی پیدائش کے بعد میری ناک اور ہونٹوں کے گرد چھائیاں پڑگئی ہیں، جن میں اضافہ ہوتا جارہا ہے، کوئی علاج بتائیں؟

ج: جسم میں آئرن اور وٹامن سی کی کمی کے باعث چھائیاں پڑنے لگتی ہیں۔

وٹامن سی کی کمی ترش پھل یعنی مالٹے، کینو، چکوترے وغیرہ سے پوری کی جاسکتی ہے جبکہ سیب اور پالک میں بھی بھرپور مقدار میں آئرن پایا جاتا ہے۔ ان پھلوں اور سبزیوں کا روزانہ استعمال ضروری ہے۔ علاوہ ازیں آپ کم از کم ایک گلاس کینو یا سیب کا جوس روزانہ پیا کریں جبکہ ایک گلاس دودھ روزانہ پینے سے چہرے پر نکھار آتا ہے۔

اس کے ساتھ ہفتے میں ایک بار ایک انڈے کی سفیدی میں ایک چمچہ لیموں کا رس اور آدھا چمچہ شہد ملا کر چہرے پر لگائیں اور بیس منٹ بعد صاف پانی سے دھولیں۔ چہرے کے کیل مہاسے دور کرنے کے لیے ہفتے میں ایک بار بھاپ لے کر کیلوں کو نرم ہاتھوں سے دبا کر نکال لیں۔ اس کے بعد چہرے کو برف سے ٹکور کرلیں۔